قصّہ شیر کا

شکاری کی زبانی

اسرار احمد خاں درّانی

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

قصّہ شیر کا

(شکاری کی زبانی)

اسرار احمد خاں درّانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Qiṣsa Sher Ka
(Shikari ki Zabani)
***by* – Asrar Ahmad Khan Durrani**

سنہ اشاعت : جنوری، مارچ 2003 شک 1924
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : =/51
سلسلۂ مطبوعات : 1059

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

فہرست

باسمہ تعالیٰ

ابتدائیہ

میرے ذہن میں اس کتاب کے لکھنے کا جو مقصد تھا، وہ صرف شیروں کے بارے میں بھر پور معلومات اور دلچسپ قصے بیان کرنا تھا۔ جو کچھ میں نے ان سطروں میں لکھا ہے وہ شیر کی محبت میں یا اس سے مرعوب ہو کر نہیں لکھا۔ میں تو صرف شکار کی کہانیاں لکھنا چاہتا تھا، جن کے پلاٹ میں نے شکار کے دوران بنائے تھے، یا راجہ ضیاء اللہ خاں کے ساتھ شکار میں سامنے آئے تھے۔ کیونکہ راجہ صاحب نے سو سے زیادہ شیر مارے، جن میں کچھ آدم خور شیر بھی شامل ہیں۔ میں راجہ صاحب کے شکار کے ان واقعات کو ذہن میں لے کر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اور جب لکھنے سے ہاتھ روکا اور اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ راجہ صاحب تو غائب ہو گئے ہیں اور شیر اچھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب آپ ان مناظر کو جب پڑھیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اس میں راجہ صاحب کتنے ہیں اور شیر کتنا!

میں نے شیر اور اس کے شکار پر بہت پڑھا، خود بھی بہت شکار کھیلا۔ آٹھ، دس سال کی عمر میں پہلے ایئر گن، غلیل اور پھر بندوق سے شکار کھیلنا شروع کیا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء سے باقاعدہ جنگل کا شکار شروع کیا اور جب شکار چھوڑا یا، گورنمنٹ نے چھوڑوا دیا، اس وقت تک شمالی یو پی کے تمام بلاک میں کھیل چکا تھا۔ مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کا بہت بڑا حصہ میرے قدموں سے روندا جا چکا تھا۔

اب مجھ پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے کہ ’’چور اب چوری نہیں کرتا تو ہیرا پھیری ضرور کرتا ہے‘‘۔

میں اب شکار نہیں کھیلتا۔ یعنی شکار پر بندوق نہیں چلاتا۔ لیکن جنگل گھومنا بند نہیں کیا۔

کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ موٹر سائیکل سے جنگل نکل جاتا ہوں۔ چالیس پچاس کلو میٹر ادھر اُدھر گھوما اور واپس چلا آیا۔ موٹر سے جانے میں روڈ پرمٹ کی ضرورت پڑتی ہے جس کو حاصل کرنا ایک طول عمل ہے۔

اب جو میں غور کرتا ہوں تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے شکار کھیلنے کا اور جانور مارنے کا شوق تھا ہی نہیں۔ میں غلطی سے شکار کھیلنا اپنا شوق سمجھ بیٹھا۔ دراصل شوق تھا جنگل گھومنے پھرنے کا۔ کیونکہ وہ اب بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے جنگل ضرور جاتا ہوں۔ جانور کھڑے رہتے ہیں۔ میں ان پر بندوق نہیں چلاتا۔ دوسروں کو بھی بہت سختی سے اس کام سے روکتا ہوں۔ شاید عمر کی وجہ سے دل نرم ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے تو لوگوں کو جانور مارنے نہیں دیتا۔ جو لطف مجھے جنگلوں اور ویرانوں میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ کلکتہ، بمبئی، دلّی میں نہیں حاصل ہوتا۔ میں وہاں جا کر گھبرا جاتا ہوں، پریشان ہو جاتا ہوں۔ وہاں کے سیلابِ رنگ و بُو میں میرے لیے کوئی کشش نہیں۔

میں اکثر گرمیوں میں پہاڑ پر جاتا ہوں۔ وہاں مال روڈ اور بھری پُری جگہوں پر جانا مجھے سخت ناپسند ہے۔ میں آبادی سے بہت دور ویرانوں میں نکل جاتا ہوں۔ وہاں کسی پہاڑی چشمہ یا دریا کے کنارے بیٹھ جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر یہاں ایک کاٹیج بنا کر رہا جائے، تو کیسا رہے، لیکن تمام خیالات صرف میرے ذہن تک ہی محدود رہتے ہیں، اس سے آگے کبھی نہیں نکل سکے۔ کیونکہ جو جگہیں میں کاٹیج کے لیے منتخب کرتا ہوں، اس جگہ میرے ساتھ جانا کوئی پسند نہیں کرے گا، چہ جائیکہ رہنا۔ اور میں اکیلے رہ نہیں سکتا۔

زندگی کے اس لمبے عرصے میں ہزاروں لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ اس میں ایک موضوع جو سب سے زیادہ مجھے پسند تھا، وہ تھا پالیٹکس یعنی سیاست۔ کچھ لوگوں سے ادب، آرٹ، سیکس، شعر و شاعری پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ لیکن مجھے زندگی بھر کبھی شیر اور جنگل پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور کبھی ایسا اتفاق ہوا بھی، تو ایسی ایسی لغو باتیں سننے میں آئیں کہ میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھکو بڑا تعجب ہوا کہ ہمارے ملک کے لوگ شیر کے پڑوسی ہونے کے باوجود، شیر کے متعلق غلط

خیالات رکھتے ہیں۔ ان کو شیر کی عادات و خصائل کے متعلق کتنی غلط اطلاعات ہیں۔

میں اس کتاب کے ذریعے ان کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہوں، جو وہ ایک انتہائی خوبصورت، شریف، بہادر اور شرمیلے جانور کے متعلق اپنے دل میں ایک عرصہ سے پالے ہوئے ہیں۔ جب ذکر شیر کا کرنا ہے تو اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا ذکر آنا بھی ضروری ہے۔ پھر اس کے دشمنوں کا ذکر کیسے نہ کیا جائے۔ جنگل میں اس کا دشمن شکاری ہی ہے۔ شیر کیونکہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اس وجہ سے کچھ روشنی ان وجوہ پر بھی ڈالنا ضروری سمجھی گئی ہے۔ جنگلوں کا بے تکان کاٹا جانا۔ گھاس کے میدانوں میں کاشت کیا جانا۔ جانور جو اس کی غذا ہیں، ان کا کم ہو جانا۔ اور پھر شیر کا شکار۔ بغیر امتیاز نر و مادہ، بڑی تعداد میں ان کا مارا جانا۔

چونکہ یہ کتاب جنگل اور جنگل کے بادشاہ شیر سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کتاب کا نام میں ''قصہ شیر کا'' رکھ رہا ہوں۔

کچھ لوگ بڑے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی قسمت سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور کچھ پر بڑائی تھوپ دی جاتی ہے۔ یہ بڑے آدمیوں کی تین قسمیں ہیں۔ اس میں آخری قسم بہت گھٹیا لوگوں کی ہے۔ اور پہلی قسم بہت عمدہ لوگوں کی۔ راجہ ضیاء اللہ خانصاحب ان پہلے لوگوں کی قسم میں آتے ہیں۔

ہر قوم میں بڑائی ناپنے کے الگ الگ پیمانے ہوتے ہیں۔ میں بحیثیت مسلمان اسلامی شریعت کے پیمانے پر کسی آدمی کی بڑائی ناپنے کا قائل ہوں۔ اسلام میں بڑائی ناپنے کا ایک پیمانہ یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم دولت مند ہو تو اپنی دولت میں دوسروں کا حصہ قائم کرو۔ یعنی لوگوں کی خاطر مدارات کرو، ان کی تواضع کرو، اپنی حیثیت کے لحاظ سے لوگوں کی بوقت ضرورت مدد کرو اور ان کے کام آؤ۔ خود غرضی نہ کرنا، یعنی جو چیز اپنے لیے ناپسند کی جائے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کی جائے۔ کمزور پر ظلم نہ کرنا۔ ظالم کا ساتھ نہ دینا۔ چاہے وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ طاقت ور سے مرعوب نہ ہونا۔ دوسروں کا حق نہ مارنا وغیرہ وغیرہ۔

راجہ ضیاء اللہ خانصاحب نماز کے پابند ہیں۔ اور بلاناغہ تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ شکار میں بھی ایک چھوٹا قرآن پاک ان کے ساتھ رہتا ہے اور وہ اس کی تلاوت

کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ مخلص ہیں۔ متواضع ہیں اور وضع دار بھی ہیں، یعنی دوستوں کے دوست ہیں۔

راجہ صاحب شکار کے انتہائی شوقین ہیں۔ میری اور ان کی دوستی کی شاید یہی ایک بڑی وجہ بھی ہے۔ ورنہ آج کل پچاس برس تک کون دوست بنا رہتا ہے۔

میں راجہ صاحب کو ان کی جوانی اور اپنے بچپن سے جانتا ہوں اور آج بھی ان کی اتنی عزت میری نظر میں ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں شاعر نہیں اور نہ ہی بڑے لوگوں سے مرعوب ہونا میری خصلت ہے۔ اس کو نہ آپ قصیدہ سمجھیں اور نہ ہی خوشامد، یا مدح سرائی۔

ان چند سطروں کے لکھنے کا مقصد اپنی قوم کے افراد کا مرثیہ تو ہو سکتا ہے، قصیدہ بالکل نہیں۔ قصیدہ میں غلط باتیں یعنی مبالغہ ہوتا ہے اور کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قصیدہ گو کا مقصد چھپا ہوتا ہے۔ میری راجہ صاحب سے کوئی نہیں اٹکی ہے۔ میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، وہ بر بنائے خلوص لکھ رہا ہوں اور جو مجھ کو ان میں نظر آیا وہ لکھ رہا ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میری نظر شاید ان کی ان بلندیوں تک نہ پہنچی ہو جس بلندی پر وہ کھڑے ہیں۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ہم لوگوں کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم سے قدر شناسی بالکل مفقود ہو گئی ہے جیسا کہ ہر مُردہ قوم سے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تو زندہ قوموں کی خصوصیات ہیں کہ وہ اپنے ہیرو کو اقوام عالم سے روشناس کراتے ہیں۔ اس کا لوہا منواتے ہیں۔ سیکڑوں مثالیں ہیں ایسے لوگوں کی۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ ہمارے ہیرو بھی ولن ہو گئے۔ اور بالکل یہی ہُوا ہے ضیاء اللہ خانصاحب کے ساتھ بھی۔

دراصل راجہ صاحب کو خود بھی ہیرو بننے کی خواہش نہیں۔ اور نہ ہی وہ نام و نمود کے خواہش مند ہیں۔ ان کو تو دیکھنے والی آنکھ ہی پرکھ سکتی ہے۔ یہ کام تو ان کے دسترخوان پر حاضر باشوں کو کرنا چاہئے تھا، جن کے ہاتھوں میں قلم کی طاقت اور ذہنوں میں علم و عقل کی روشنی تھی۔ میں ایسا کوتاہ قلم، کم علم، الفاظ سے تہی دامن شخص، اگر ان کے سلسلے میں کاغذوں کو سیاہ

کرے تو ہرگز اس لائق نہیں کہ ان کی خصوصیات اور خوبیوں کو اُجاگر کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ راجہ صاحب پر لکھنا میرے بس سے باہر تھا لیکن یہ کام کرنا مجھ کو ہی پڑ رہا ہے۔ کیونکہ نہ تو مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ ہے اور نہ ہی راجہ اب زیادہ دن جینے کے خواہشمند۔ محفلیں سونی ہو گئیں جو لوگ جانِ محفل تھے، آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ گئے۔ سراج چچا انتقال کر گئے، سجاد بھائی، وصی بھائی، حفیظ بھائی یکے بعد دیگرے رُخصت ہوئے۔ میں اور راجہ صاحب زندہ ہیں۔ کسی دن یہ بھی چلے جائیں گے۔

میں نے شکار کے سلسلے میں جو کچھ سیکھا اور جو کچھ راجہ صاحب نے سکھایا، سب اپنے سینوں میں لے کر زمین کے نیچے دبے پڑے ہونگے۔ آنے والی نسلیں شکار کا نام تک بھی بھول چکی ہونگی۔ شکار کا یہ علم، دنیا سے ناپید ہو چکا ہوگا۔ بلکہ شاید یہ زبان ہی ختم ہو چکی ہوگی جس میں یہ لکھی جارہی ہے۔

جم کاربٹ نے بھی شکار کھیلا، لیکن مقصد سے۔ راجہ صاحب نے کاربٹ سے بہت زیادہ شکار کھیلا۔ برسوں وہ چھ، چھ مہینے جنگل سے باہر نہیں آئے۔ پندرہ اکتوبر کو جنگل میں داخل ہوئے اور پندرہ جون کو جنگل سے باہر آئے، برسوں شکار کے لیے "سالانہ پرمٹ حامل" (Annual Permit Holder) رہے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، انہوں نے اسی یا چوراسی شیروں کا شکار کیا۔ ان میں کچھ آدم خور بھی تھے۔ راجہ صاحب کے شکار میں جو بھی شیر مارا گیا وہ ایک نئی اور انوکھی کہانی کا پلاٹ بنا گیا۔ ایک نئی خصوصیت اور عادت کا مظاہرہ کر گیا۔ اگر راجہ صاحب ان واقعات کو لکھتے تو نہ جانے کتنی ضخیم کتابیں بنتیں۔ کاربٹ اور اینڈرسن ایک طفل مکتب شمار کئے جاتے، جو شیر کے شکار کی ابجد سے بھی واقفیت نہ رکھتے ہوتے۔

میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ کاربٹ کی بندوق اتنی کارگر نہیں تھی جتنا اس کا قلم طاقت ور اور کارگر تھا۔ شکاری کی حیثیت سے اینڈرسن، کاربٹ کے مقابلے اصل واقعے پر زیادہ توجہ دیتا ہے، جب کہ کاربٹ، پلاٹ بنانے میں ماہر ہے۔ سسپنس یعنی تذبذب اور ہیجان خوب پیدا کرتا ہے۔ اور ان کو کافی لمبائی میں پھیلا دیتا ہے۔ حالانکہ کاربٹ بہت سے گلدار اور

شیر مارنے میں کامیاب ہوا، لیکن اکثر ایسا بھی ہوا کہ لمبے عرصے تک ناکامی ہاتھ آتی رہی۔ ہم نے تو یہی دیکھا کہ کاربٹ کو کامیابی جب ہی ملی ہے جب کتاب کی ضخامت ڈیڑھ دو سو صفحوں کی ہو گئی ہے۔ تب کاربٹ ڈرامائی انداز میں حالات کو اپنے حق میں موڑ لیتا ہے اور ایسا جب ہی ہوتا ہے جب قارئین یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ شیر کاربٹ نہیں مار سکا اور اس مرتبہ بھی اس کو ناکامیابی ملی، جیسا کہ پہلے قصوں میں اس کو ناکامی ہو چکی ہے، اور جب لوگ نا امید ہو چکے ہوتے ہیں تو وہ بڑی شان سے مرتے ہوئے شیر کے ساتھ آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قارئین دم بخود رہ جاتے ہیں۔ وہ کہانی کی کمزوریوں کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو شیر کی لاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہوتی ہیں۔

یہ سب شکار میں نہیں ہوتا۔ افسانوں میں ضرور ہوتا ہے یا فلموں میں ہوتا ہے کیونکہ ان کے کردار، افسانہ نویس یا ہدایت کار کے طابع اور مطیع ہوتے ہیں۔ شیر کاربٹ کا مطیع یا فرمانبردار نہیں ہوتا۔ وہ شیر ہوتا ہے۔ نہ ہی سرکار انگلشیہ سے مرعوب اور نہ ہی اس کی سلطنت کی وسعت سے ہراساں۔ وہ جتنی رغبت سے کالا گوشت کھاتا ہے، اتنی ہی رغبت سے سفید گوشت کا بھی شوقین ہے۔

کاربٹ نے زخمی شیروں کو ڈھونڈنے میں جتنا مبالغے سے کام لیا ہے، وہ شکاری نقطۂ نظر سے بالکل لغو اور بھونڈا، نکما اور بے اصول ہے، حالانکہ اس کی قوم کے دسیوں شکاری جو ایمان دار تھے، شیر کے شکار اور اس کی تلاش کے سلسلہ میں اس سے پہلے بہت کچھ بتا چکے اور لکھ چکے ہیں۔ وہ سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ شیر کو مارنے کے لیے سب سے محفوظ جگہ اور سب سے بھاری بور کی رائفل استعمال کرنا چاہئے۔ اسی نظریہ کے تحت جنگلات کا محکمہ شیر کے شکار کا پرمٹ صرف انہی لوگوں کو دیتا ہے جو کم از کم اعشاریہ تین سو پچھتر میگنم بور کا رائفل رکھتے ہوں۔ سورج نکلنے کے بعد اور غروب سے ایک گھنٹہ پہلے جنگل میں رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ برخلاف اس کے کاربٹ بہت ہلکے بور کی رائفل سے شکار کھیلتا تھا۔ اور وقت کی پابندی بھی پوری طرح نہیں کرتا تھا۔

راجہ صاحب کا شیر کا مشاہدہ بہت طویل ہے اور ان کی نظر شیر کی ہر خصوصیت سے گزر

چکی ہے اور وہ اس کی تمام عادات و خصائل سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر شیر پر ان کی ریسرچ ہر طرح مکمل ہے۔ کیا یہ افسوس ناک بات نہیں ہے کہ ایسا شخص جو یو پی میں شیر پر اتھارٹی ہو، اس کو نہ کوئی جانے، نہ اس کے کام سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ بر خلاف اس کے یورپ او رامریکہ سے لوگ آکر اور لاکھوں ڈالر خرچ کر کے شیر پر نامکمل ریسرچ کریں اور بہت معمولی مشاہدات کے بعد اتھارٹی کی صورت میں اپنی رائے دیں اور ہمارے ہم وطن ان کو ہیرو سمجھنے لگیں۔

S.B.Schaller کا شیر کا مشاہدہ، جیسا کہ وہ خود قبول کرتا ہے، صرف پچاس گھنٹے کا ہے ۔ اس نے شیر پر ایک کتاب لکھ دی جو آج Biological Science میں سند کا درجہ رکھتی ہے ۔ راجہ صاحب اور قطب یار جنگ اپنے تجربات کی روشنی میں اس کی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں کرتے ۔ لیکن اس کی فکر کون کرتا ہے ۔ وہ سفید فام امریکن، یہ سیاہ فام ہندستانی۔ وہ حاکم یہ محکوم، بھلا محکوموں کی باتیں بھی لائق توجہ ہوتی ہیں !

میں نے جب ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے دلی خلش کے زیر اثر کہ ہمارے ملک کا راجہ صاحب جیسا مایہ ناز سپوت گمنامی میں جی رہا ہے، میں نے ان کے وسیع تجربہ میں سے محض تھوڑا سا حصہ کہانی کے انداز میں کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

فی زمانہ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ اردو کے قاری کی محدود ہوتی ہوئی تعداد کے پیش نظر کسی بھی سنجیدہ چیز یا علم کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا، وقت اور محنت دونوں کی بربادی نہ سمجھی جائے۔

اس کتاب میں بہت سے شکاریوں کے ناموں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان میں بیشتر وہ لوگ ہیں جو یہاں بیرونی ممالک سے یا تو شکار کرنے یا جانوروں پر ریسرچ کرنے آئے۔ ایسے لوگوں میں کچھ نام ہندستانیوں کے بھی ہیں جیسے کرنل کیسری سنگھ، شیر جنگ، اینڈرسن اور کاربٹ وغیرہ۔ یہ تمام مصنفین شیر کے متعلق الگ الگ رائے رکھتے ہیں ۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ اور ہر خطہ کا شیر، مزاجی کیفیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔ بلکہ ہر شیر دوسرے شیر سے مزاج اور عادتوں کے لحاظ سے الگ ہوتا ہے ۔ کسی ایک شیر

کی خصوصیت کا اطلاق دوسرے شیر پر نہیں کیا جا سکتا۔

شیر کا کامیاب شکاری وہی ہے جو شیر کو مارے اور حالات کو بے قابو بھی نہ ہونے دے خود اس کے ساتھ اور اس کی پارٹی کے ساتھ کوئی اس قسم کا واقعہ نہ ہو کہ وہ مذاق کا موضوع بنے اور جگ ہنسائی ہو۔

راجہ صاحب اس معاملہ میں بہت خوش قسمت انسان ہیں۔ ان کی ساٹھ سالہ شکاری زندگی میں ان کے ساتھ کبھی کوئی بھیانک واقعہ نہیں ہوا۔ ان پر کئی مرتبہ زخمی شیروں نے خوفناک انداز میں حملہ کیا۔ اگر راجہ صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کب کا شیروں کا نوالہ بن گیا ہوتا۔ کبھی کبھی تو شیر حملہ کرتا ہوا ان کے ایک گز تک قریب آ گیا لیکن کبھی ان کو گزند نہیں پہنچا سکا۔ حالانکہ وہ زمین پر کھڑے تھے، البتہ ایک مرتبہ شیر نے ان کے ایک دوست کی ٹانگ ضرور پکڑ لی تھی۔ اگر راجہ صاحب نہ ہوتے تو وہ دوست شیر کا لقمہ بن گئے ہوتے۔ ان کی زندگی بچانے میں راجہ صاحب کی بہادری، حاضر دماغی، عالی ہمتی اور خلوص کا بہت بڑا دخل رہا۔ راجہ صاحب میں اگر ان اوصاف میں سے کسی ایک بات کا بھی فقدان ہوتا تو ان حضرت کا خاتمہ یقینی تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ان تمام خصوصیات کا ایک ہی شخصیت میں یکجا ہو جانا یقیناً قدرت کا کرشمہ ہے۔ مذکورہ بالا جملہ صفات کوئی بھی انسان اپنی شخصیت میں بذات خود نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ تو قدرت کے عطیات ہیں۔ وہ جسے چاہے بخش دے، عطا کر دے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

زیر نظر کتاب میں خصوصی طور پر شیر کی عادات و خصائل پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ یہ اس وقت تحریر کی گئی جب شکار ممنوع قرار پایا۔ جنگل شکاریوں کے لیے بند ہو گئے۔ ان میں آمد و رفت بند ہو گئی۔ سامنے کوئی چیز نہیں۔ راجہ صاحب کو اس کی خبر بھی نہیں کہ کوئی ان کے شکار پر لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حافظہ نے جہاں تک یاوری کی، لکھ دیا۔ بعض انگریز محققین کی رائے بھی لکھی ہیں میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا، یا ناکامیاب، یہ بات قارئین کو طے کرنی

ہے۔ ممکن ہے اس میں بہت سی باتیں چھوٹ گئی ہوں یا بیان نہیں کی گئی ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کتاب کو لکھتے لکھتے مجھ پر ایک دورے کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کتاب کو میں کسی اور طرح لکھنا چاہتا تھا کہ لاشعوری طور پر ایک دوسرے پلاٹ کو جو شکاری زندگی اور جوانی میں بنا تھا، لکھنا شروع کر دیا اور اس کو ختم بھی کر دیا۔ اب جو اس کو پڑھا تو مارے شرم کے قلم کو توڑ اور کاغذوں کو پھاڑ کر جج کرنے چلا گیا۔ بھلا ہو اُن چند دوستوں کا جنھوں نے ان کا غذات کو سنبھال کر ایک الماری میں ٹھونس دیا۔ اور اب بضد ہیں کہ اس کو چھپواؤ۔

شکار پر انگریزی میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ اس میں ہندستانی شکاری بھی شامل ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو خود انگریزی میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن انگریزوں کو شکار کھلا کر، اُن سے شیر پٹوا کر اور ان کی خوشنودی حاصل کر کے، ان سے اپنے شکار کے واقعات بیان کر کے، انگریزی میں اپنے نام سے کتابیں شائع کرائیں۔ جیسے بٹ صاحب وغیرہ نے۔ لیکن بر خلاف اس کے اپنی ہندستانی زبان میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر کتابیں لکھی گئیں۔ یعنی اردو، ہندی میں۔ یا ہو سکتا ہے میری نظر سے بہت کم گزری ہوں۔ اور جو لکھی بھی گئیں ان میں واقعات چاہے وہ حقیقت پر ہی کیوں نہ مبنی ہوں، افسانوی انداز میں دلچسپ بنا کر لکھی گئیں اور انشاء پر پورا زور صَرف کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلچسپ تو معلوم ہوا لیکن شیر کی فرضی بُرائیوں کو جو ہماری نانیوں دادیوں نے راتوں کو سنا سنا کر ہمارے ذہنوں میں داخل کر دی تھیں، وہ اسی طرح برقرار ہیں۔ حالانکہ شیر ایک نہایت شرمیلا اور شریف جانور ہے۔ بہادر، نڈر اور چالاک بھی ہے لیکن ہمارے شکاری واقعہ نویسوں اور بزرگ خواتین نے شیر کو ایک انتہائی بے رحم، ظالم اور انسان کے دشمن جانور کے روپ میں پیش کیا۔ لہٰذا اس کا ڈر اور خوف ہمارے دلوں میں ایسا گھُس گیا کہ ہم اس کو قابل نفرت سمجھنے لگے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہم جس چیز سے ڈر جاتے ہیں، اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ہم بھی شیر سے ڈرنے لگے، ہم کو بھی اس سے نفرت ہو گئی۔

شیر پر اب تک جتنی ریسرچ ہوئی ہے۔ وہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ شیر نہ تو ڈرنے کی چیز ہے اور نہ ہی نفرت کرنے کی۔ دنیا کا کوئی جانور اس کے برابر خوبصورت نہیں۔ اس کے

جسم کی بناوٹ اتنی موزوں اور متناسب ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے ہاتھوں کی ساخت تو اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے۔ دُم کی لمبائی او راس پر بالوں کی رنگ اور ڈیزائن اُس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ مور کی پونچھ بہت خوبصورت بیان کی جاتی ہے۔ لیکن شیر کی دُم (پونچھ) بھی مور کی پونچھ سے کم خوبصورت نہیں ہوتی۔ اس کی دُم میں چھلّے پڑنے کا انداز اور لہرانے کا طریقہ ایک عجب سماں پیدا کرتا ہے۔ میں نے تو یہی محسوس کیا ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے تو میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔

میں اس کتاب کے ذریعہ مختلف ماہر شکاریوں کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ ہم آج تک شیر کے متعلق کس قدر غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ میری نظر سے شکار پر آج تک جتنی کتابیں گزری ہیں ،اس میں لوگوں نے اپنے شکار کے واقعات ایسے افسانوی انداز میں لکھے ہیں گویا کہ شیر مارنا جیسے بہادری کا سرٹیفکٹ ہو گیا۔ شیر انتہائی طاقتور تو ہوتا ہی ہے، لیکن بندوق کی گولی اس سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ پھر شیر مارنا بہادری کی کیا بات ہوئی۔ میں نے کتے کی طرح شیروں کو مرتے دیکھا ہے۔ کئی مرتبہ میرے ساتھیوں نے رات میں لہڑو (چھوٹی بیل گاڑی) سے بارہ بور کی بندوق سے شیروں پر فائر کر دیے اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ جنبش تک نہیں کی، وقت بھی رات کا اور ٹارچ بھی تین سیل کی۔ جب کہ شیر پر فائر کرنے کا یہ انداز اور وقت بالکل نا مناسب تھا۔ اس کے بعد سے میری نظر میں شیر کی وقعت کم ہو گئی لیکن میری یہ غلط فہمی جلد ہی دور بھی ہو گئی جب ایک زخمی شیر نے میرے ہاتھی کی جس پر میں بیٹھا تھا، پچھلی ٹانگ پکڑ لی، اور اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ تب مجھ کو معلوم ہوا کہ شیر کتنا طاقتور ہوتا ہے۔ اور اس کو کتے کی طرح سمجھنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ کیا اس واقعہ سے شیر بھیانک اور خوفناک ہو گیا۔ ڈر کر زخمی حالت میں ہر جانور کچھ ایسی ہی حرکتیں کر جاتا ہے جو وہ صحیح حالت میں نہیں کرتا۔ یہ غیر معمولی جرأت اس میں موت کے خوف سے پیدا ہوتی ہے، جو عام حالات میں نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک کاکڑ نے، جو بہت چھوٹے قد اور کمزور جثّہ کا، ہرن کی قسم کا ایک جانور ہوتا ہے، میرے پیر میں چار پانچ انچ لمبا زخم اپنے کھُر سے ڈال دیا، جب کہ میں موٹا اونی موزہ اور فل بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی کھُری سے جو چاقو سے بھی

زیادہ تیز تھی، موزے اور چمڑے کا بوٹ ہونے کے باوجود میرا پیر، ٹخنہ کے پاس زخمی ہو گیا۔
اس دن سے میں نے کانکڑ کو ذبح کرنا ترک کر دیا، جب تک دو آدمی اس کو دبوچ نہ لیں، میں
اس کے قریب نہیں جاتا۔ ایک مرتبہ ایک نیل گائے جو ہانکے میں گھر گیا تھا، اُس نے مجھ کو
اپنے سینگوں پر رکھ لیا۔ وہ تو میرے حواس خراب نہیں ہوئے۔ لہرا کر میں نے اس کے سینگوں
کے بیچ بندوق رکھ کر فائر کر دیا۔ اگر گھبرا کر فائر کرتا تو ایک آدھ ہانکے والا میرے فائر سے
ضرور مر گیا ہوتا۔ اور نیل گائے مجھ کو بھی مار چکا ہوتا۔ اب کیا میں نیل گائے اور کانکڑ سے
ڈرنے کی بات لکھوں۔ یہ تو انجام تھا میرے غلط طریقہ سے شکار کرنے کا۔ میری اپنی شکاری
زندگی میں ایسے سیکڑوں واقعات گزرے جن کو اگر لکھوں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ کیونکہ
میں سات آٹھ سال کی عمر سے شکار کھیل رہا ہوں۔ لیکن اس کتاب میں میں صرف راجہ ضیاء
اللہ خانصاحب کے ساتھ کھیلے ہوئے شکار کے واقعات کو، نیز اُن سے حاصل کئے ہوئے
تجربات کو ہی لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ بات میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ راجہ صاحب شکار کے زیادہ شوقین ہیں یا
جنگل میں گھومنے پھرنے اور رہنے کے۔ جب وہ شکار کھیلتے تھے تو کوئی اور شکاری ان کے برابر
تیزی سے بندوق نہیں چلا سکتا تھا۔ اِدھر جانور دکھائی دیا، اُدھر راجہ کا فائر ہوا۔ دوسرے شکاری
بندوق تانتے اور نشانہ لیتے ہی رہ گئے۔ اب جب کہ وہ بندوق چلانا بند کر چکے ہیں، وہ برسوں
سے اپنے گھر کو چھوڑ کر جنگل کے اندر ایک بنگلہ میں قیام پذیر ہیں۔ وہاں ان کو رہتے ہوئے
پچیس تیس سال سے زیادہ کا عرصہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ شہر بہت کم جاتے ہیں۔ وہاں کا عیش و آرام
ان کو بالکل پسند نہیں۔ جس بنگلہ میں وہ رہتے ہیں، اس میں غسل خانہ، پاخانہ وغیرہ نام کی
کوئی چیز نہیں، نہ ہی بجلی اور رننگ واٹر۔ جب کہ ان کا اپنا قلعہ نما مکان، جو ایک قصبہ میں ہے
اور جس میں آج کی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے، چھوڑے ہوئے اور ویرانہ آباد کئے ہوئے
ہیں۔ البتہ آسوں کے موسم میں زمینی ریاست کے گاؤں، جہاں ان کا ایک بہت لمبا چوڑا باغ
ہے، چلے جاتے ہیں۔ اس میں چھپر پڑے ہیں۔ کچھ جھالے ہیں جن میں ان کی مستورات
رہتی ہیں۔ وہ خود درختوں کے سایہ میں پڑے رہتے ہیں۔ ان درختوں کے نیچے کرسیاں،

میزیں، پلنگ پڑے ہوئے ہیں۔ جو آتا ہے حسب حیثیت بیٹھ جاتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ میرے لیے سخت پابندی ہے کہ میں مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور آؤں۔ اور جب وہ باغ میں چلے جائیں تو وہاں بھی جا کر ان سے ملاقات کروں۔ اگر کبھی اتفاق سے جانا نہ ہُوا تو شکایت "ارے اب ساتھیوں میں رہ کون گیا ہے۔ میں ہوں اور تم ہو۔ آ جاتے ہو تو پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں جب تک میں ہوں اور تم ہو آتے ضرور رہا کرو......."۔ اب بتایئے کیسے نہ جایا کروں۔ حالانکہ اب آنے جانے میں مجھ کو بھی تکلیف ہونے لگی ہے۔ شکار میں میری شرارتوں کے جتنے قصے ہیں، وہ راجہ صاحب کو آج بھی یاد ہیں۔ جہاں انہوں نے مجھے دیکھا، میرا تعارف کرانے کے بعد میرا کوئی نہ کوئی قصہ سنانا شروع کر دیتے ہیں۔

میری راجہ صاحب سے ملاقات غالباً ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر چودہ، پندرہ برس کی رہی ہو گی۔ میرے بڑے ماموں اس وقت ڈپٹی کمشنر تھے۔ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ میرے بڑے بھائی اسی زمانہ میں فوج میں سیکنڈ لفٹیننٹ ہو کر شکار کھیلنے لکھیم پور گئے اور وہیں سے وہ برما فرنٹ پر جانے والے تھے۔ زمانہ گرمیوں کا تھا۔ ہم لوگ ان کے برما جانے کی وجہ سے پہاڑ پر نہیں گئے تھے۔ ان سے ملنے لکھیم پور جانا پڑا۔ بہت بوریت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک تو ان کی وجہ سے پہاڑ پر جانا ملتوی ہو گیا، دوسرے لکھیم پور جانا پڑ رہا ہے، جو اس وقت ایک بہت چھوٹی سی جگہ تھی۔ بالکل ایک بڑے دیہات کی طرح۔ وہاں اس زمانے میں کوئی سینما ہال بھی نہیں تھا۔ نہ ہی تفریح کی کوئی اور جگہ، نہ ہمجولی، نہ ہی کوئی دوست۔ بڑے ماموں ایک انتہائی سخت گیر بزرگ۔ ڈسپلین کے پابند۔ ہر معاملہ میں سخت۔ ہم لوگوں کا یہ حال کہ انہیں دیکھتے ہیں کپکپی طاری ہو جاتی۔ منہ سے بات نکالنا محال ہو جاتا، میرے خیال میں وہ انسانی شکل میں شیر کی مانند تھے۔ کھانے کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ ہر آدمی کا راشن مقرر تھا۔ میری جسامت اور عمر کے لحاظ سے دو روٹی اور ایک بوٹی مقرر تھی۔ ان کے داماد، جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے اور کافی جسیم تھے اور کسرت بھی کرتے تھے، ان کی تین روٹی اور دو بوٹی مقرر تھی۔ اگر ہم بھوکے رہ جاتے تھے تو وہ بھی بھوکے رہتے تھے۔ ان حالات میں لکھیم پور جانا کوئی کیسے پسند کرتا! قسمت کی یاوری دیکھئے کہ ایک روز راجہ ضیاء اللہ

خانصاحب سے ملاقات ہوگئی، اس وقت ان کی عمر بیس، بائیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی، لیکن اچھی صحت اور بلند قد و قامت کے باعث عمر سے کچھ زیادہ ہی نظر آتے تھے۔ اس وقت ان کی ریاست کو، کورٹ آف وارڈ سے بحال ہوئے کچھ ہی وقت گزرا تھا۔ ریاست کی بحالی میں بڑے ماموں کی مدد غالباً شامل رہی تھی۔ لہٰذا ان کے بڑے معتقد تھے اور بڑے ماموں بھی ان کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ سوائے راجہ صاحب کے ان کا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جس سے بے تکلفی رہی ہو۔ میرے لیے یہ مقام حیرت تھا کہ دونوں کے مزاجوں میں زبردست تضاد ہوتے ہوئے بھی اس قدر بے تکلفی تھی۔

جب راجہ صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ میں بھی شکار کا بہت شوقین ہوں تو انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ شکار پر لے جانے کے لیے بڑے ماموں سے اجازت لے لی۔ میں اسی روز ان کے ساتھ لکھاری، جہاں راجہ صاحب ان دنوں قیام کرتے تھے، روانہ ہوگیا۔

یہی وہ ساعتِ سعید تھی جس میں میری اور راجہ صاحب کی دوستی کی بنیاد پڑی، جو اَب تک قائم ہے۔ رفتہ رفتہ راجہ صاحب کے شکاری دوستوں سے بھی متعارف ہوتا گیا، نئے نئے تعلقات اور دوستیاں قائم ہوئیں۔ شکار کے میدان وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ راجہ صاحب کی رفاقت کے بعد لکھیم پور میرے لیے اُجاڑ اور غیر مانوس نہیں رہا۔ موقع میسر آتے ہی میں راجہ صاحب کے یہاں شکار کھیلنے پہنچ جاتا۔ اکتوبر سے جون تک لکھیم پور کا کوئی نہ کوئی ڈویژن راجہ صاحب کے لیے ریزرو رہتا۔ جس میں، میں بھی جاتا۔ اگر کسی وجہ سے میرا جانا نہ ہو پاتا تو راجہ صاحب زبردستی پکڑوا لیتے۔ میرے ماموں صاحب کا لکھیم پور سے تبادلہ ہوگیا۔ ان کے تبادلہ کے ساتھ ساتھ میری شکارگاہیں بھی تبدیل ہوتی رہیں۔ کھیر پور قیام کے دوران وہاں کے جنگل بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بہترین شکارگاہیں تھیں۔ وافر مقدار میں شکار میسّر تھا۔ عرصہ تک جنگل کے سینہ کو اپنے بوٹوں سے روندتا رہا۔ پہلی بار تیندوے وہیں دیکھنے کو ملے۔ اس درمیان راجہ صاحب سے تعلق تقریباً منقطع سا رہا۔ کئی سال بعد اچانک ایک تقریب میں راجہ صاحب سے پھر ملاقات ہوگئی۔ نہایت گرمجوشی سے ملے اور شکایات کے دفتر کھول بیٹھے۔ اگلے روز ان کی واپسی تھی، مجھے بھی گھسیٹ لے گئے۔ اس روز سے آج تک پھر جدائی کا

ذائقہ نہیں چکھا۔

اس مرتبہ کی ملاقات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ راجہ صاحب کی شخصیت میں کچھ نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ صوم وصلوۃ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ تلاوت کلام پاک نہایت ذوق وشوق سے کرنے لگے تھے۔ جسمانی ساخت میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ بدن پہلے کی بہ نسبت کافی فربہ تھا۔ رنگ بھی گہرا سانولا ہو گیا تھا۔ زیادہ پیدل چلنے سے بھی گریز کرنے لگے تھے۔ خوراک کھل گئی تھی۔ ہاتھی یا لبڑو کی سواری پر جیپ کو ترجیح دینے لگے تھے۔ لیکن جانور مارنے اور بندوق چلانے کا شوق ہنوز حسب سابق برقرار تھا۔ خود مارتے تھے اور بے تکان مارتے تھے۔ ساتھی اگر بندوق چلانے میں تکلف کرتے تو ناراض ہوتے تھے۔ شکار پر روانہ ہونے سے قبل میرا تو باقاعدہ کلاس لے لیتے اور اپنے لیکچر میں ایک ہی بات پر زور دیتے اور تکرار کرتے کہ فائر کرنے میں نہ تو بخل سے کام لینا اور نہ ہی تساہلی سے۔ بلاک میں جانور بہت کم ہیں اور چالاک بھی۔ ہانکے والے بہت ہیں اور مہمان بھی کافی ہیں۔ گوشت کا اسٹاک بھی قریب الختم ہے۔ مہمانوں کو دال چاول نہ کھانا پڑیں۔

اب بھلا بتایئے، اگر ہم شکار کھیلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم قسائی ہیں۔ جو چیز ہمارے سامنے نکلے، ہم اس کو ماریں ضرور۔ بے وجہ صرف کھانے کے لیے۔ ہم تو اگر کوئی اچھے سینگ کا جانور دکھائی دیا تو بندوق چلانے والے انسان۔ مرغ، تیتر کھانے والے شکاری۔ مجھے بڑے جانور کا گوشت کھانا سخت ناپسند۔ یہاں تک کہ مجھے مرغابی اور قاز کا بھی گوشت پسند نہیں۔ اس میں مجھ کو بساند آتی ہے۔ اب میں جانور ماروں تو راجہ صاحب کے مطبخ کے لیے ماروں۔ لہٰذا یہ چند موقعے ایسے ہوتے، جس میں اکثر وبیشتر میرا اور راجہ صاحب کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔

شام کو جب سب لوگ اکٹھا ہوتے اور دوسرے دن کا پروگرام بن رہا ہوتا تو میں اپنا واپسی کا پروگرام بناتا جو کبھی پورا نہ ہو پاتا۔ وجہ یہ ہوتی کہ رات میں یا تو کسی نہ کسی پہیے کی ہوا نکلی ہوئی لگتی، یا ڈسٹری بیوٹر کا تار غائب ہوتا، یا بندوق، رائفل غائب ہو چکی ہوتی۔ یا تیتر، مرغ وغیرہ جو گھر لے جانے کے لیے چھپا کر رکھے گئے ہوتے، وہ پیٹوں میں دفن ہو چکے

ہوتے۔ان تمام باتوں کے باوجود جب میں جانے کے لیے بضد رہتا تو دو،ایک دوست موقع دیکھ کر مجھے دبوچ لیتے اور ہاتھ پیر باندھ کر غسل خانے میں بند کر دیتے۔

الغرض واپسی اسی وقت ہوتی جب راجہ صاحب کی مرضی ہوتی۔اگر تین دن کے ارادہ سے ان کے یہاں گئے تو واپسی میں ہفتہ، دس روز لگنا لازمی بلکہ یقینی تھا۔

راجہ ضیاء اللہ خانصاحب شکاری دنیا کی وہ شخصیت ہیں جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی لیکن وہ آج تک روشنی میں نہیں آسکے۔اس کا سبب میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔یعنی ان کے کارناموں کا منظر عام پر نہ آنا۔کاربٹ اور اینڈرسن نے اپنے کارنامے اور واقعات کو تحریری شکل دی اور باقاعدہ کتابوں کی صورت میں عوام میں پیش کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی ایک مخصوص شہرت کے حامل ہوئے۔لیکن ہمارے راجہ صاحب نے بندوق ہی چلائی۔قلم چلانے کا خیال بھی غالباً ان کے دل میں کبھی نہ آیا۔۔انجام کار شکار کا یہ مردمیداں گوشہ گمنامی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔کاش کہ بندوق کی مانند شکاریات کے موضوع پر بھی انہوں نے قلم چلایا ہوتا تو ملک کے نامور ترین شکاریوں کی صف میں براجمان نظر آتے۔

شکار، 'فائن آرٹ' ہی کا ایک شعبہ ہے اور علم حیوانات(Zology) و نباتات (Botany) کی ایک شاخ ہونے کے باعث سائنس کے زمرہ میں بھی آتا ہے۔یہی سبب ہے کہ شیر پر اتنی ریسرچ کی گئی ہے کہ پرانے زمانوں کے قصوں کہانیوں کے برعکس ایک نئی حقیقت بن کر، ایک نئے وجود میں ہمارے سامنے آیا۔اس کی گوناگوں خصوصیات جو پہلے ہماری نظروں سے پوشیدہ تھیں ،واضح ہو کر ہمارے سامنے آئیں۔یعنی شیر پر کی گئی تحقیقات نے اس کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا۔اس کی ذات سے متعلق ہر تاریک گوشہ کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا۔چونکہ یہ تحقیق پوری طرح مکمل ہے ، لہٰذا اس پر مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔حالانکہ اس کے بیشتر پہلوؤں سے زیادہ تر شکاری واقف تھے، لیکن چونکہ یہ علم تمام کا تمام ان کے سینوں میں ہی دفن رہا، اس لیے عام آدمی اس سے واقف نہ ہو سکا۔

ایماندار شکاری اب اس بات پر متفق ہیں کہ شیر کا شکار اب کوئی بہادری کا کارنامہ نہیں، بلکہ ایک سائنسی مسئلہ ہے جو جتنے سلیقہ سے سلجھایا جائے ،اتنا ہی بہتر ہے۔

ہم ہندستانیوں میں شاید ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہمیں ٹھیک طرح کام کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ بغیر کسی منصوبے اور پیش بندی کے بڑے بڑے کام میں مداخلت کر بیٹھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامیابی کی امید کم سے کم ہو جاتی ہے اور اس کے تجربات وتاثرات سے دوسرے فائدہ نہیں اُٹھا پاتے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے تجربات کا تنقیدی انداز میں جائزہ نہیں لیتے۔

ہندستان میں شیر کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ والیان ریاست اور بڑے بڑے افسر شیر کا شکار بطور فیشن کرنا باعثِ فخر خیال کرتے تھے، لہٰذا یہ لوگ شکار کھیلتے رہے۔ یا یہ کہا جائے کہ لوگ ان کو شکار کھلواتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں شیر مارے جانے کے باوجود اس میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو شیر کے شکار کی صحیح تکنیک سے واقفیت رکھتے ہوں، اور جنھوں نے اپنے شکاری تجربات ومشاہدات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہو۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہُوا یہ ہوگا کہ وہ موٹر سے جنگل گئے، راستہ ڈرائیور کو معلوم۔ مچان پہلے سے تیار۔ جہاں پڈّا (بھینس کا جوان بچہ۔کٹرا) پہلے ہی شیر کا لقمہ بن چکا ہے۔ صاحب موٹر سے اُترے۔ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ ہاتھی بذریعہ فیل بان ٹھیک مچان کے نیچے روکا گیا اور صاحب ہاتھی کی پیٹھ سے مچان پر براجمان ہو گئے۔ ہانکا شروع ہوا اور شیر کو گھیر گھار کر مچان کی سمت ہانک دیا گیا۔ صاحب مچان پر اپنی اعلا درجہ کی انگلستان کی بنی بندوق اور کارتوس لیے ایک مسلح شکاری کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ شیر ہانکے کے بعد سامنے آتا ہے جس کے محض دیدار سے ہی ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ساتھی شکاری ٹہوکے پر ٹہوکے دیتا ہوا کہہ رہا ہے 'صاحب گولی چلائیے، شیر نکلے جا رہا ہے۔ اس پر گولی چلانے کا سب سے اچھا موقع ہے'۔ دریں اثناء صاحب بہادر بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے آنکھیں موند کر فائر جھونک دیتے ہیں۔ جہاندیدہ ساتھی شکاری، صاحب بہادر کی کیفیت سے پوری طرح واقف ہے، لہٰذا وہ اپنی رائفل کی نالی آہستہ آہستہ شیر کی طرف کر رہا ہے۔ جیسے ہی صاحب کا فائر ہوتا ہے، وہ بھی اپنی بندوق داغتا ہے۔ صاحب کی گولی کہاں جاتی ہے، کس کو لگتی ہے، یہ تو قدرت ہی جانے، البتہ ساتھی شکاری کے ذریعہ چلائی گئی گولی اپنے اچوک نشانے کی داد طلب کرتی ہوئی

شیر کے کسی نازک مقام پر لگتی ہے اور شیر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ صاحب کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ہانکے والے انعام و اکرام سے نوازے جاتے ہیں ۔ مُردہ شیر کی پیمائش کی جاتی ہے اور زبردستی اسے بارہ فٹ لمبا ثابت کر دیا جاتا ہے ۔ اگلے روز یہ خبر تعریفوں کے پل تعمیر کرتی ہوئی اخبار کی زینت بنتی ہے ۔ شام ہوتے ہی صاحب کلب پہنچتے ہیں اور کلب کی حسین و نازنین ممبر دوستوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے شمپین کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے، فخریہ انداز میں شیر کے شکار کی داستان بیان کرتے ہیں ۔ اور کلب کے حسین ساتھیوں سے دادِ تحسین وصولتے ہوئے، ہیرو کا مقام پاتے ہیں۔

عموماً دولتمند لوگ اپنے پیسے کی طاقت کے بل بوتے شیر کے مستند شکاری بن گئے اور اپنے تجربات کو کتابی شکل دے کر سماج میں ایک مخصوص مقام بھی بنا گئے۔

راجہ صاحب نے شکار کو شکار سمجھ کر کھیلا۔ شیر کا مشاہدہ کیا، اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انہیں اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی، نیز اس کی ہر صفت سے واقفیت حاصل کی۔ الگ الگ موسموں میں، اس کے رہنے کی پسندیدہ جگہوں کی معلومات حاصل کی ۔ جنگل کے ان خطوں کو جن میں شیر رہنا پسند کرتا ہے، اس کو جانا پہچانا۔ پہاڑی شکار گاہوں اور میدانی علاقوں کے فرق کو سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ صاحب ایک نہایت تجربہ کار اور کامیاب شکاری بن گئے ۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اتنے شیروں کا شکار کیا، جب کہ دسیوں شکاری زندگی بھر جنگلوں کی خاک چھانتے ہیں اور شیر کا شکار کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اس کے دیدار تک کو ترستے رہ جاتے ہیں۔

راجہ صاحب کی شخصیت ایک بہت بارعب شخص کی شخصیت ہے ۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ان کا حلیہ، ان کا سراپا بھی بیان کر دیا جائے۔

راجہ صاحب دراز قد، مائل بہ فربہی انسان ہیں ۔ رنگ جوانی میں سانولا تھا۔ لیکن سُرخی لیے ہوئے۔ اب سر کے بال دودھ کی مانند سفید اور ملائم ہیں۔ دانت چھوٹے چھوٹے سفید اور انتہائی مضبوط ۔ ہاتھ ملائم اور گداز ۔ ہاتھ کی انگلیاں کسی آرٹسٹ کی طرح لمبی اور مخروطی، پیشانی بلند اور چمکدار ۔ ناک متناسب اور ستواں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور باہر کو ابھری ہوئی ۔ سرخ

ڈورے لیے ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی دو ایک بوتل چڑھا کر آئے ہوں۔ حالانکہ کبھی شراب کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ میں نے اکثر ان سے کہا 'راجہ صاحب اپنی آنکھیں کسی ڈاکٹر کو دکھائیں، شاید آپ کو ناخونیہ ہو گیا ہے'۔ راجہ صاحب ہمیشہ میری اس بات پر مسکرا کر چُپ ہو جاتے اور آج بھی علاج و چشمہ کے بغیر بہترین نشانہ باز ہیں۔ .U.P اور NRAI (اسکیٹ شوٹنگ) میں امتیازی درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

الغرض راجہ صاحب کی شخصیت نہایت شاندار، اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چہرے سے نیکی، بہادری اور ایمانداری صاف عیاں ہے۔

اسرار احمد خاں درّانی
تاروں والا باغ، بازوزئی اوّل
شاہجہاں پور (یو پی)

یکم جنوری ۲۰۰۱ء

ہمارے جنگلات

برصغیر ہندستان اپنے گھنے جنگلوں اوران میں بسنے والے ہزار ہااقسام کے سبزی خور جانوروں (چرندوں) اور گوشت خور جانوروں(درندوں) کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ہمارے ملک کے یہ جنگل ہمالیہ کے برف پوش پہاڑی سلسلوں سے شروع ہو کر راجستھان کے ریگزاروں ، اتر پر دیش کے میدانوں، آسام کے دلدلی علاقوں سے ہوتے ہوئے جنوب میں راج کماری تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ان جنگلوں میں انواع واقسام کے پرندے، چرندے اور درندے پائے جاتے ہیں۔ جو خطوں کے لحاظ سے بٹے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ میدانی علاقوں کے کچھ جانور جو اینٹی لوپ(Antilope) نسل سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہرن، نیل گائے، چکارہ اور چوسنگا، وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ان علاقوں میں ان کے جھنڈ پانچ، پانچ ہزار تک کی تعداد میں بتائے جاتے ہیں اور کسی بھی غول میں سوسوا سو سے کم جانور نہیں ہوتے۔

گزشتہ سال کے وسط میں میں نے لکھیم پور کے ایک دیہات حضرت پور کی بھوڑ،(ریت کا علاقہ) پر ہزار ہزار، ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار ہرنوں کے غول دیکھے تھے ۔ میرے بزرگ تو شمالی اتر پردیش میں متعدد جگہوں پر اس سے بڑے بڑے غول دیکھے جانے کا ذکر کرتے تھے ۔ وہاں بھوڑ تو اب بھی ہیں لیکن ہرن دیکھنے میں نہیں آتے ۔البتہ جنگلوں میں چند ہرن ضرور دیکھے جاسکتے ہیں ۔ کچھ ایسا ہی حال نیل گائے کا تھا۔یو۔پی اور دوسرے صوبوں میں اس کی کثرت تھی۔اب سے چند برس قبل ترائی بھابھر کے علاقے میں پاڑوں کی اتنی کثرت تھی کہ اکثر لوگوں نے بیل گاڑی کے پہیوں کے نیچے داب داب کر مار ڈالے ۔ میلانی کے علاقے میں چوسنگھے بکثرت تھے۔ رات میں آٹھ، آٹھ، دس، دس کے غول اکثر ملتے تھے۔ اور مہوف بلاک میں چھ، چھ سات سات کانکڑوں کے غول میں نے خود دیکھے ہیں۔

مالا بلاک میں بھی کاکڑ بکثرت ملتے تھے۔ کشن پور میں کئی بہت بڑے بڑے غول چیتلوں کے تھے۔ مورنیا کے جھانک (نرچیتل) اپنے بڑے بڑے سینگوں کے لیے بہت مشہور تھے۔ یہ قدو قامت میں اور جھانکوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے سینگوں کے لیے بہت مشہور تھے۔ یہ قدو قامت میں اور جھانکوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ان کے سینگ دوسروں کے مقابلے میں بہت بڑے ہوتے ہیں۔ مڑھا کوٹھی جو ہیرا پور بلاک میں ہے اس کے نزدیک ایک چاندر میں چیتلوں کا ایک غول جو دو ڈھائی سو چیتلوں پر مشتمل ہوگا، روز رات میں ملتا تھا۔ اس میں دو چیتلیں بالکل سفید رنگ کی تھیں یعنی Albino۔ اس طرح شمالی یوپی کا وہ علاقہ جو نیپال کے نیچے بہرائچ سے دہرہ دون تک پھیلا ہوا ہے، اور جس میں دسیوں بلاک ہیں، انواع اقسام کے جانوروں سے بھرے پڑے تھے۔ لیکن آج حال یہ ہے کہ میلوں چلے جایئے، جانور کا نام ونشان نہیں مل سکتا۔ یہ تمام جانور ۱۹۵۱ء سے کم ہونا شروع ہوئے۔ ان کے کم ہونے کی خاص وجہ میری رائے میں ہندستان کا تقسیم ہونا ہے۔ کیونکہ تقسیم سے اس صدی کی سب سے بڑی نقلِ مکانی ہوئی۔ ہندستان میں آئے تارکین وطن کی بود وباش کا مسئلہ جب حکومت کے سامنے آیا تو حکومت نے ان لوگوں کو جو ایک مخصوص فرقے اور قوم سے تعلق رکھتے تھے اور جفاکشی میں اپنی مثال آپ تھے، جنگلات کے کنارے کنارے آباد کرانا شروع کر دیا۔ یہ قوم نہ ہی جنگلات سے واقف تھی، نہ ہی اس میں بسنے والے جانوروں سے۔ ان کی نگاہ میں نہ تو جنگلوں کی کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی جنگلی جانوروں کی۔ وہ انہیں اپنی جان اور فصلوں کا دشمن گردانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے محض زمین اور پیسے کے لالچ میں جنگلوں کو بے دردی کے ساتھ کاٹنا اور جنگلی جانوروں کو بے رحمی کے ساتھ مارنا شروع کر دیا۔ اور جنگل کی لکڑی نیز جانوروں کی کھالوں، ہڈیوں، اور دوسرے اعضاء کی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی برسوں میں سینکڑوں میل کے علاقے میں جنگلوں کی جگہ یا تو چٹیل میدان نظر آنے لگے یا کھیت۔ جنگلی جانوروں کی بہت سی نادر ونایاب نسلیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ اب ان کا نام صرف کتابوں کے اوراق میں ہی زندہ ملے گا۔ عالم وجود میں نہیں۔

شاید ہماری قوم ذہنیت کے لحاظ سے اس وقت بہت پسماندہ تھی۔ ہماری ذہنی سطح

اتنی بلند نہیں تھی کہ اپنی غلط حرکتوں کے نتیجہ میں مستقبل میں ہونے والے نقصانات پر نگاہ رکھ سکے۔ ہم اسبات کا اندازہ قطعاً نہیں لگا سکے کہ ہماری منفی حرکتوں سے آنے والے وقت میں ملک وقوم کا کس قدر اور کتنا نقصان ہوگا۔ اور آنے والی نسلیں کس قدر گھاٹے میں رہیں گی۔

ہم میں سے اکثر اپنے فوری فائدہ کو ہی اپنی کامیابی کی معراج خیال کرتے رہے۔ جنگلات اور اس کے حیوانات ونباتات کا بے دریغ صفایا اس کی کھلی مثال ہے۔

اگر جنگل کا ایک درخت کوئی شخص کاٹ لیتا ہے، تو اسے وقتی طور پر کچھ مالی فائدہ یقیناً ہوتا ہوگا لیکن وہ یہ قطعی خیال نہیں کرتا کہ اس ایک پیڑ کو، جسے اس نے تھوڑے سے وقت میں زمین بوس کر دیا، اپنی طبعی عمر تک پہنچنے کے لیے بیسیوں برس کا وقت لگا ہے۔

اگر جنگل کے تمام درخت ایک ایک کر کے کاٹ دیئے جائیں تو غور کیجئے کہ اس ملک کے موسم پر اس کا کتنا منفی اثر پڑے گا۔ اس طرح جنگل میں بسنے والے تمام جنگلی جانوروں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے تو کیا جنگلوں کی خوبصورتی اور ساتھ ہی ملک کی بیش بہا دولت ضائع نہیں ہو جائیگی؟

جنگلی جانوروں کی کمی کا دوسرا باعث یوکلپٹس کی شجر کاری بھی ہے۔ اس درخت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے آس پاس کے دوسرے پودوں کو پنپنے نہیں دیتا۔ نہ ہی اس کے سایہ میں کسی طرح کا سبزہ اُگ سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جہاں جہاں یوکلپٹس کی شجر کاری ہوئی، وہاں میلوں تک درختوں کے نیچے اُگنے والی گھاس کا پنپنا بند ہو گیا۔ جانوروں کے کھانے اور چھپنے کی جگہیں ختم ہو گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کھیتوں کا رُخ کرنا شروع کر دیا۔ کاشتکاروں نے اپنی فصلوں کو محفوظ رکھنے کے لیے مختلف طریقوں، جیسے پھندے لگا کر، گڑھوں میں گرا کر اور دیسی بموں کے ذریعہ انہیں مارنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آیا کہ ان جانوروں کی تعداد گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ گئی۔ پہلے ہر جنگل کے چاروں طرف گھاس کا ایک بارڈر سا ہوا کرتا تھا۔ رات میں چرنے کے بعد یہ جانور دن میں اسی گھاس میں پناہ لیا کرتے تھے اور شکاریوں کی دست بُرد سے محفوظ رہتے تھے۔ یہ گھاس تین چار میل کی چوڑائی میں ہوتی تھی۔ اور پورے جنگل کا احاطہ کیے رہتی تھی۔

اسی گھاس میں یہ جانور افزائش نسل بھی کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان جانوروں کی شرح پیدائش، شرح موت کی بنسبت زیادہ تھی۔ لہٰذا جنگل ان جانوروں سے بھرے رہتے تھے۔ جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھی، زیادہ غذا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا گھاس کے یہ میدان کھیتوں کی شکل میں تبدیل ہوتے گئے۔ چونکہ یہ بستیاں جنگلوں کے کنارے آباد کی گئی تھیں، اس لیے ان کو زرعی زمین بھی انہی میدانوں سے فراہم کی گئی۔

جنگل، جانوروں کے علاوہ ڈاکوؤں کی رہائش گاہ بھی رہا۔ یہ ڈاکو جنگل سے ملحق آبادیوں میں لوٹ مار کرتے اور جنگل میں چھپ جاتے۔ لہٰذا ان بستیوں میں ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے بندوقوں کے لائسنس دیئے گئے۔ یہ بندوقیں ڈاکوؤں کے لیے استعمال ہوئیں یا نہیں، لیکن ان کی زد میں جانور ضرور آئے۔ عام طور پر یہ بندوقیں بارہ بور کی تھیں اور اس میں گرّاب کا استعمال ہوتا تھا۔ انہیں چلانے والے اچھے نشانہ باز بھی نہیں تھے۔ اس وجہ سے زیادہ تر جانور مرنے کے بجائے زخمی ہو کر سسک سسک کر مرتے تھے۔ اس وجہ سے انسان کا خوف ان پر بُری طرح حاوی ہو گیا۔ اب جنگلوں میں انسانوں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی کیونکہ گھاس صاف ہونے کی وجہ سے جنگل میں پہنچنا آسان ہو گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جیپوں کا چلن بھی بڑھ گیا۔ چھت کھلی ہونے کے باعث یہ شکار میں بہت کار آمد ثابت ہوتی تھیں۔ سرچ لائٹ کی تیز اور دور تک جانے والی روشنی بھی جنگلی جانوروں کی تباہی کا باعث بنی۔

سانبھر ایک انتہائی بھولا جانور ہے اور آدمی سے بہت شرماتا ہے۔ یہ اپنے چھپنے کی جگہ سے دوسرے جانوروں کے بعد نکلتا ہے اور سب سے پہلے واپس لوٹ جاتا ہے۔ جنگلوں، گھاس اور انڈر گروتھ یعنی چھوٹے پیڑ پودے اور جانوروں کے بچوں کا مارا جانا، سانبھر کی تباہی کا دوسرا سبب بنیں۔ یوکلپٹس جس قدر فروغ پاتا گیا، سانبھر کی تعداد کم سے کم ہوتی گئی۔ نوبت یہ ایں جا رسید کہ آج سانبھر کی تصویریں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں، زندہ سانبھر جنگلوں میں برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔

گونڈ (بارہ سنگھا) گھاس کا جانور تھا۔ جنگلوں کے اندھا دُھند کٹنے سے بارشوں کے

نظام میں آئی زبردست تبدیلیوں کے باعث جنگل کے ندی، تالاب، پوکھر، جھیلیں چھوٹے بڑے گڈھے خشک ہونا شروع ہو گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے اطراف میں اُگنے والی گھاس بھی پانی اور نمی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر ختم ہو گئی۔ یہی جگہیں گونڈ کے رہنے اور افزائش نسل کی تھیں۔ جب یہ جگہیں نہ رہیں تو گونڈ کیسے رہ سکتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر محکمہ جنگلات کا دھیان اس طرف گیا اور اس نے گونڈ کی نسل کو تحفظ دینے کے لیے کچھ عملی اقدام کیے۔ اولین ترجیح دیتے ہوئے گونڈ کے شکار پر پابندی لگائی گئی۔ اس کی بود و باش کے لیے محفوظ پناہ گاہیں بنائی گئیں۔ تالابوں اور جھیلوں کو نہروں سے جوڑ کر پانی سے لبریز کیا گیا۔ جہاں نہریں نہیں تھیں، وہاں ٹیوب ویل نصب کر کے پانی کا انتظام کیا گیا۔ حالانکہ ان تمام انتظامات پر سرکار کو کافی خرچ برداشت کرنا پڑا لیکن گونڈ کی نسل تباہ ہونے سے بچ گئی۔ چونکہ سانبھر کے لیے بروقت انتظامات نہیں ہو سکے تھے، لہٰذا اس کو محکمہ جنگلات بھی نہیں بچا سکا۔

چوسنگھا بھی قریب الختم ہے کیونکہ اس کی بود و باش جنگل کی چھوٹی جھاڑیوں میں رہتی ہے جہاں انسان آسانی سے پہنچ جاتا ہے اور یہ خود بھی کسی قدر بے وقوف سا جانور ہے۔ اس وجہ سے دوست دشمن کی تمیز نہیں کر پاتا، نتیجتاً آسانی سے مارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نسل بھی خاتمے کے قریب ہے۔ اسی طرح جانوروں میں اور نہ معلوم کتنی اقسام ختم ہو گئیں یا قریب الختم ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے غالباً کہیں پڑھا تھا کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے دلّی کے قرب و جوار میں ارنا بھینسے اور گینڈے بکثرت پائے جاتے تھے۔ لیکن غدر کے زمانے میں انگریز حاکموں نے ان سب کو مار ڈالا۔ جہاں سیاسی ماحول میں تبدیلی آئی، وہیں جغرافیائی حالات میں بھی نمایاں تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ ان جانوروں کے قیام اور رہنے کی جگہیں ختم ہوئیں، لہٰذا یہ جانور بھی ختم ہوتے چلے گئے۔ آج گینڈا آسام اور نیپال کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔ ارنا بھینسا صرف مدھیہ پردیش اور جنوبی ہندستان کے کچھ علاقوں میں ہی نظر آتا ہے۔ اب نیپال تک میں اس کا وجود نہیں۔

ایک زمانہ تھا جب یوپی کے جنگلات میں گلدار اور ریچھ کی بہتات تھی۔ لیکن اب یہ

حال ہے کہ یہ جانور تقریباً ناپید ہو گیا۔ البتہ پہاڑی بلاکوں میں اب بھی اکثر گلدار کے پیروں کے نشانات دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ قلہ بلاک میں کچھ عرصہ گزرا ایک ڈی۔ ایف۔ او (D.F.O) کو ایک ریچھ نے زخمی کر دیا تھا۔ لیکن اب حال یہ ہے کہ تلاش کرنے پر بھی ریچھ کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک رات مہوف میں تین ریچھ نہر کی سڑک پر میری جیپ کے آگے کافی دور تک بھاگتے رہے۔ ہم لوگوں نے ان پر گولی نہیں چلائی۔ راجہ صاحب کے خیال میں جنگل کا یہ جانور اس لائق ہے ہی نہیں کہ اس کو مارا جائے۔ نہ ہی اس کی کھال میں کوئی خوبصورتی ہے اور نہ ہی اس کا گوشت قابل استعمال۔ لیکن یہ جنگل کا سب سے خونخوار اور بدتمیز جانور ہے۔ یہ انسان کو دیکھ کر بلا وجہ حملہ کر سکتا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے مضبوط ناخنوں اور دانتوں سے یہ اگلے حصہ پر حملہ آور ہو کر بیہمانہ طور پر نوچ کھسوٹ کر انسان کو بری طرح زخمی کر دیتا ہے۔ شکاری اسے مارنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جب تک کافی تعداد میں کارتوس نہ ہوں، اس پر گولی نہیں چلانا چاہیے۔ کیونکہ زخمی ریچھ کی چیخیں سُن کر جنگل کے تمام ریچھ اسی جگہ آن موجود ہوتے ہیں اور شکاری کو ان سے اپنی جان بچانے کے لیے زبردست فائرنگ کرنی پڑتی ہے۔ اگر وافر مقدار میں کارتوس نہ ہوں تو ان کے نرغے سے نکلنا آسان کام نہیں ہے۔

ایک مرتبہ مالا کے جنگل میں کچھ ریچھ مزدوروں کی جھونپڑیوں کے پیچھے نظر آئے۔ شاید وہ جھونپڑیوں میں سے کھانے پینے کا سامان چُرانے آئے تھے۔ میرے ایک ساتھی نے کڑا اب چلا دیے۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم لوگ چونکہ جیپ میں سوار تھے، اس لیے ان کی چیخوں کو نظر انداز کر گئے۔ ذرا سی دیر میں کئی اور ریچھ اس جگہ آن موجود ہوئے اور اس زخمی ریچھ کو لے کر نشیب میں اُگی گھاس میں اُتر گئے۔ ہم لوگ دوسرے روز زیادہ تعداد میں کارتوس لے کر زخمی ریچھ کی تلاش میں گھاس میں گھسے۔ دور تک تلاش کرنے کے بعد وہ ریچھ مردہ حالت میں مل گیا۔ اس کے بدن پر تین چار جگہ زخم تھے۔ ان زخموں میں کسی میں بال، اور کسی میں گھاس ٹھونسی ہوئی تھی۔ یہ گھاس اور بال اس کے ساتھیوں نے اس کے زخموں میں غالباً خون روکنے کے لیے ٹھونسی ہو گی تاکہ اس کا خون بہنا بند ہو جائے۔

گلدار بھی کافی چالاک جانور ہے۔ اکثر شکاری اس کی عادت سے ناواقفیت کے باعث نقصان اٹھاتے ہیں۔ مرتے وقت گلدار شکاری کو سخت دھوکے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ گلدار اگر گولی کھا کر گر جائے تو شکاری کو چاہئے کہ وہ پوری طرح اطمینان کر لے کہ گلدار مر بھی گیا ہے یا نہیں۔ اور جب اس کی موت کا پوری طرح یقین ہو جائے تب ہی اس کے نزدیک جائے۔ اس کی موت کا یقین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی آنکھوں کو دیکھا جائے۔ اگر وہ بند ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ گلدار ابھی زندہ ہے۔ اس کے برعکس اگر آنکھیں کھلی ہیں تو وہ مر چکا ہے۔ گلدار کی یہ مخصوص حالت اس کے مشاہدہ اور کافی تجربے کے بعد راجہ صاحب نے بیان کی تھی۔

جنگلی کتے جو جانوروں کے ازلی دشمن ہیں، اب بالکل ناپید ہو چکے ہیں۔ کسی بھی جنگل یا بلاک میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ انگریزوں کے زمانے میں انہیں ختم کرنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں مارنے پر فی کتا چالیس روپے انعام ملا کرتا تھا۔ اس دور میں یہ رقم معنی رکھتی تھی۔ جس بلاک میں بھی ان کا غول در آتا، وہ پورے کا پورا بلاک شکار سے خالی ہو جاتا تھا۔ بلکہ محکمہ جنگلات کے کارکن بھی وہ بلاک چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ حالانکہ یہ کتے انسان کے لیے بے ضرر تھے، اس کے باوجود انہیں پالا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی انسانوں سے یہ کسی قدر مانوس ضرور ہوتے تھے، لیکن جنگلی جانوروں کے یہ ازلی دشمن تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی شیر بھی ان کی دست بُرد سے نہیں محفوظ رہتا تھا۔ گوند، سانبھر، چیتل، پاڑا، غرضیکہ سب کو مار کر چٹ کر جاتے تھے۔ مجھے بھی ان کتوں، سے دلی نفرت تھی اور جہاں بھی اور جب بھی موقع میسر ہوتا، انہیں مار ضرور دیتا تھا۔ غالباً اس کا سبب وہ واقعات تھے جو بچپن میں بزرگوں نے ان سے متعلق مجھے سنائے تھے۔ یا پھر وہ خوف بھی ہو سکتا ہے، جو ان کی جانب سے میرے دل میں تھا۔

بھلا ہو، کے اینڈ رسن اور ای۔ پی۔ گی کا کہ جن کی تحریریں پڑھ کر جنگلی کتوں کے تئیں میری جو نفرت تھی اور خوف تھا، وہ تقریباً ختم ہو گیا۔

ای۔ پی۔ گی (E.P.GEE) اپنی کتاب 'دی وائلڈ لائف آف انڈیا' (The

(Wild Life of India) میں ایک جگہ رقم طراز ہے :

"جنگلی کتے چاکلیٹی رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کی پونچھ سرخی مائل ہوتی ہے اور پونچھ کی نوک سیاہ۔ یہ جنگلی کتے ہندستان کے عام کتوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا آبادی میں رہنے والے کتوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ کتے عموماً انسان پر حملہ آور نہیں ہوتے اور نہ ہی پالتو مویشیوں کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو پالے جاسکتے ہیں اور نہ ہی سدھائے جاسکتے ہیں۔"

ای۔ پی۔ گی کے ہی بقول کشمیر اسٹیگ (Kashmir Stag) یعنی کستوری ہرن (مشکی ہرن) کی تعداد بھی انتہائی کم ہوگئی ہے، بلکہ ناپید ہونے کے قریب پہنچ چکی ہے۔

ایشیا کا ببر شیر جو ایک زمانے میں دریائے نرمدا کے شمالی خشک اور کھلے ہوئے جنگلات میں بکثرت ملتا تھا، اور دلی کے قرب و جوار میں بھی پایا جاتا تھا۔ اب سوائے گجرات کے گیر فارسٹ کے تمام ہندستان میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی تعداد بھی گھٹتے گھٹتے چند سو تک ہی رہ گئی ہے۔

رائس (Rice) شیکسپیر (Shakespear) اور دوسرے بہت سے اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ راجے مہاراجے اور ڈائرکٹ شوٹنگ بھی شکار کی کمی کا باعث ہیں۔ لیکن ہمارے راجہ صاحب اس بات سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ جب انسانوں کی تعداد بڑھتی ہے تو جانوروں کی تعداد خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ یہ نظام قدرت ہے۔

یقیناً یہ بات قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اگر اس وقت مختلف راجگان اور فوجی افسران کا شیروں کے شکار سے متعلق ریکارڈ بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔

بی شیلر (B.Scheller) لکھتا ہے کہ گورڈن کیننگ (Gorden Caning) نے ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران تہتر (۷۳) شیر دریائے نرمدا کے کنارے ایک ضلع میں مارے تھے۔ اور ایک مرتبہ دس شیر صرف پانچ دن میں مار لیے تھے۔

فورسیتھ (Forcyth) نے ۱۹۱۱ء میں اکیس شیر اکتیس دن میں مارے۔ اتر پردیش میں جارج پنجم اور ان کی پارٹی نے گیارہ دن میں انتالیس شیر شکار کیے۔

۱۸۵۷ء میں راجپوتانہ میں ایکسو اٹھاون شیر مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ ان میں

اکتیس بچے بھی شامل تھے۔

مہاراجہ نیپال اور ان کے احباب نے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً چار سو تینتیس شیر ہلاک کئے۔اس شکار میں ترپن گینڈے بھی مارے گئے۔

کرنل نائٹ اینگیل (Cal. Nightengale) نے بقول پرسی (Persy) حیدر آباد میں تین سو شیروں کا شکار کیا۔ مہاراجہ اودے پور نے اپنی زندگی میں ایک ہزار شیر مارے۔ مہاراجہ وجے نگرم نے تین سو چالیس سے زائد شیروں کا شکار کیا، لیکن یہ سلسلہ ان کی ناوقت موت نے موقوف کر دیا، ورنہ وہ بھی ہزار پانچ سو کی گنتی کو پار کر جاتے۔ مہاراجہ سرگوجہ نے ۱۹۶۵ء تک گیارہ سو پچاس شیر مارے تھے۔اس کے بعد کا ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔

یہ اعداد و شمار صرف ترانوے سال کے ہیں جس میں بڑے بڑے راجے مہاراجے اور فوج کے اعلیٰ افسران شامل ہیں۔ چھوٹے چھوٹے راجہ، نواب، تعلقہ دار، زمیندار، فوجی افسر، سول افسر، نیز عام آدمی جو سرکاری اجازت نامے کے ساتھ شکار کرتے تھے، ساتھ ہی ایسے لوگ جو چوری چھپے شیر کا شکار کرتے تھے، الگ ہیں۔ان سب کو شمار کرنا اور اس بات کا پتہ لگانا کہ ان سب کے ہاتھوں کس قدر شیر شکار کئے گئے، نہایت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔اب تک کافی تلاش و جستجو کے بعد صرف ترانوے سال کا ہی ریکارڈ دستیاب ہو سکا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران مارے گئے شیروں کی تعداد تقریباً تین ہزار پانچ سو سات (۳۵۰۷) ہوتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا باقی ماندہ اشخاص کا ریکارڈ بھی مل جائے تو سرسری اندازے کے مطابق یہ تعداد تقریباً دس ہزار تک ضرور پہنچ جائے گی۔اگر ترانوے برسوں میں دس ہزار شیروں کا مارا جانا تسلیم کر لیا جائے، تو ایک سال میں اوسط ایک سو آٹھ شیروں کا شکار ہوا۔ یہ اعداد و شمار وائلڈ لائف ڈپارٹمنٹ کے ریکارڈ کے برعکس ہیں، کیونکہ اس کا ریکارڈ تو یہ بتاتا ہے کہ سالانہ تقریباً دو ہزار شیر مارے جاتے ہیں۔اس طرح اس ریکارڈ کے بموجب اٹھارہ ہزار چھ سو شیر شکار کیے گئے ہوں گے۔اگر وائلڈ لائف ڈپارٹمنٹ کے ریکارڈ کو درست مان لیا جائے تو ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہندستان میں کس قدر کثیر تعداد میں شیر پائے جاتے رہے

ہونگے۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ کم و بیش چار ہزار شیر ہی پورے ملک میں دستیاب ہیں۔ جن میں گیر فارسٹ کے ببر شیر بھی شامل ہیں۔

جم کاربٹ کے بموجب ۱۹۴۰ء میں تقریباً دو ہزار شیر پورے ملک میں باقی بچے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں اسٹریسی اور ۱۹۶۴ء میں ای۔ پی۔ گی۔ کے اندازے کے مطابق ہندستان میں شیروں کی تعداد چار ہزار تھی۔ اگر ان اعداد پر پوری طرح یقین نہ کیا جائے تو باقی بچے شیروں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہونی چاہئے۔ پھر بھی یہ گنتی اتنی زیادہ نہیں ہے جو اتنے بڑے رقبہ میں پھیلے ہوئے جنگلات کے لیے کافی سمجھی جائے۔ ہزار کوشش کے بعد بھی موجودہ تعداد کو گذشتہ تعداد کے برابر نہیں لایا جاسکتا، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ شیروں کی شکل میں جو سرمایہ بچا ہے، اس کو ہر طرح سے تحفظ دیا جائے۔

ڈیئر اور اینٹی لوپ میں فرق

نیل گائے، ہرن، چکارا، جنگلی بکری، یعنی چوسنگھا جس کو کسی کسی جگہ گڑھل اور کہیں کوڑی کہتے ہیں، یہ سبھی جانور اینٹی لوپ (Antelope) یعنی دوسینگ والے جانور کہلاتے ہیں۔ بارہ سنگھا (گوند)، سانبھر، چیتل، جس کے نر کو جھانک بھی کہا جاتا ہے اور پاڑا، وغیرہ ڈیئر (Deer) کہلاتے ہیں۔

ڈیئر اور اینٹی لوپ، ان کے فرق کو سمجھنا ایک اچھے شکار کے لیے بہت ضروری ہے۔

اینٹی لوپ، ڈیئر کی طرح اپنے سینگ ہر سال نہیں گراتے۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ سینگ عمر بھر رہتے ہیں۔ جب کہ ڈیر ہر سال پنے سینگ گرا کر نیا تاج زیب سر کرتے ہیں۔ ان سینگوں کا وقت مقررہ پر گرنا، از سر نو نکلنا، نشو و نما پانا۔ گرنے کے اوقات میں شاخوں کی تعداد..... ان تمام امور پر سائنسداں اور محققین نہایت غور و خوض اور تجربہ کے بعد، سب کی رائے یکساں ہے۔

اینٹی لوپ بمقابلہ ڈیئر زیادہ چالاک، ہوشیار اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ انہی دو خصوصیات کے باعث یہ اپنی جان کی بخوبی حفاظت کر لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ڈیئر نسل

کے تمام جانور اپنی زبردست قوت سامعہ، قوت باصرہ اور قوت شامہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہر طرح کے چرندے خطرہ کا احساس ہوتے ہی اپنی جان بچانے کے لیے اور اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے برعکس درندے خطرہ محسوس ہوتے ہی اس کی نوعیت اور اہمیت کو معلوم کرنے کی فکر پہلے کرتے ہیں۔

شیــر

شیر ہندستان کا ایک ایسا جانور ہے جس کے نام سے ہر کس و ناکس واقف ہے، اور صورت آشنا بھی ہے۔ اگر شیر کو کسی نے جنگل میں نہ دیکھا ہو تو چڑیا گھر یا پھر سرکس میں تو دیکھا ہی ہوگا۔ اگر بدقسمتی سے ان دونوں جگہوں پر بھی نہیں دیکھا تو کتابوں وغیرہ میں اس کی تصویر تو یقیناً دیکھی ہوگی۔

شیر بہادری کی علامت ہے۔ شاعر جب کسی کی بہادری، رعب اور دبدبہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو شیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے بھی ایک جگہ اپنے مرثیہ میں لکھا ہے :

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

یہاں شاعر نے نے حضرت امامؑ کو ضیغم یعنی شیر سے تشبیہ دی ہے۔

شیر نہ صرف اپنی بہادری، تیزی اور چستی کے لیے مشہور ہے، بلکہ خونخواری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس جیسی پھرتی اور تیزی کسی بھی جانور میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ طاقت کے اعتبار سے بھی یہ اپنی مثال آپ ہے۔ حالانکہ قد وقامت اور جسامت کے لحاظ سے بہت سے دوسرے جانور شیر سے بڑے ہیں۔ مثلاً ہاتھی اپنے قد وقامت کے اعتبار سے شیر سے کہیں زیادہ بڑا اور طاقتور نظر آتا ہے، لیکن شیر اپنی طاقت اور چستی، پھرتی کے حسین امتزاج کی بدولت وہ ہاتھی کے مقابلے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔

اون زا (Onza) اور پیوما (Puma) جو جنوبی امریکہ کے شیر کہلاتے ہیں، وہ بھی نہ ہندستانی شیر کی مانند طاقتور ہوتے ہیں، نہ ہی ہیبت ناک اور بہادر۔ البتہ لوگوں کا خیال ہے کہ خونخواری میں وہ اس سے کسی قدر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کا قد چونکہ یہاں کے شیر کی بہ نسبت کچھ کم ہوتا ہے اس لیے وہ انسان پر زیادہ ہیبت طاری نہیں کر پاتے ہیں۔

شاہین کے اپنے شکار پر جھپٹنے کے انداز سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ شاعروں

نے شاہین کے جھپٹنے کے انداز کو خوب سراہا ہے او راس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ لیکن کسی بھی شاعر نے ، شیر کا شکار پر جھپٹنے کا انداز کیسا ہے، اس پر کوئی شعر موزوں نہیں کیا۔ ورنہ کہاں شاہین کی جھپٹ اور کہاں شیر کی جَست ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں بارہا شیر کو اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ واہ! کیا منظر ہوتا ہے ۔ مضبوط کاٹھی کا یہ بھاری بھرکم درندہ شکار پر ایسے جھپٹتا ہے جیسے آسمان میں کوندہ لپکتا ہے، یا بجلی چمکتی ہے۔

شیر ہندستان میں ہمالیہ میں ترائی اور نیپال سے لے کر میسور ، بلکہ راس کماری، آسام، بنگال، بہار، اڑیسہ، اُتر پر دیش، مدھیہ پر دیش، آندھرا، مہاراشٹرا، گجرات کے مشرقی اور دکھنی حصے، کرناٹک، تامل ناڈو (مدراس) غرضیکہ ہندستان کی ہر ریاست کے مخصوص جنگلوں میں خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

محکمہ جنگلات کی اطلاع کے مطابق پورے ملک میں اب بھی تقریباً سات ہزار شیر ضرور ہوں گے۔ اس میں نیپال کے شیر بھی شامل ہیں۔ لیکن اب سے ایک صدی قبل یہ تعداد تیس ہزار تک تھی ۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے ، انگریز مصنفین ہندستان کے محکمہ جنگلات کے اعداد و شمار سے اتفاق نہیں کرتے ۔ کیونکہ ان کے نزدیک گننے کا یہ طریقہ سائنٹفک نہیں ہے ۔ عام طور پر اس محکمہ میں اہلکار کمرے میں میز پر بیٹھ کر اپنے اپنے علاقوں کے اعداد و شمار اکٹھا کرلیا کرتے ہیں۔ ان کے اس فعل کی کہیں پکڑ بھی نہیں ہوسکتی۔ محکمہ کے اعلیٰ افسران کسی بھی طرح سے اس کو چیک نہیں کر سکتے ، کیونکہ اعلیٰ افسران کی گاڑی جھاڑیوں اور جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر جا ہی نہیں سکتی۔ ہیلی کاپٹر سے درختوں اور جھاڑیوں میں دیکھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہ بھی اپنے ساتھیوں کی بات پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب ذرا اس محکمہ کی کارکردگی ملاحظہ فرمائیں ۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ میں کسی بلاک میں شکار کھیل رہا تھا ۔ مارچ کی آخری تاریخیں تھیں۔ ایک روز علی الصبح رینج آفس میں بڑی گہما گہمی نظر آئی ۔ وجہ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ "اوپر" سے اطلاع آئی ہے کہ مہینہ ختم ہونے سے قبل یعنی اکتیس مارچ سے پہلے پہلے جنگل کے تمام جانوروں کے اعداد و شمار اکٹھا کر کے چیف

وائلڈ لائف وارڈن لکھنؤ میں داخل دفتر کیئے جائیں۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے، یہ سوچ کر کہ اتنے مختصر وقت میں یہ کارروائی کیونکر کی جائے گی، اسے دیکھنے کا ایک سنہرا موقع میسر آیا ہے لیکن ہماری تمام خوشیوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب اگلے روز پتہ چلا کہ نہ صرف پورے بلاک کے کُل جانوروں کو شمار کر لیا گیا ہے، بلکہ اس کی تفصیلی رپورٹ بھی مرتب کر کے روانہ بھی کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام کارروائی بند کمرے میں چند گھنٹوں میں عمل میں لائی گئی ہوگی۔ کچھ ہی عرصہ بعد چیف وائلڈ لائف وارڈن کی رپورٹ اخباروں کے ذریعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں لکھا تھا کہ سال رواں میں اُتر پردیش میں شیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، برخلاف اس کے مجھے نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ اس بلاک میں نومبر سے مارچ تک تین شیر راجستھان کے کنجر کہے جانے والے آدی واسیوں نے مار دیے تھے۔

شیروں کی تعداد میں کمی کی کئی وجوہات ہیں، جن کا تذکرہ یہاں پر کرنا مناسب ہوگا۔

الف. غیر ممالک خصوصاً یورپ کے بازاروں میں شیر کی کھال کی قیمت میں زبردست اضافہ۔

ب. رات میں سرچ لائٹ کی مدد سے غیر قانونی طور سے شیر کی پوچنگ۔

ج. غیر قانونی طور پر شکار کھیلنے والوں کی تعداد کا بڑھ جانا جو شکار کا گوشت، کھالیں اور ہڈیاں و ناخن بیچنا بطور پیشہ کرتے ہیں۔

د. ایسے جانوروں کا کم ہو جانا جو شیر کی غذا ہیں۔

ح. شیروں کا پرمٹ حاصل کر کے بلا تخصیص نر و مادہ کا بے دریغ مارا جانا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک صرف دس سال کے عرصہ میں بذریعہ پرمٹ ایک ہزار چوہتّر (۱۰۷۴) شیر شکار کیئے گئے۔

و. جنگل کے درختوں کی بے حساب کٹائی اور ان سے متصل زمینوں پر کھیتی باڑی کا ہونا جو جنگل کے کنارے اُگنے والی گھاس کا صفایا کر کے کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگل کے گھاس کھانے والے جانور اپنی غذا کی تلاش میں دور دور تک پھیل گئے۔ لہٰذا شیر کو اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے زیادہ

کوشش اور جدو جہد کرنی پڑی اور عموماً بھوکا رہنا پڑا۔ اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے انہیں پالتو مویشیوں کا شکار کرنا پڑا جو جنگل کے قریب کی آبادیوں سے وہاں چرنے آتے تھے۔ کبھی کبھی انسانوں پر بھی حملے ہوئے اور دونوں صورتیں شیروں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ جنگل سے متصل آبادی والوں نے اپنے آپ کو اور اپنے مویشیوں کو بچانے کے لیے شیروں کو مارنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ اس طرح شیروں کی قیمتی نسل کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔

ظ. ہندستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد ان کے فوجی و دیگر افسران ملک کے ہر حصہ میں تعینات ہوئے۔ اس دور میں چونکہ جنگلی جانوروں کی بہتات تھی اس لیے یہ آسانی سے دستیاب تھے۔ یہ بات بھی ان کی تباہی کا بڑا سبب بنی۔ اور انہیں خوب مارا گیا۔

جب فوج اور پولس جنگل میں وارفیئر ٹریننگ کے لیے بھیجی جاتی ہے، تو یہ طے شدہ امر ہے کہ جنگل کے جانور ہی ان کے لیے لذت کام ودہن کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں دہرہ دون سہارنپور روڈ پر ایک فوجی چھاؤنی جنگل کے اندر بنائی گئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس جنگل کے تمام جانور یا تو مار لیے گئے یا وہ اپنی جان بچانے کی غرض سے دوسرے علاقوں کی طرف فرار ہو گئے۔ اس چھاؤنی کے قیام سے قبل اس بلاک میں بے پناہ جانور اور پرندے تھے۔ خصوصاً مرغ، کلیج، کاکڑ، جھانک، سانبھر وغیرہ کی بہتات تھی۔

پچھلی صدی کے نصف میں کچھا کے بارہ کھولی بلاک میں پی۔ اے۔ سی۔ کی ایک بٹالین کی جنگل میں وارفیئر ٹریننگ ہوئی۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ ان کی سات آٹھ جیپیں روزانہ رات میں شکار کے لیے جنگل جاتی تھیں۔ اور جب ان کی واپسی ہوتی تھی تو کم و بیش ہر جیپ پر تین چار جانور ضرور لدے ہوتے تھے۔ اس طرح جتنے جانور ان لوگوں نے ایک ماہ میں شکار کرے، اس علاقے کے تمام شکاری یکجا ہو کر ایک برس میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جرڈن (Jerdon) کے بموجب ۱۸۷۶ء میں پنجاب کے میدانوں میں جو آبادی کے لحاظ سے گنجان علاقہ تھا، دس دس ہزار ہرنوں کے غول دیکھے جاسکتے تھے۔ یہ غول ایک شہر سے دوسرے شہر، یا ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں آتے جاتے دکھائی پڑتے تھے۔

اگلے وقتوں کے لوگ شیر کے متعلق بہت ہی کم معلومات رکھتے تھے۔ شیر کے تئیں کم علمی کے باعث وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شیر ظالم اور خونخوار جانور ہے اور یہ غلط فہمی سینہ بہ سینہ، پشت در پشت منتقل ہوتی گئی۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی زیادہ تر لوگ شیر کو ظالم اور خونخوار سمجھتے ہیں۔ شیر کی دوسری صفات کے متعلق ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس مضمون کے ذریعہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ شیر کی غذا گوشت ہے۔ حالانکہ نہایت مجبوری کے عالم میں وہ دوسری چیزیں بھی کھا لیتا ہے۔ اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے ہی وہ جانوروں کا شکار کرتا ہے۔ کبھی کبھی کسی خوف یا بھوک سے مغلوب ہو کر وہ انسان پر بھی حملہ کر بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ تمام کشت و خون وہ صرف اپنی بھوک مٹانے کے لیے ہی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیر کو اس کی خصلت کی بنا پر ظالم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

قدرت نے شیر کو سخت جبڑوں میں پیوست، مضبوط داڑھوں اور سامنے کے چار بڑے بڑے نوکیلے دانتوں اور زبردست پکڑ رکھنے والے خمدار ناخونوں سے نوازا ہے۔ اس کے برعکس تمام دوسری نسل کے چوپاؤں کے منہ اور دانتوں کی بناوٹ اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شیر اور دوسری نسل کے چوپاؤں کی غذا قطعی طور پر الگ الگ یعنی مختلف ہوگی۔ اس طرح شیر کے پیٹ میں آنت کی لمبائی صرف سات فٹ ہوتی ہے۔ جب کہ چرندوں کی آنت کی لمبائی اکیس فٹ ہوتی ہے۔ شیر گوشت کھاتا ہے اور چرند گھاس پات۔ گوشت کی تاثیر یہ ہے کہ بہ نسبت ہری نباتات کے یہ جلد ہضم ہو کر جزو بدن ہوتا ہے اور گھاس و سبزیاں وغیرہ ہضم ہونے میں کسی قدر زیادہ وقت لیتی ہیں۔ غالبًا یہی سبب ہے کہ قدرت نے شیر کو دیگر جانوروں کی بہ نسبت چھوٹی آنتیں عطا کی ہیں، تاکہ اس کی غذا جلد ہضم ہو کر جزو بدن ہو، اور فضلہ کا اخراج ہو۔ انسان کی آنت کی لمبائی چودہ

فٹ ہوتی ہے کیونکہ اس کی غذا میں سبزی اور گوشت، دونوں شامل رہتے ہیں۔

عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیر اپنے شکار کو پیٹ بھر کر کھانے کے بعد پھر کسی بھی کھانے والی چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ چاہے کتنے ہی مرغوب ترین جانور اس کے چاروں طرف گھوم پھر رہے ہوں۔ شیر کی اوّلین کوشش یہ ہوتی ہے کہ پیٹ بھرنے کے بعد اُسے سکون سے کوئی جگہ آرام کرنے کو مل جائے۔ اس لیے وہ خاموشی سے چلتا ہوا اپنے تجویز کردہ مقام پر جا کر لیٹ جاتا ہے اور سونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات آج تک دیکھنے میں نہیں آئی کہ شیر نے محض تفننِ طبع کی خاطر ایک وقت میں کئی کئی جانوروں کو ہلاک کیا ہو، ما سوائے چند مخصوص حالات کے۔ مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کے لیے میرے ذاتی تجربے پر مبنی درج ذیل واقعہ سنانا نہایت مناسب ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک پہاڑی بلاک میں شیر کے شکار کے واسطے ایک میل کے رقبہ میں چار پڈّے ایک ساتھ باندھنا پڑے۔ اسی رات یہ چاروں پڈّے مارے گئے۔ پارٹی میں اس بات پر سخت بحث و مباحثہ ہوا کہ آیا یہ کام ایک شیر کا ہے یا چار الگ الگ شیروں کا۔ کیونکہ یہ چاروں پڈّے ایک میل کے اندر ایک وادی میں باندھے گئے تھے، اس وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کام ایک شیر کا ہے جو دریا پار کر کے سڑک پر آیا اور جو پڈّا اس کو دکھائی دیا، اس نے مار دیا۔ لیکن میری، اور کچھ دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ یہ کام ایک شیر کا نہیں ہے بلکہ چار شیروں کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ چاروں پڈّے ایک سڑک پر ضرور باندھے گئے تھے لیکن تھے کسی نہ کسی گدیلے کے نکاس پر۔ دیگر لوگوں کے اندازے میں غلط فہمی صرف اتنی تھی کہ وہ شیر کے مزاج سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ دوسری غلط فہمی یہ کہ شیر پہاڑوں میں اوپر نیچے گدیلوں کے ذریعہ آتے جاتے ہیں۔ پھر سڑک پر ہو کر دریا پار کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ اگلے ہی روز اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ شیر چار تھے۔

ہُوا یہ کہ جب ہم نے چاروں پڈّوں کو مرا ہوا دیکھا تو سوال پیدا ہوا کہ کس گدیلے میں مچان باندھا جائے۔ اس شکار میں ہم لوگوں کے ساتھ صرف دو ہی مچان تھی۔ کافی بحث و تکرار کے بعد مچان کی جگہ کا تعین ہوا۔ ہم لوگ اپنے بنگلے پر واپس آئے جو اس جگہ سے پانچ چھ میل

دور تھا۔ وہاں پر پہنچ کر مچان پر بیٹھنے والوں نے اپنی اپنی ہیوی رائفلوں کا معائنہ کیا۔ رائفلوں میں ضروری صفائی وغیرہ کرنے کے بعد کارتوسوں کی جانچ شروع ہوئی۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ کیوں نہ کارتوس ٹسٹ کر لیے جائیں۔ لہٰذا فاصلہ کا تعین کر کے ٹارگٹ بنا یا گیا۔ جب فائر کئے گئے تو دونوں رائفلوں کے کارتوس ہینگ فائر کر گئے۔ دوسرے کارتوس لگائے گئے وہ بھی ہینگ فائر کر گئے۔ تیسرے کارتوسوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اب صرف تین سو پچپن بور کی ایک رائفل بچی تھی۔ اسے لے کر کوئی اکیلا مچان پر بیٹھنے کو تیار نہیں ہوا۔ کیونکہ مچان نسبتاً کچھ نیچے اور غیر محفوظ تھے۔

اب شامت آئی اُن حضرات کی جن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے باقی ماندہ لوگ اپنی بڑے بور کی رائفلیں لے کر نہیں آئے تھے۔ ان حضرات کی رائے تھی کہ پہاڑی بلاک میں زیادہ بندوقوں کا لے جانا بیکار تھا۔

اس واقعہ سے چونکہ پارٹی کے ہر فرد کی طبیعت مکدّر ہوگئی تھی، لہٰذا اس شام کسی نے بھی اپنے مسکن سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اگلے ہی صبح پھر چاق چوبند ہو کر پرندوں کے شکار کے واسطے ہم لوگ بذریعہ جیپ اُسی سڑک پر رواں دواں تھے۔ مناسب کی رائے ہوئی کہ لگے ہاتھوں پڈّوں اور گدیلوں کی خبر بھی لے لی جائے۔ مخصوص مقام پر پہنچے تو وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ تین پڈّے تو پورے کے پورے کھائے جا چکے تھے، البتہ چوتھے پڈّے پر شیروں کا ایک جوڑا لذت کام و دہن حاصل کرنے میں مصروف تھا۔ ہم لوگوں کی ناوقت مداخلت پر دونوں نے سخت برہمی کا مظاہرہ کیا اور اپنی غصیلی دھمکیوں سے مجبور کیا کہ اُلٹے قدموں واپسی اختیار کریں۔ جب یہ منظر اور پڈّوں کی کیفیت ہم نے دیکھی، اس سے یقین کامل ہو گیا کہ کم از کم تین چار شیر یقینی طور پر رہے ہوں گے، کیونکہ صرف ایک جوڑے کا پیٹ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا کہ وہ چار پڈّوں کو بیک وقت ہضم کر جائیں۔ ہماری بندوقیں اگر وقت پر دھوکا نہ دیتیں تو ہم اس کا ٹھوس ثبوت بھی پیش کر سکتے تھے۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی ایک ہی شیر نے ایک سے زیادہ جانوروں کو جان سے مار دیا ہو۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے اور وہ بھی مخصوص حالات میں جیسے:

۱:۔ کسی بیماری یا زخم ہو جانے سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

۲:۔ شیر کے اختلاط کا موسم شباب پر ہو۔ اس کیفیت سے مغلوب ہو کر بھی ایک سے زیادہ جانور مار دیتا ہے۔

اس ضمن میں مشہور شکاری قطب یار جنگ رقمطراز ہیں:

''کورٹنگ کے زمانے میں جب کئی شیر ایک شیرنی کے لیے آپس میں لڑ گئے ہوں۔ نتیجہ میں جو ایک بہادر بچا ہو، وہ اکثر شیرنی پر اپنی طاقت کا رُعب ڈالنے کے لیے کئی جانوروں کا بہ یک وقت شکار کرتا ہے تا کہ شیرنی کی نظروں میں سُرخرو ہو سکے۔''

قطب یار جنگ نے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''شکار'' میں ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک فارسٹ گارڈ اپنی بیٹ سے واپس آرہا تھا۔ اس نے دیکھا، سامنے سے دو شیر چلے آرہے ہیں۔ ان شیروں کی نظر جب اس گارڈ پر پڑی تو اس میں سے ایک شیر دہاڑتا ہوا فارسٹ گارڈ پر جھپٹا۔ گارڈ بھاگ کھڑا ہوا۔ شیر نے اس کا پیچھا کیا۔ جب وہ گارڈ کے قریب آ گیا تو گارڈ نے اپنے سر سے بندھا ہوا صافہ اُتار کر پھینک دیا۔ شیر اس صافے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور اپنے دانتوں اور پنجوں سے چیر پھاڑ کر اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ گارڈ کے لیے اتنا وقفہ کافی تھا۔ وہ بھاگ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ شیر کی اس پر جب دوبارہ نظر پڑی تو وہ پھر جھپٹا، لیکن تب تک گارڈ شیر کی پہنچ سے باہر ہو چکا تھا۔ شیر درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور شور مچانے لگا، لیکن گارڈ بھی جہاندیدہ تھا۔ وہ بالکل خائف نہیں ہوا۔ کچھ دیر درخت کے نیچے بیٹھ کر شیر جنگل میں غائب ہو گیا۔ گارڈ نے جیسے ہی نیچے اُترنے کی کوشش کی، ویسے ہی شیر آڑ سے نکل آیا اور پھر اس پر غرانے لگا۔ شام ہونے تک شیر کئی مرتبہ پیڑ تک آیا اور چلا گیا۔ رات میں بھی اس نے یہ عمل جاری رکھا اور اس درخت کے نیچے وقتاً فوقتاً چکر لگاتا رہا۔ غریب فارسٹ گارڈ تمام رات درخت پر ٹنگا سردی میں ٹھٹھرتا رہا۔ دن چڑھنے پر اُسے کچھ آدمی دور جاتے دکھائی دیے تو اس نے انہیں آوازیں دے کر متوجہ کیا اور اس طرح شیر سے اپنی جان بچائی۔''

اس واقعہ میں شیر ایک شیرنی کے ساتھ تھا۔ اور زمانہ بھی کورٹ شپ کا۔ ایسی حالت

میں شیر آدمی کی مداخلت بالکل برداشت نہیں کرتا۔ اس کا یہ انداز ایک مخصوص کیفیت اور جذبے کے غلبہ کے تحت تھا، جس کے لیے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد کچھا میں، جو نینی تال کی ایک تحصیل ہے، بلکہ ترائی بھابھر کے پورے علاقہ میں بڑے بڑے افسروں اور رئیسوں نے سرکاری زمین الاٹ کرا کر امریکن طرز پر بطور فیشن کھیتی باڑی شروع کر دی۔ یہ پورا علاقہ جسے بھابھر اسٹیٹ کہتے ہیں، شاہ انگلستان کے جیب خرچ کے لیے وقف تھا۔ اس کا قانون بھی باقی ملکی قوانین سے بالکل مختلف تھا۔

اس ترائی میں بڑے گنجان جنگل تھے جو کبھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ بارش بہت کثرت سے ہوتی تھی جس کی وجہ سے دور دور تک اونچی گھاس کے جنگل اُگ آئے تھے۔ گھاس کے اس جنگل میں انڈر گروتھ، یعنی جھاڑ جھنکاڑ بھی بہت تھے۔ کیونکہ اس علاقہ کے جنگلات محکمۂ جنگلات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اس میں سڑکیں، راستے اور پل بالکل نہیں تھے۔ سردی کے موسم میں جب گاؤں کے لوگ لکڑی اور گھاس کے لیے اپنی بیل گاڑیاں ان جنگلوں میں لے جاتے تو کچھ لیکیں اور راستے ضرور بن جاتے تھے جن کو مقامی شکاری بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اس علاقے کے کنارے کنارے میواتیوں کی بستیاں تھیں۔ پانی کی افراط، ہاتھی گھاس اور گھنے جنگلوں کی وجہ سے یہ پورا خطہ ہر طرح کے شکار سے بھرا پڑا تھا۔ تیتر سے لے کر ہاتھی تک افراط سے پائے جاتے تھے۔ شیروں کا یہ عالم تھا کہ ہر فارم پر گنے کے کھیت میں ایک دو شیر ضرور رہتے تھے۔ جو فارموں کے ناموں سے منسوب تھے۔ جیسے امنا گنج کا شیر... جو اپنی جسامت اور خشونت کے لیے مشہور تھا اور راجستھان فارم کا شیر جو مویشی چُرانے میں اپنی مثال آپ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ آج کا کچھا اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں جانور اب نام کو بھی نہیں ملتا۔ اگر اتفاقاً کہیں دکھائی دے جاتا ہے تو پورے کچھا میں غل مچ جاتا ہے۔

یہ ذکر ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء کا ہے۔ جون کا مہینہ تھا اور غالباً عید قرباں کا دن۔ کچھا کا ایک فارم جو تقریباً ویران تھا، ہم لوگوں کی جائے قیام بنا ہوا تھا۔ اس فارم پر صرف دو، تین گھاس کے چھالے بنے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جس میں فارم کے منیجر

رہتے تھے۔ دو جھالے نسبتاً بڑے تھے۔ ایک میں فارم کا چوکیدار، جو چودھری کہلاتا تھا، رہتا تھا۔ اس میں ٹریکٹروں کا ٹوٹا پھوٹا سامان، فالتو پُرزے اور دوسرا کاٹ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اس سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر اس کے بالکل سامنے دوسرا جھالا تھا جس میں ٹریکٹر ڈرائیور اپنی نوازئیدہ بچی اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔

دن کے دس یا گیارہ بجے کا وقت تھا، چودھری اپنے جھالے کے سامنے بیٹھا تھا۔ یکا یک اس نے دیکھا کہ ایک شیر گنّے کے کھیت سے نکل کر ڈرائیور کے جھالے کی طرف آیا اور کود کر جھالے پر بیٹھ گیا۔ چودھری نے آواز دے کر ڈرائیور کو ہوشیار کیا اور بتایا کہ اس کے جھالے پر ایک شیر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ ڈرائیور نے چودھری کی بات کو مذاق سمجھا۔ اسے خیال ہوا کہ کوئی بلا وغیرہ چھپّر پر آ کر بیٹھ گیا ہوگا جسے چودھری شیر بتا کر ڈرا رہا ہے۔ وہ اندر سے ایک لمبی لکڑی لیتا ہوا باہر نکلا۔ باہر آ کر اسے حالت کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ شیر کی نگاہ جیسے ہی ڈرائیور پر پڑی، اس نے اوپر سے ہی زقند بھری۔ ڈرائیور چونکہ کسی قدر آگے بڑھ چکا تھا، اس لیے شیر جھالے کے دروازے کے باہر کائی جمی ہونے کی وجہ سے دور تک پھسلتا چلا گیا۔ اس اثناء میں ڈرائیور دس پانچ قدم اور آگے بھاگ گیا۔ شیر نے سنبھالا لے کر دوسری جست لگائی اور ڈرائیور کے سر کو اپنے جبڑوں کے شکنجہ میں کس لیا۔ جبڑا بند کرتے ہی شیر کے چاروں دانت ڈرائیور کے سر میں چٹاخ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گھس گئے۔ ڈرائیور بے جان ہو کر گر گیا۔ چودھری اپنے جھالے سے یہ تمام منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو کر ایک لٹھے کی آڑ میں لیٹ کر سینے کے بل رینگتا ہوا کچھ دور گیا۔ پھر اُٹھ کر درختوں کے تنوں کی اُوٹ لیتا ہوا ایک ڈیڑھ فرلانگ دُور گاؤں کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے گاؤں والوں کو جمع کر کے سارا ماجرا سنایا اور ڈرائیور کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

اس گاؤں میں ایک پرانا شکاری صندل سنگھ نام کا رہا کرتا تھا۔ کئی شیروں کا شکار کر چکا تھا۔ نہایت بدشکل انسان تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے اور ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے۔ گہرا، کالا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی کیچڑ سے بھری آنکھیں۔ ایک پیر کی ایڑی چونکہ زمین پر نہیں آتی تھی، اس لیے لنگڑا کر چلتا تھا۔ ہر وقت چرس سے بھری چلم کے دُم لگا تا رہتا تھا۔ یہ

تمام خامیاں ہونے کے باوجود جنگل کے چپہ چپہ سے واقفیت رکھتا تھا۔ اسے خوب معلوم رہتا تھا کہ کون سے جانور کا مسکن کہاں ہے۔ کوئی بھی شکاری صندل سنگھ کی قیادت کے بغیر شکار نہیں کھیل سکتا تھا۔

چونکہ صندل سنگھ اس وقت بخار میں بُری طرح تپ رہا تھا، اس لیے اسے وہیں چھوڑ کر گاؤں کا ہر فرد جائے وقوعہ کی جانب بھاگا۔ یہ غول بیابانی شور مچاتا، چیختا چلاتا، جیسے ہی فارم کے قریب آیا، شیر لاش کو چھوڑ کر اُن پر جھپٹ پڑا۔ کچھ دُور دوڑانے کے بعد وہ پھر واپس لاش کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں گاؤں میں کسی کے پاس بندوق وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے یہ لوگ قریب کے ہی دوسرے فارم پر بھاگتے ہوئے پہنچے۔ اس فارم پر مزدوروں کے علاوہ ایک منیجر اور ایک منشی بھی رہتے تھے۔ ان لوگوں نے جب واقعہ سنا تو فوراً کچھا تھانے کی راہ لی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ چھودھری کو ایک بندوق اور چند کارتوس دے کر جائے وقوعہ پر پہنچنے کی ہدایت کی۔

لاٹھیوں، ڈنڈوں اور بھالوں سے لیس گاؤں والے چودھری کی معیت میں پھر اسی فارم کی طرف روانہ ہوئے جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ حادثے والی جگہ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر چودھری نے چند ہوائی فائر کئے جس سے خوفزدہ ہو کر شیر لاش کے قریب سے ہٹ کر گنّے کے کھیت میں جا کر چھپ گیا۔

موقع غنیمت جانتے ہوئے لوگوں نے جلدی سے ڈرائیور کی بیوی اور بچی کو جھالے سے نکالا اور ڈرائیور کی لاش کو ایک چار پائی پر رکھ کر تیسرے فارم کی راہ پکڑی جو وہاں سے تقریباً میل، ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا شیر بھی ان لوگوں کا تعاقب کچھ فاصلہ دے کر کرتا رہا اور اس فارم پر پہنچ گیا جہاں یہ سب لاش لے کر گئے تھے۔ اس فارم سے تھوڑی ہی دوری پر سات، آٹھ موٹی تازی بھینسیں چر رہی تھیں۔ شیر کی نگاہ جیسے ہی ان پر پڑی، وہ اُن پر جھپٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ بھینسوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس فارم کی مالکن ایک عورت تھی، جو میم صاحب کہلاتی تھی۔ گاؤں والوں نے دوڑ کر انہیں اس واقعہ کی اطلاع دی۔

میم صاحب غصہ سے بھنبھناتی ڈرائیور اور ایک نوکر کو، جس کے پاس ایک بارہ بور کی

بندوق تھی، ساتھ لے کر بذریعہ ٹریکٹر اس جگہ پہنچیں جہاں شیر نے بھینسوں کو مارا تھا۔ شیر نے جیسے ہی ٹریکٹر کو دیکھا، وہ اس پر بھی جھپٹ پڑا۔ ڈرائیور نے اسے ٹریکٹر کی جانب جھپٹتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ غالباً یہ شیر ڈرائیوروں کا دشمن ہے۔ جلدی سے ٹریکٹر روک کر اسے بند کیا اور کود کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے بھاگتا دیکھ کر نوکر، جس کے پاس بندوق تھی، اس نے بھی بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اب ٹریکٹر پر صرف میم صاحب ہی رہ گئیں۔ میم صاحب بہت ہمت والی ایک بہادر خاتون تھیں۔ چونکہ بذاتِ خود کئی شیروں کا شکار کر چکی تھیں، اس لیے شیر کے مزاج سے پوری طرح واقف تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شیر ٹریکٹر کے بالکل قریب آپہنچا ہے، تو انہوں نے بھی ٹریکٹر پر سے کود کر اپنی جان بچانے میں ہی عافیت جانی۔ لہٰذا وہ کود کر ایک طرف بھاگیں۔ شیر نے شکار کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر ایک زقند بھر کر انہیں اپنے پنجوں اور جبڑوں میں کسنا چاہا، لیکن میم صاحب کی زبردست حاضر دماغی اور قوت فیصلہ نے ان کی جان بچا لی۔ سیدھے بھاگتے بھاگتے وہ ایک دم مڑیں اور پھر بھاگنے لگیں۔ چونکہ وہ یکلخت مُڑی تھیں، لہٰذا جھونک میں یہ نہیں دیکھ سکیں کہ آگے گڑھا بھی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس میں جا گریں۔ گڑھے میں کافی پانی بھرا ہوا تھا۔ اچانک گڑھے میں گرنے کی وجہ سے ان کے ٹخنے میں سخت موچ آگئی اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئیں۔ اس عمل سے البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کی جان بچ گئی۔ چونکہ میم صاحب اپنے راستہ سے اچانک مڑ گئی تھیں، لہٰذا شیر اپنی جھونک اور زور میں آگے نکلتا چلا گیا۔ اس درمیان میم صاحب گڑھے میں گر کر شیر کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ شیر سنبھل کر جب دوبارہ مڑا اور اس نے انہیں ندارد پایا تو وہ شدید غصہ کی حالت میں ٹریکٹر پر حملہ آور ہوا اور اس کے پہیے کو منہ میں لے کر جھنجھوڑنے لگا۔ نتیجتاً ٹائر ایک زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹا اور چیتھڑے چیتھڑے ہوگیا۔ زبردست دھماکے کے باعث شیر بھی دور جا گرا۔ اس نے پھر سنبھل کر جست لگائی۔ اس مرتبہ وہ ٹریکٹر کے بونٹ پر گرا۔ شیر نے اوپر اٹھنے کے لیے اپنے پنجے سے اسٹیرنگ کو پکڑ کر زور لگایا تو وہ اپنی جگہ سے ٹوٹ، شیر کو لیتا ہوا زمین پر آگیا۔ غصہ میں بھرا ہوا شیر جلدی سے زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک ٹریکٹر کو دیکھ کر غرّاتا رہا۔ پھر ایک طرف کو چل دیا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ اس اثنا میں اس واقعہ کی شہرت پورے کچھا اور ہر فارم تک ہو گئی تھی۔ اس فارم سے کچھ فاصلے پر مکئی کا ایک کھیت تھا۔ اس کھیت کو چار، پانچ سکھ، جو آپس میں سگے بھائی تھے، رکھایا کرتے تھے۔ انہیں بھی اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ ان لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ آج سب لوگ اسی کھیت میں رہیں گے اور دور والے دوسرے کھیتوں میں نہیں جائیں گے۔ نیز حفظ ماتقدم کے طور پر رات بھر آگ جلائے رکھیں گے تا کہ شیر قریب نہ آئے۔ ابھی ان کی میٹنگ ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہی شیر مکئی کے کھیت سے نکلا اور ان پر حملہ آور ہوا۔ اور آناً فاناً تین چار کو پھاڑ ڈالا۔ ایک بھائی نے جلدی سے اُچک کر چھپر میں لگی بلّی کو پکڑ لیا اور اس سے چپٹ گیا۔ اور اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ شیر ایک دوسرے کھیت پر پہنچا جہاں ایک مچان پر تنہا آدمی بیٹھا چلا چلا کر چڑیوں کو اُڑا رہا تھا۔ شیر نے مچان کو ہلا ہلا کر گرا دیا اور اس پر بیٹھے ہوئے شخص کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ یہ کارروائی کرنے کے بعد وہ وہاں سے دو میل دور چوتھے فارم پر، جس کو کلکتہ فارم کہتے تھے، پہنچا۔ اس فارم کا مالک ایک مارواڑی سیٹھ تھا۔

اس فارم پر پہنچنے کے بعد شیر نے اس میں بنے ایک چھپّر کا چکر لگایا اور اُچھل کر اس کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور تمام رات وہیں گزار کر دن نکلنے کے بعد وہاں سے فرار ہو گیا۔ سیٹھ صاحب یہ تمام کارروائی کھڑکیوں میں لگے شیشوں سے دیکھتے رہے۔ شیر کے وہاں سے چلے جانے کے بعد، انہیں یقین نہیں آیا کہ شیر وہاں سے جا چکا ہے، لہٰذا وہ کمرے بند کیے بیٹھے رہے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد جب متعدد لوگوں نے آ کر انہیں یقین دلایا کہ شیر واقعی جا چکا ہے، تب سیٹھ صاحب مع مختصر سامان کے باہر نکلے اور اسٹیشن کی راہ پکڑ، عازم کلکتہ ہوئے۔ اس روز سے آج تک ان کو کسی نے فارم پر نہیں دیکھا۔

حیرت و تعجب کی بات تھی کہ اس شیر نے ایک ہی دن میں کئی انسانوں اور جانوروں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا لیکن کھایا کسی ایک کو بھی نہیں۔ یہ بات اس طرح پتہ چلی کہ اس واقعہ کے تیسرے روز اس شیر کو مار دیا گیا۔ جب اس کا پیٹ چاک کر کے دیکھا گیا، تو اس میں غذا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یعنی اتنی جانیں لینے کے بعد بھی وہ بھوکا تھا اور وہ بھی متواتر تین دن سے۔

اس شیر کے سر پر ایک زخم تھا جو کافی پُرانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی دھاردار چیز کی چوٹ کا نشان تھا۔ چونکہ زخم کافی پُرانا تھا،اس لیے اس میں کیڑے پڑ گئے تھے۔کافی جستجو کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ یہ شیر ایک ڈیم پر رہتا تھا۔اس ڈیم پر چند چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جن پر چڑھ کر یہ بیٹھ جاتا تھا۔ ۔اپنی اسی عادت کے تحت وہ پہلے فارم میں بنی جھونپڑی کی چھت پر چڑھا، پھر کلکتہ فارم کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔اس کی ان حرکتوں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ اونچی جگہ پر بیٹھنے کا عادی تھا۔ اس کے سر پر لگے زخم کی بابت تحقیقات کرنے پر جو واقعہ سامنے آیا وہ کچھ اس طرح تھا۔۔۔۔۔ایک لڑکا اپنی بکریاں ڈیم پر چرا رہا تھا کہ اچانک یہی شیر جو غالبًا بھوک سے بدحال تھا، بکریوں کے ریوڑ پر حملہ کر ایک بکری کو اٹھالے گیا۔ چرواہا نزدیک ہی تھا۔اس نے جب شیر کو بکری لے جاتے دیکھا تو شور مچانے لگا۔شیر پر اس شور کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے بکری کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی کلہاڑی تھی۔غم وغصہ سے مغلوب ہو کر لڑکے نے وہ کلہاڑی پوری طاقت سے شیر کے سر پر دے ماری،جس کا پورا پھل شیر کے سر میں پیوست ہو گیا۔کلہاڑی لڑکے کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔شیر بھاگ کر جھاڑیوں میں جن کی وہاں پر بہتات تھی، غائب ہو گیا۔

برسات کا موسم تھا اور آب و ہوا گرم اور مرطوب۔اس کے باعث شیر کے سر کا زخم خراب ہو کر سڑ گیا۔اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔زخم اور اس میں پڑے کیڑوں کے کاٹنے سے ہونے والی تکلیف نے شیر نیم پاگل سا ہو گیا۔بھوک اور زخم کی تکلیفوں سے تنگ آ کر شیر نے یہ تمام خون خرابہ کر ڈالا۔

نورالحسن صاحب اسسٹنٹ کمانڈنٹ ،جو حکومت کی جانب سے ایسے شیروں کا شکار کرنے کے لیے نامزد کیئے گئے تھے،انہوں نے ہی بمشکل تمام اس شیر کا شکار کیا۔

ہُوا یہ کہ جب یہ شیر کلکتہ فارم سے چلا گیا تو بجائے ڈیم پر جانے کے جنگل کی طرف روانہ ہوا اور تین دن مستقل اس کا قیام وہیں رہا۔نورالحسن صاحب نے پہلے کچھ سپاہیوں کو درختوں پر بٹھا دیا اور خود ایک مناسب جگہ گھاس صاف کرا کر اور پڈا بندھوا کر مچان پر بیٹھ گئے۔اس روز شیر نے سپاہیوں کو مچان پر بیٹھے دیکھ لیا اور پڈے پر نہیں آیا۔ بلکہ پڈے کے

آس پاس آوازیں دیتا رہا۔ دوسرے روز انہوں نے جوانوں کو درختوں پر نہیں بٹھایا، بلکہ خود اکیلے اس مچان پر بیٹھ گئے ۔ شیر چونکہ بہت بھوکا تھا، اس وجہ سے دن غروب ہونے سے پہلے ہی پڈّے پر آگیا۔ لیکن نورالحسن صاحب کے نیچے کی طرف سے کمانڈنٹ صاحب اس کو بالکل نہ دیکھ سکے اور نہ ہی اس کے آنے کی آہٹ انہوں نے محسوس کی۔ یہ شیر خلاف اُمید دوسری سمت سے آکر ان کی مچان کے بالکل نیچے بیٹھ گیا ۔ نہ معلوم کتنی دیر یہ ان کے مچان کے نیچے بیٹھا رہا، انکو اس کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً ان کی نظر جو نیچے گئی، تب انہوں نے دیکھا کہ شیر کتے کی طرح ان کے مچان کے ٹھیک نیچے بیٹھا ہے۔

شیر ایسی پوزیشن میں تھا کہ ان کے بغیر ہلے اس پر فائر نہیں ہو سکتا تھا ۔ اور ہلنے کی صورت میں شیر کا خبردار ہونا لازمی تھا۔ پڈّے کو تکنے کے بعد ایک طرف چل دیا۔ اور اتنا موقع نہیں دیا کہ اس پر فائر کیا جائے۔ نورالحسن صاحب رات بھر مچان پر بیٹھے تسبیح پڑھتے رہے، اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ کیونکہ یہ ان کی زندگی میں پہلا شیر تھا جس نے ان کو اتنا زچ کیا تھا۔

صبح کو کمانڈنٹ صاحب ایک پٹے ہوئے کھلاڑی کی طرح منہ لٹکائے چلے آئے اور راستہ بھر قسمیں کھاتے رہے کہ آج اس کو ضرور ماروں گا، اور اس کو پڈا ابھی نہیں کھانے دوں گا۔ ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد وہ پھر جنگل لوٹ گئے تا کہ دوسرا مچان اور پڈا باندھنے کی جگہ کا تعین کر سکیں اور اس کے آنے کے تمام متوقع راستے بھی معلوم کرلیں ۔ دوپہر کو ان کی واپسی ہوئی کھانا کھا کر وہ فوراً لیٹ گئے کیونکہ آج رات ان کو مچان پر گزارنی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب وہ پھر جنگل روانہ ہو گئے ۔ اب کی انہوں نے ایک نئی ترکیب کی اور وہ یہ کہ جس درخت پر مچان بندھا تھا، اس سے دو تین درخت چھوڑ کر ایک ڈھاک کا درخت تھا، جو بہت گھنا تھا۔ وہ اس کے ایک دُشاخے پر بیٹھ گئے اور مچان کو خالی چھوڑ دیا۔ پڈا پندرہ سولہ گز کی دوری پر اپنے بائیں ہاتھ کو بندھوا دیا۔ اب کی مرتبہ پڈّا جہاں بندھا تھا، وہاں کی گھاس وغیرہ بھی نہیں کٹوائی ۔ اس جگہ قدرتی طور پر گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ زیادہ نہیں تھے۔

اب اگر شیر ان کی بائیں طرف سے آتا یا سامنے سے آتا تو اس کو بہت پہلے دیکھ سکتے

تھے۔اس کے علاوہ پڈّے پر پہنچنے کا دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔اس صورت میں یہ شیر پر حاوی ہو سکتے تھے۔اور ہُوا بھی یہی۔شیر ان کے بالکل سامنے سے آیا اور پڈّے سے کافی دور بڑی گھاس میں داخل ہو گیا اور تقریباً بیس منٹ وہیں رُکا رہا۔اور اس کے بعد غراتا ہوا بہت تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔اور کافی دور جانے کے بعد اُونچی آواز سے بولنے لگا۔اور اس جگہ کافی دیر تک بولتا رہا۔نورالحسن صاحب کو شیر کی اس حرکت سے کامل یقین ہو گیا کہ شیر نے مچان کو دیکھ لیا ہے اور پڈّے کو بھی۔اور وہ سمجھ گیا ہے کہ اس کو پھانسنے کے لیے یہ جال پھیلایا گیا ہے۔

کمانڈنٹ صاحب ایک تجربہ کار شکاری تھے اور بڑے صبر اور ضبط کے آدمی تھے۔ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شیر نے مچان دیکھا تو ہے، لیکن خالی دیکھا ہے۔ممکن ہے وہ دوبارہ پڈّے پر آئے اور ان کی چال کامیاب ہو۔ابھی کافی اُجالا پھیلا ہوا تھا۔اور اِمکان تھا کہ آدھے گھنٹہ تک اور رہے گا۔اور بغیر ٹارچ کی روشنی کے فائر ہو سکے گا۔لہٰذا یہ بالکل خاموش بغیر کسی جنبش کے اسی درخت پر ٹکے رہے۔کیونکہ ان کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ شیر ان کو نہیں دیکھ سکتا اور تین دن کا بھوکا ہے۔یہ پڈّے کو مارے،گا ضرور اور ہُوا بھی یہی۔شیر ان کے پیچھے سے آیا۔اور بولتا ہوا سیدھا پڈّے پر آیا۔پڈّے کے بہت قریب پہنچنے کے بعد اس نے ایک زقند بھری۔حسن صاحب نے اپنی ۴۷۰ بور کی ڈبل بیرل سے شیر پر فائر کیا۔وہ شیر کو درخت سے ذرا دور غزاتے وقت ہی اپنی رائفل کو کندھے سے لگا چکے تھے۔ ان کی رائفل آواز کے ساتھ شیر کا پیچھا کر رہی تھی، جیسے ہی شیر اُچھلا،ان کا فائر ہوا۔ان کی ہیوی بور کی گولی لگنے سے شیر ہوا میں اُچھلا اور بالکل پڈّے کے پاؤں کے پاس مُردہ ہو کر گر گیا۔اس کے گرتے ہی دوسرا فائر ہوا۔شیر بالکل ساکت ہو گیا۔جب یہ درخت سے اُتر کے شیر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پڈّا شیر کو سونگھ رہا ہے۔

شیر ظالم اور خونخوار بالکل نہیں ہے۔اگر حالات سے مجبور ہو کر وہ کوئی بہیمانہ فعل کر گزرتا ہے تو مجبوری ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شیر آدمی سے ڈرتا ہے یا اس کا شرمیلا پن اس کو آدمی سے دور رکھتا ہے، تو غلط نہ ہو گا۔راجہ ضیاء اللہ خانصاحب اور ان کی پارٹی، جس میں، میں بھی شامل ہوں، اس کے علاوہ کاربٹ، اینڈرسن، قطب یار جنگ و حکیم الدین وغیرہ، اور نہ

معلوم کتنے اور شکاری ہیں جنہوں نے سیکڑوں شیر مارے ہیں اور زندگی بھر شیر کا شکار کر تے رہے ہیں، جس میں آدم خور بھی شامل ہیں۔ کیا ان حضرات کو کبھی ایک خفیف سا زخم بھی شیر نے پہنچایا ہے۔

زخمی شیر بہت خطرناک ہو تا ہے۔ کیا شکاری لوگ کبھی زخمی شیر ڈھونڈ نے نہیں گئے۔ کبھی ہاتھیوں سے کبھی پیدل۔ اور کاربٹ نے تو لال ٹیبا کی جھاڑیوں میں پیٹ کے بل رینگ کر شیر کا پیچھا کیا ہے۔ جو زخمی بھی تھا اور ہندستان کا سب سے بڑا شیر تھا۔ سو نے پر سُہاگہ یہ کہ آدم خور بھی تھا۔ لیکن وہ بھی کاربٹ کو نقصان نہ پہنچا سکا۔ شیر آدمی سے خائف ہو کر اس کے آگے آگے بھاگتا ہے۔

اینڈرسن اپنی کتاب The Tiger Roams (شیر دہاڑتا ہے) میں لکھتا ہے کہ وہ ایک رات ایک پہاڑی علاقہ میں آدم خور شیر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ لیکن وہ شیر اس کو نہیں مل رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک شیر کے بولنے کی آواز آئی۔ اینڈرسن کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے شیر کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے منہ سے بھی شیر کی آواز نکالنی شروع کر دی۔ اس آواز کو شیر نے سُن لیا اور آواز کی طرف آنے لگا۔ جب یہ شیر اینڈرسن کے قریب آ گیا تو وہ ایک درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ شیر نے اس کو دیکھ لیا اور سمجھ گیا کہ بولنے والا کوئی شیر نہیں، بلکہ آدمی تھا۔ اینڈرسن بھی اس شیر کو دیکھ کر جان گیا کہ یہ اس کا مطلوبہ شیر نہیں ہے، بلکہ کوئی دوسرا شیر ہے کیونکہ آدم خور شیر لنگڑا کر چلتا تھا اور اس شیر کے پیر میں لنگ نہیں تھی۔

اس شیر کے اتنے قریب آنے کی وجہ سے اینڈرسن کو خیال ہوا کہ شاید شیر اب اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس کے آگے وہ لکھتا ہے۔

''اگلے دو یا تین لمحوں میں، ہم دونوں کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ دراصل میری کوئی خواہش اس شیر پر گولی چلانے کی نہ تھی، بشرطیکہ وہ مجھ کو میری حالت پر بغیر نقصان پہنچائے چھوڑ دے۔ کیا وہ ایسا کرے گا۔ میں نے شیر کو بہت بُرا افروختہ کر دیا ہے، پہلے شیر کی بولی نقل کر کے پھر کھانس کر۔ شیر کو جب غصہ آ جاتا ہے تو وہ اکثر بے قابو ہو جاتا ہے۔ شیر کو

پچھلے پیروں پر بیٹھے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے شیر پر بندوق سیدھی کر کے اس کا نشانہ لے لیا اور لبلبی دبانے ہی والا تھا کہ شیر کے سلسلہ میں بہت سی باتوں میں سے ایک بات جس کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کی جا سکتی، رونما ہوئی۔ شیر ایک دم گھوما اور بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔"

اینڈرسن نے یہ واقعہ لکھ کر میری دلیل کو اور وزن دار کر دیا کہ شیر قریب آنے پر جب آدمی کو پہچان لیتا ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

شیر نے ایک کٹڑا مارا اور اس کا کچھ حصہ کھا لیا۔ دو بارہ پھر وہ باقی بچے حصہ کو کھانے کٹڑہ کی لاش پر آیا۔ اینڈرسن مچان پر بیٹھ گیا۔ اس نے شیر کو دوبارہ آتے پر گلدار کی جیسی آواز منہ سے پیدا کی شیر اس آواز کو سن کر جو درخت سے آرہی تھی، غصہ میں پاگل سا ہو گیا اور انتہائی غیظ و غضب سے دہاڑتا ہوا درخت کی طرف جھپٹا اور چھلانگ لگا کر درخت پر اس جگہ، جہاں سے آوازیں آرہی تھیں، پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ اینڈرسن کو نہیں دیکھ سکا تھا، کیونکہ وہ مچان میں چھپا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ لمحات اینڈرسن کے لیے سخت صبر آزما تھے۔ وہ لکھتا ہے :

''حالات بہت خراب ہو کر طول کھینچ گئے تھے۔ کسی بھی لمحے شیر کے تیز ناخون اور پنجکر میرے مچان کی سیٹ (اینڈرسن کینوس کا فولڈنگ مچان استعمال کرتا تھا۔ لکڑی اور بانس کے بنے ہوئے کھٹولے نما مچان، جو عام طور پر یوپی میں استعمال ہوتے ہیں، وہ انہیں استعمال نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ان بھاری مچانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ایک وقت طلب امر ہے) کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، اور میں درخت سے نیچے گرا ہوا پڑا ہونگا، اور شیر مجھ پر چھلانگ لگا کر مجھے دبوچ لے گا۔ مجھے دبوچنے کے بعد شاید وہ سمجھ سکے کہ بجائے گلدار کے، کسی آدمی کو دبوچے ہوئے ہے۔ شیر کی جھپٹ اور دبوچ کسی آدمی کا کام تمام کرنیکے لیے کافی ہوتی ہے۔"

اینڈرسن نے شیر کے غصہ اور اپنی نازک پوزیشن پر غور کر کے شو۔شو کی آواز نکالی "بدنصیب شیر کے لیے یہ آواز اس کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکہ ثابت ہوئی۔ اب وہ انسانی آواز کو پہچان چکا تھا اور جان گیا تھا کہ کون سی قسم کا گلدار درخت پر بیٹھا بول رہا ہے۔ فطرتاً یہ

شیر بہت بزدل تھا۔"

اسی قسم کے اوران سے بہت کچھ ملتے جلتے سیکڑوں واقعات مختلف لوگوں کے ساتھ پیش آچکے ہیں جن میں شیر کی ہمّت جواب دے گئی اور وہ انسان سے خائف ہو کر جنگل میں بھاگ کر چھپ گیا۔

لیکن برخلاف اس کے اگر شیر کسی وجہ سے گھبرا جائے یا اچانک انسان ، کسی شیر کے سامنے پہنچ جائے یا شیر سو رہا ہو اور آدمی اُس کے قریب پہنچ جائے اور شیر اس کی آہٹ نہ پا سکے تو گھبرا کر انسان پر حملہ کر سکتا ہے، یا ایسے حالات میں وہ صحیح طریقہ سے سمجھ ہی نہ سکے کہ اس کے سامنے انسان ہے یا کوئی اور چیز، تو دھوکے میں شیر ضرور حملہ آور ہو سکتا ہے۔

شیر چونکہ طاقت کا انجن ہے، اس وجہ سے اس کا معمولی حملہ بھی قاتل ہو سکتا ہے ، ایسے موقع پر اگر آدمی کا ہاتھ یا جسم کا کوئی حصہ مل گیا تو ایسی صورت میں شیر کا جھپٹ پڑنا ضروری ہے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ شیر نے جانور کو مار ڈالا۔ جانور مر گیا لیکن شیر نے اس کی دُم ضرور کاٹ کر پھینک دی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جانور کی دُم اس کے مرنے کے بعد بھی کچھ دیر تک ہلتی رہتی ہے اور کھاتے وقت اس کے منہ پر لگ جاتی ہے، اس وجہ سے وہ اُسے کاٹ ڈالتا ہے۔ راجہ صاحب بھی اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیر کی دم کاٹنے کی وجہ اس کا ہلنا نہیں ہے، بلکہ وہ جانور کو پچھلے حصہ سے کھانا شروع کرتا ہے اور صفائی پسند ہے، اس وجہ سے دُم کاٹ ڈالتا ہے۔

شیر اگر آدمی کو درخت پر چڑھا دیکھ لے تو سخت غصہ کا اظہار کرتا ہے اور اس درخت پر اس کی یورش کافی دیر تک اور بار بار ہوتی ہے۔

قطب یار جنگ اپنی کتاب 'شکار' میں لکھتے ہیں:

"انسان کو درخت پر دیکھ کر معلوم نہیں کیوں شیر گھبراتا ہے، یا تو اس کی اتنی عقل ہوتی ہے کہ اب یہ انسان میری زد سے باہر ہے یا بلندی کی وجہ سے انسان کو زیادہ خوفناک و برتر سمجھتا ہے، یا زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بقول سعدیؒ "ازاں کہ تو ترسد، بترس اے حکیم" یعنی

جوتم سے ڈرے اس سے تم کو بھی ڈرنا چاہئے۔

شاید شیر یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے دل میں کھوٹ ہے، جب ہی تو یہ اس طرح اپنی حفاظت کا انتظام کر رہا ہے۔ میں بھی قطب یار جنگ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ بہر حال اب یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ شیر یا تو خوف زدہ ہو کر یا گھبرا کر یا سمجھ نہ سکنے کے باعث انسان پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ورنہ برخلاف اس کے شیر آدمی کو دیکھ کر اس سے دور رہنے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے ساتھ اکثر اس قسم کے واقعات ہو چکے ہیں۔

ایک مرتبہ کھیا میں میرے ایک دوست اور ایک ملازم ایک دریا کے کنارے پہنچنے کی کوشش میں راستہ بھول گئے اور ہم کو کلک گھاس کے ایک بہت بڑے قطعے کو پار کرنا پڑا۔ اس گھاس کے آگے دریا تھا جس میں مرغابیاں بڑی کثرت سے پڑی ہوئی تھیں۔ ہم انہیں مارنا چاہتے تھے۔ میرے پاس بارہ بور بندوق تھی جس میں گھاس میں گھسنے سے پہلے میں نے گراب اور گولی کے کارتوس لگا لیے تھے۔ میرے دوست نے اپنی بندوق میں چھ نمبر کا چھرّوں والا کارتوس لگا رکھا تھا۔ ہم دونوں کے پیچھے ایک ملازم ایک ہیوی رائفل لیے ہوئے تھا۔ گھاس میں کچھ چھپ چھپا پانی بھی تھا۔ گھاس اتنی سوئی، گھنی اور سخت تھی کہ اس میں چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے گھاس کو ہاتھوں سے پھاڑنا پڑتا تھا، پھر کسی پیر کو پچھلے پیر پر سادھ کر کودنا ہوتا تھا، تب کہیں ایک فٹ زمین طے ہو پاتی تھی میں اس طرح سے اس گھاس میں پھدک رہا تھا کہ یکا یک میرے دوست نے جو بالکل میرے پیچھے چل رہے تھے، میری چمڑے کی جیکٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا اور شاید میں کچھ اوپر اُٹھ بھی گیا، یعنی ٹنگ سا گیا۔ ان کی اس جرأت پر ایسا غصہ آیا کہ بیان سے باہر۔ میں نے ایک جھٹکے سے سَر کو گھما کر ان کی طرف دیکھا تا کہ معلوم کر سکوں کہ اس خرابے میں انہیں اس مذاق کی کیا سوجھی۔ میں نے جیسے ہی اپنی چھوٹی چھوٹی خشمگیں آنکھوں سے انہیں گھورا، ویسے ہی انہوں نے آگے کو اشارہ کیا۔ ان کے اشارہ کرنے کی وجہ سے میں نے جب اپنے سے ایک فٹ آگے دیکھا تو مجھ کو شیر کی پونچھ کے کالے بالوں کا گچھا گھاس میں سرکتا ہوا دکھائی دیا۔ اب میری نظر اپنے پیروں کے نیچے گئی۔ تو دیکھتا ہوں کہ شیرنی کے پنجوں کے ساتھ ایک سال بھر کے شیرنی کے بچے کے پیروں کے نشانات بھی

صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ جن پر سے گھاس کی چھوٹی چھوٹی پتیاں آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہی ہیں اور ہلکا ہلکا پانی پیروں سے بنے گڑھوں میں بھرنا شروع ہو رہا ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر شیرنی کہیں یہ سمجھ لے وہ گھِر گئی ہے اور اس کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، یا گھبرا جاتی ہے تو حملہ ضرور کر دیتی ہے اور اس کے حملہ کرنے کی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ یا تو وہ مجھے مار دیتی یا میرے دوست کی گولی میری موت کا سبب بنتی اور اس قصہ کو لکھنے کے لیے آج میں موجود نہ ہوتا۔

اس سلسلہ میں جوئے ایڈمسن(Joy Adimson) کو بیان نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ اس کی زندگی شیروں اور گلداروں کے درمیان گزری ہے۔ جن کو اس نے پالا پوسا اور بڑا کیا ہے۔ ایلسا(Elsa) جو ایک ببر شیرنی تھی۔ پی پا(Pippa) جو ایک گلدار کی مادہ تھی اُس کے مشہور پالتو جانور تھے۔ اس نے شیروں اور گلداروں کے ساتھ رہ کر ان پر ریسرچ کی تھی - یہ ان کی عادت اور خصائل پر اتھارٹی ہے ، اپنی کتاب پپا کا چیلنج (Pippa's Challenge) میں لکھتی ہے کہ شیر نئے اور رنگ برنگ کے کپڑوں کو دیکھ کر بھڑک جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے۔"اکثر ایسے آدمی شیر نے مار ڈالے جن کو ان کپڑوں میں شیر سے ملنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے کبھی کسی آدمی کو پہنے نہیں دیکھے تھے۔"

تصدیق شدہ ریکارڈ کے بموجب شیروں کو کھانا دینے والے دو ملازم شیروں نے مار دیے جب کہ وہ ایسے کپڑوں کو پہن کر، جن سے شیر مانوس نہیں تھے ان کے پنجرے میں داخل ہوئے ،اس واقع نے مجھ کو اُلجھن میں ڈال دیا۔

شاید یہ بلی کی نسل کے جانور اپنے دوستوں کی پہچان اور شناخت کے سلسلہ میں ان کے اصلی روپ اور رکھ رکھاؤ پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتے ،مثلاً ان سے نکلنے والی بُو اور غیر مانوس کپڑوں کو دیکھ کر شیر کا مشتبہ ہو کر اس قدر بھڑک جانا۔ میری سمجھ میں اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ جانور کیونکہ اپنی کھال نہیں تبدیل کرتے اور انسان اپنے کپڑے بدلتا رہتا ہے، ممکن ہے وہ انسان کے کپڑوں کو اس کی کھال سمجھتے ہوں اور ان کا کوئی مخصوص لباس ان کے دماغ

میں محفوظ ہو جاتا ہو۔

مندرجہ بالا تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ شیر انسان سے دور بھاگتا ہے اور جب شیر دور بھاگتا ہو تو وہ انسان کے لیے ظالم اور خونخوار کس طرح ہو سکتا ہے۔ خونخوار تو اس کو اس وقت کہا جائے گا جب وہ انسان کو دیکھتے ہی اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا۔ شیر انسان سے بالکل نفرت نہیں کرتا۔ وہ تو ایک پالتو کتے کی طرح پالا بھی جا سکتا ہے۔ جوئے ایڈمسن نے افریقہ کے پارکوں میں شیر کو پال کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر انسان شیر سے محبت کرے تو وہ بھی محبت کا جواب محبت سے دینا جانتا ہے۔ ایلسا (Elsa) اور پی پا (Pippa) وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

قطب یار جنگ بھی شیروں کو پال چکے ہیں۔ اور وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ شیر انسان سے مانوس ہو جاتا ہے۔ لیکن آقا صرف ایک کو سمجھتا ہے۔

جنگل میں اگر خوف کھانے کی کوئی چیز ہے تو صرف ایک ہے، اور وہ ہے ریچھ۔ ریچھ کا کوئی بھروسہ نہیں کہ یہ کب اور کہاں چپٹ جائے۔ یہ انسان کو دیکھ کر کسی نہ کسی طریقہ سے اس پر حملہ آور ہونے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ حرکتیں تو ریچھ کی خراب ہیں اور بدنام ہوا بیچارہ شیر۔

آخر میں اس قصہ کو تمام کرتے ہوئے ای۔ پی۔ جی (E.P.Gee) کے چند جملوں کو یہاں لکھنا ضرور پسند کرونگا جو انہوں نے اپنی کتاب دی وائلڈ لائف آف انڈیا (The Wild Life of India) میں شیر کے بے ضرر ہونے کے سلسلہ میں لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''شیر شاید ہی کبھی کسی آدمی کو مارتا ہے۔ اگر ایسا ہو بھی جائے، وہ چاہے کسی حادثہ کے نتیجے میں ہو یا غلط فہمی سے، تو بھی آدمی کو کھائے گا نہیں۔ آدم خور شیر تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ان کی گنتی کی جائے تو ہزار میں تین یا زیادہ سے زیادہ چار شیر آدم خور ہوں گے۔ شیر سے آپ کو جنگل میں کوئی خطرہ نہیں۔ نارمل شیر یعنی جو شیر آدم خور نہیں ہیں، وہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جب تک کہ آپ دھوکہ سے کسی ایسی شیرنی کے بہت

قریب نہ پہنچ گئے ہوں جس کے ساتھ چھوٹے بچے ہوں۔ یا شیر سو رہا ہو اور آپ لاعلمی میں اس کے قریب پہنچ کر اس کو نیند سے بیدار کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ مشتعل ہو کر حملہ کر بیٹھے، ورنہ عام حالت میں شیر انسان کا احترام کرتا ہے اور اسے خوامخواہ نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا۔

شیر کی فطری صلاحیتیں۔ عادات اور خصائل

ہر ریاست اور ہر خطہ کے شیروں کی عادتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو عادتیں کانہا کے جنگل کے شیروں کی ہوں، وہی عادتیں مہوف، میلانی اور دُدھوا کے شیروں کی بھی ہوں۔ شیر کی عادتیں خطوں کے جغرافیائی حالات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا شیر کے شکاری کو کسی کی کوئی کتاب پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اب وہ شیر کا شکار ہندستان بھر میں کہیں بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر اس نے کرنل کیسری سنگھ کی کتاب پڑھی ہے تو پھر اس کو صرف راجستھان ہی میں شکار کھیلنا ہوگا۔

اُتر پردیش کے ترائی کے شیر عادتوں کے لحاظ سے راجستھان کے شیروں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ یوپی کے پہاڑی علاقہ کے شیر، یوپی کے میدانی علاقوں کے شیروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق آپ کو نیچے لکھے چند اقتباسات سے ہو جائے گی۔ جارج بی شیلر لکھتا ہے:

''شیر کی عادات و اطوار کے متعلق میرے نتائج، ہو سکتا ہے کہ اس کے علاقے کے کچھ حصوں کے مطابق نہ ہوں کیونکہ شیر ایک ایسا جانور ہے جو ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے اور اپنی عادتوں کو تبدیل کر لیتا ہے۔ مثلاً لنکا میں شیر انسانوں کے ذریعہ بار بار پریشان کئے جانے کے باوجود اپنے مارے ہوئے شکار کی طرف دوبارہ لوٹ آتا ہے، لیکن دوسرے علاقوں میں محض ذرا سی چھیڑ چھاڑ سے وہ مارے ہوئے شکار کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور وہاں دوبارہ نہیں آتے۔

نواب قطب یار جنگ اپنی کتاب ''شکار'' میں لکھتے ہیں:

''جن چرندوں اور درندوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان کی فہرست اولاً صرف شکار اور ثانیاً صرف ان جانوروں تک محدود ہے جو ہمارے ملک دکن میں ممالک متوسط و ممالک محروسہ سرکار عالی، برار، میسور، احاط مدارس وغیرہ شامل ہے۔ (یہ کتاب آزادی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت ان علاقوں کے یہی نام تھے) یہ سب جانور بہ استثنائے چند شمالی ہندستان، راجپوتانہ، پنجاب، سندھ، کشمیر، بنگال، سندربن، نیپال کے ترائی میں بھی موجود ہیں۔ ان کی عادات و خصائل، بودوباش کے مقامات، زندگی گزارنے کے طریقے اور قدوقامت کی بابت میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ دکن کے لیے مخصوص ہے۔ شمالی ہند کے جانوروں کی خصوصیات میں بہ لحاظ آب وہوا، جنگل کی نوعیت تھوڑا بہت فرق ہونا ضروری ہے۔''

میں نے خود بہ نظر غائر شیروں کی عادات کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر شیر جو پڈّا کھلا کر مارا گیا، دوسرے شیروں سے عادات اور خصائل میں بالکل مختلف تھا۔ جیسے آپ زندگی بھر تاش کھیلتے رہے ہوں، لیکن تاش کے جو پتے آپ کے پاس ایک مرتبہ آگئے ہوں گے، ویسے پتے دوبارہ آپ کے پاس کبھی نہیں آسکتے۔ بالکل یہی حالت شیر کی ہے۔

قطب یار جنگ کی رائے ہے کہ گجرات اور بمبئی کے شمال میں شیر کا وجود تو کہیں کہیں ضرور ہے، مگر بہت کم ہے۔ یہاں کا شیر بمقابلہ بنگال، ناگپور، دکن اور میسور کے چھوٹا ہے، چھریرے بدن کا اور کم خونخوار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے راجستھان کا شیر بدمزاجی میں ملک کے تمام شیروں سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ لمبائی میں کسی قدر کم، جثہ میں سب کے برابر اور بلندی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہمالہ کی ترائی کا شیر لمبائی کے لحاظ سے سارے ملک کے شیروں سے بڑا ہوتا ہے۔ جنوبی ہند کے شیر لمبائی کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن پہاڑوں کے شیر، جنوبی ہند کے شیروں کے برابر ہوتے ہیں۔ پہاڑوں کے شیر، چاہے وہ کتنے ڈسٹرب کئے جائیں، واپس ضرور آتے ہیں۔ اس کی وجہ غذا کی کمیابی ہے۔ ترائی کے شیر بِکل (مارے ہوئے شکار) پر اگر ڈسٹرب کئے جائیں اور ان کو ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو وہ دوبارہ بِکل پر نہیں آتے۔ پہاڑوں پر شیر بِکل پر آنکھ بند کر کے آتے ہیں۔ لیکن ترائی کا شیر

پہلے رکل سے دس بیس گز دور رُک کر رکل کا جائزہ لیتا ہے پھر رکل پر آتا ہے۔

شیر کی عمر کے متعلق لوگوں کے بیانات میں بہت اختلاف ہے۔کوئی کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ اور، شیر کے شکاری اور جنگل میں رہنے والے لوگ بھی اس سلسلہ میں خاموش رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اب صرف چڑیا گھر ہی ایسی جگہ رہ جاتی ہے جہاں سے یہ ریکارڈ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چڑیا گھر اور جنگل دو مختلف چیزیں ہیں، جن میں کوئی مماثلت نہیں۔ ہاں یہ قوی امکان ہے کہ چڑیا گھر میں شیر کی زندگی کم اور جنگل میں زیادہ ہوتی ہو۔ جب کہ جانوروں میں جثہ بھی اس سے اثر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چڑیا گھر کے شیر جنگلوں کے شیر کے مقابلہ، بہ اعتبار قد چھوٹے، دُبلے اور صورتاً گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غلامی اور آزادی کا فرق ہے۔

جی۔بی۔شیلر (G.B.Schaller) شیر کی عمر لگ بھگ بیس سال بتاتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا شیر کا مطالعہ مجموعی طور پر صرف باون گھنٹوں کا ہے۔ جس کی مدت تین سال ہے۔ یعنی صرف تین سال کا مطالعہ۔

قطب یار جنگ شیر کو پچیس سال تک جوان بتاتے ہیں، اور عمر طبعی تیس یا پینتیس سال مانتے ہیں۔ جب کہ انگریزی محققین شیر کی عمر چالیس سال بتاتے ہیں۔

قطب یار جنگ اور انگریز محققین کی رائے اس سلسلہ میں زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکاری شیر کی اس صفت کا مشاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔ برخلاف اس کے شیلر کی رائے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس نے مختلف چڑیا گھروں سے شیر کی عمر کا ریکارڈ حاصل کیا ہے۔ لہٰذا اس کا امکان ہے کہ شیر کی عمر بیس اور پچیس سال کے درمیان ہی ہوتی ہو۔ لیکن یہ ریکارڈ ہے چڑیا گھر کے قیدیوں کا۔ قید و بند اور آزادی کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جنگلوں میں جو جانور صرف درخت کی پتیوں اور گھاس پھونس پر گزر اوقات کرتے ہیں، وہ اگر باندھ کر رکھے جائیں اور ان کو مقوی سے مقوی غذا دی جائے، تب بھی وہ ہاتھ پیر اور جسم کے لحاظ سے اپنے آزاد بھائیوں سے کمتر ہوں گے۔ اگر اس بات کا اطلاق عمر پر کیا جائے تو آزاد زندگی میں عمر کا زیادہ بڑھ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

شیر جنگلوں میں آزاد پھر رہا ہے تو کسی بھی طریقہ سے اس کی عمر کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر چڑیا گھر میں شیر کی عمر بیس سال مان لی جائے، تو آخر جنگلوں میں رہنے والے شیروں کو دو سے پانچ سال کا گریس دیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے شیر کی عمر بائیس سے پچیس سال تک ہو سکتی ہے۔

شیرنی کا زمانۂ حمل

شیرنی کے زمانۂ حمل کے سلسلہ میں لوگوں کا آپس میں بہت اختلاف ہے، بہر حال مختلف لوگوں کی رائے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ اس میں زیادہ گفتگو سوئے ادب ہے۔

شیرنی یعنی جنگل کی رانی ہر موسم میں حاملہ ہوتی ہے۔ ڈی برینڈر (D.Brender) ایوویرٹی (lowerarety) سینڈرسن (Sandersan) برٹن (Borton) بولڈن (Boldon) اور لیڈریکر (Ladricar) ان تمام شخصیتوں نے شیرنی کو سال کے تمام مہینوں میں نوزائیدہ بچوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ لیکن قطب یار جنگ شیر اور شیرنی کے ملاپ کا زمانہ ابتدائی فروری سے آخر مارچ تک بتاتے ہیں۔ اور راجہ صاحب اکتوبر نومبر۔ لیکن شیر ہر مہینہ میں ہیٹ پر آ سکتا ہے۔ بولڈن اور لیڈریکر نے مارچ کے مہینہ کو اس کے بہار پر آنے کا مہینہ بتایا ہے۔ لیکن اینڈرسن نے شیرنی کے ساتھ نوزائیدہ بچے، مارچ، مئی، اکتوبر اور نومبر میں بھی دیکھے ہیں۔ برٹن اسے مارچ، اپریل اور دسمبر بتاتے ہیں۔

شیرنی، دو تین سے لے کر چھ سات تک بچے دیتی ہے۔ ایوویرٹی، رچرڈسن اور ڈی۔ برینڈر نے چھ بچے ایک ساتھ شیرنی سے لگے دیکھے ہیں۔ یو پی کے جنگلات میں متعدد شکاریوں نے شیرنی کے ساتھ دو سے چار تک بچے دیکھے۔ راجہ صاحب بھی ان لوگوں سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے بھی یہی دیکھا ہے۔

بالعموم شیرنی ایک ساتھ چار بچوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر بچے کم عمری میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں کیونکہ نر شیر بھی بچوں کا سخت ترین دشمن ہے۔ اکثر دیکھنے میں

آیا ہے کہ باپ نے اپنے بچے خود کھا لیے۔اس وجہ سے شیرنی بچے ہوتے ہی شیر سے الگ ہو جاتی ہے اور ان کی حفاظت کے مدنظر ان کو لے کر کسی محفوظ مقام پر جا کر رہنے لگتی ہے۔لیکن جنگلی کتے، سیار، لکڑ بگے اور گلدار وغیرہ بھی ان بچوں کے سخت دشمن ہوتے ہیں۔حالانکہ شیرنی ان بچوں کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرتی ہے،اور اس خوف سے کہ اس کی عدم موجودگی میں بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے،وہ ایک ایک ہفتہ تک نہ تو کچھ کھاتی ہے اور نہ پانی پیتی ہے۔جب تک وہ یہ یقین نہ کر لے کہ اس کے بچے اس کی عدم موجودگی میں محفوظ رہیں گے،وہ ان کو اکیلا نہیں چھوڑتی۔

شیر کے بچوں کی آنکھیں نو سے گیارہ دن میں پوری طرح کھل جاتی ہیں۔جوئے ایڈمسن (J.Adimson) یہ میعاد تین دن بتاتی ہیں۔گرینڈل پانچ دن۔قطب یار جنگ پندرہ سے بیس دن۔

جب بچوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ دیکھنے لگتے ہیں،اس کے بعد شیرنی کو ان کی حفاظت اور بھی زیادہ کرنا پڑتی ہے کیونکہ اب یہ رینگ کر گپھا سے باہر نکل سکتے ہیں۔اور گپھا سے باہر موت ان کے انتظار میں ہوتی ہے اس وجہ سے شیرنی کا وہاں ہر وقت موجود رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بچوں والی شیرنی عموماً نحیف ولاغر دیکھی گئی ہے۔

شیر کا دورہ یعنی بیٹ(Beat)

عموماً شیر اپنے شکار کی تلاش میں رات کو نکلتا ہے اور دس بارہ میل کا چکر لگتا ہے۔اس چکر کو شیر کی بیٹ کہتے ہیں۔اس سفر کے دوران شیر اپنے راستے کے درختوں کو اور جھاڑیوں پر ایک رقیق گاڑھا مادّہ، جو تیل کی طرح ہوتا ہے اور نہایت بدبودار، چھڑکتا چلتا ہے۔اس طرح شیر اپنی بیٹ کی حد بندی کرتا ہے۔

یہ تیل جیسی چیز شیر کے ان غدودوں سے خارج ہوتی ہے جو اس کی دم کے نیچے گردوں کی شکل کے ہوتے ہیں۔یہ رقیق مادہ انتہائی بدبودار ہوتا ہے اور اس کی بدبو کئی کئی روز تک نہیں جاتی۔اکثر لوگ اس بدبودار رقیق چھڑکاؤ کو شیر کے پیشاب کرنے پر محمول کرتے

ہیں۔لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے، جس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے،شیر اپنے شکار کی تلاش میں رات کو نکلتا ہے اور ایک لمبا چکر لگتا ہے ، کیونکہ شکار کے لیے جانوروں کی تلاش ہندستان کے جنگلوں میں بغیر سخت دوڑ دھوپ کے ممکن نہیں، اس وجہ سے شیر کو بھی کافی محنت ان کو تلاش کرنے میں کرنا پڑتی ہے۔ ہندستان کے جنگلوں میں جانوروں کی کمی، یہاں کے شیروں کو رات بھر میں میلوں کا چکر لگانے پر مجبور کرتی ہے۔

شیر رات بھر میں کتنی مسافت طے کرتا ہے۔اس بارے میں لوگ مختلف الرائے ہیں۔

اس سلسلے میں قطب یار جنگ کا کہنا ہے۔"شیر کی سیاحت شبانہ کا اوسط دس بارہ میل سے کم نہیں ہے۔اس واسطے اگر دو دن میں دس میل فاصلے کے اندر دو گارے ہوں (دو پڈّے مارے جائیں) تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ میں ایک شیر ہے۔اگر دو گاروں میں دس میل سے زیادہ دوری ہو،تو دو جدا جدا شیروں کا ہونا قیاس کیا جاتا ہے۔

برخلاف اس کے اینڈرسن کی رائے ہے کہ اگر دو کل پانچ میلے کے فاصلے پر ہوں،تو یہ دو مختلف شیروں کا کام ہے وہ اپنی کتاب دی ٹائیگر رومس(The Tiger Roams) میں لکھتا ہے،

اگر ایک رات میں دو پڈّے مارے گئے ،جن کا فاصلہ ایک دوسرے سے پانچ میل ہو،تو یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ دو مختلف شیروں کی حرکت ہے۔

مجھے ایک مرتبہ ایک پہاڑی علاقہ کے بلاک میں اس سلسلہ میں تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ ایک میل کے اندر ہمیں تین پڈّے باندھنا پڑے۔دو دن تک ان میں سے ایک پڈا بھی نہیں مارا گیا لیکن تیسرے روز تینوں پڈّے مار دیے گئے۔ان پڈّوں میں سے ایک پڈّا، ایک رات اپنی موت آپ مر گیا۔اس پڈّے کو اٹھوا کر ایک گدیلے میں جو سڑک کے بالکل نزدیک نکلتا تھا، ڈلوا دیا۔صبح کو جب پڈّوں کو دیکھنے گئے تو اس مرے ہوئے پڈّے پر دو شیر نو بجے موجود ملے جو اس کو کھا رہے تھے۔ ہماری آمد پر یہ دونوں شیر بہت برافروختہ ہوئے اور کافی ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد پہاڑ پر چڑھ گئے۔ہم لوگ واپس جیپ پر آکر بیٹھ گئے ،جو اس

جگہ سے زیادہ سے زیادہ بیں پچیس گز دور کھڑی ہوگی۔ اس وقت ہم لوگوں کے پاس کوئی بڑے بور کی رائفل نہیں تھی کیونکہ صرف مرغ اور تلیچ مارنے نکلے تھے۔ بارہ بور کے بھی صرف چھرّے کے کارتوس تھے اور ایک ہلکے بور کی رائفل تھی۔ اس وجہ سے ان شیروں سے نبرد آزمائی نہیں کی جا سکتی تھی۔

ہم لوگ واپس آ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے ہوئے دو گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا کہ دونوں شیر پھر پڈّے پر آ گئے۔ یہ تمام باتیں ایک لمبی چوڑی بحث کا آغاز کر سکتی ہیں لیکن نفسِ مضمون کو مدنظر رکھتے ہوئے پھر شیر کے سفر اور رفتار پر آنا پڑ رہا ہے۔

اس بات کو طے کرنے کے لیے کہ شیر ایک رات میں کتنا چلتا ہے، یہ ضروری ہے کہ شیر کی رفتار فی گھنٹہ معلوم کی جائے۔ اس سلسلہ میں جو ریسرچ کی گئی، وہ میرے خیال میں بہت مناسب ہے۔

شیر کی اوسط رفتار تین چار میل فی گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ راجہ صاحب بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، بلکہ ان کا خیال ہے کہ شیر ایک وقت میں دس بارہ میل سے زیادہ چلنا پسند نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں وہ شیروں کی آدم خوری کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض حالتوں میں یہ رفتار کم ضرور ہو جاتی ہے، جب کہ وہ شکار پر ڈھونک لگا رہا ہو یعنی شکار کی تاک میں ہو۔ یا اس رقیق مادّہ کا چھڑکاؤ کر رہا ہو جو اپنی حد بندی کے سلسلہ میں درختوں اور جھاڑیوں پر کرتا ہے۔ لہٰذا اگر شیر کی رفتار تین میل فی گھنٹہ ہی رکھی جائے، تو بھی شیر دس گھنٹہ میں تیس میل کا راستہ بہ آسانی طے کر سکتا ہے۔ وہ لوگ جو شیر کا ساٹھ میل یا اس سے زیادہ فاصلہ طے کرنا بتاتے ہیں، وہ بھی غلط نہیں کہتے کیونکہ شیر کی طاقت سے بعید نہیں کہ وہ بارہ یا چودہ گھنٹے مسلسل نہ چل سکتا ہو۔ اگر شیر چودہ گھنٹے لگاتار چلے تو وہ چار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چھپّن میل کا فاصلہ آسانی سے طے کر سکتا ہے۔ ایک آدمی بھی عام حالات میں ایک گھنٹے میں چار میل بہ آسانی چل لیتا ہے۔ سب سے مستند طریقہ جس سے شیر کی رفتار کے بارے میں تصدیق ہو سکتی ہے، آدم خور شیروں کے ہاتھوں انسانوں کا مارا جانا ہے۔

ایک آدم خور شیر نے ایک گاؤں میں ایک عورت کو جو گھاس کاٹ رہی تھی، مار دیا۔

اس عورت کے ساتھیوں نے اس کی لاش کو شیر سے چھین لیا۔ یہ واقعہ دو پہر کو ہوا۔ وقت دو بجے اور چار بجے کے درمیان رہا ہوگا۔ صبح چھ بجے ایک دوسرے گاؤں میں جو اس گاؤں سے اڑتیس چالیس میل دور تھا، دوسرا واقعہ ہوا۔ جس میں اسی شیر نے ایک آدمی کو مار ڈالا، جو کھیت پر جا رہا تھا۔ ان دونوں واقعات میں اٹھارہ گھنٹے کا فرق تھا۔ یعنی دوسرا واقعہ پہلے واقعے سے اٹھارہ گھنٹہ بعد ہوا۔ اس میں کچھ وقت شیر کا کل کے نزدیک رہنے کا نکال دیا جائے، اور پہلے واقعے کا وقت چار بجے کا مان لیا جائے، تو اس طرح دونوں کل میں بارہ گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے۔ بارہ گھنٹوں میں اڑتیس میل کا سفر تین مل فی گھنٹہ کے حساب سے بیٹھتا ہے۔

شیر میدانوں اور پہاڑوں میں ایک ہی رفتار سے چلتا ہے۔ پہاڑ کی سخت چڑھائی بہت آسانی سے طے کر لیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے بھی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بر خلاف اس کے انسان کی رفتار چڑھائی پر کم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سانس میں لمبی چڑھائی بغیر رُکے اور ستائے طے نہیں کر سکتا۔ لیکن شیر ایسی چڑھائیوں کو بھی بغیر رُکے اتنی ہی آسانی سے طے کر لیتا ہے، جیسے میدان میں صاف سڑک پر چل رہا ہو۔

شیر بمقابلہ او بڑ کھابڑ او ر ناہموار زمین کے جنگل میں سڑکوں پر چلنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ جاڑوں کے موسم میں تو شیروں کے پنجوں کے نشان ہمیشہ جنگل کی صاف اور فرسٹ کلاس سڑکوں ہی پر ملتے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں کیونکہ شیر کے پنجوں کی گدیوں میں بوائیاں ہو جاتی ہیں۔ اس لیے وہ سخت گھاس میں چلنا پسند نہیں کرتا، کیوں کہ گھاس اس کی بوائیوں میں تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔

لکھیم پور کھیری کے ایک بلاک میں شیر زیادہ تر تکونیا کے شیشم باڑے میں رہتے تھے۔ ہم لوگوں نے اس میں ایک شیر کو دیکھا جس کے نکلنے کا وقت مقرر تھا اور واپس جانے کا بھی۔ اس شیر کا ایک کان کٹا ہوا تھا۔ اور بہت ہیکڑ تھا۔ یہ شیر ''کن کٹا'' کے نام سے مشہور تھا یہ شیر براہی بلاک میں بھی دیکھا جاتا تھا۔ مجھے فارسٹ گارڈوں نے بتایا کہ براہی میں ایک شیر رہتا ہے جس کا ایک کان کٹا ہوا ہے اور وہ بھی بہت ڈھیٹ ہے۔ ہم لوگوں کو بہت تعجب ہوا کہ کشن پور اور براہی دونوں بلاکوں میں دو شیر ایک ہی صفت کے ہیں۔ جب چھان بین کی تو

معلوم ہوا کہ ایک ہی شیر ہے جو کشن پور میں نکونیا میں رہتا ہے، لیکن دھاوے براہی تک مارتا ہے۔ براہی، نکونیا سے چودہ، پندرہ میل کے فاصلہ پر تو ضرور ہوگا۔ ہم نے اس شیر کا کشن پور سے نکلنے کا وقت نوٹ کیا اور براہی میں دیکھے جانے کا بھی۔ اس وقت کے درمیان کا وقفہ شاید سوا پانچ یا ساڑھے پانچ گھنٹہ ہوتا تھا۔ یعنی پانچ گھنٹہ اور کچھ منٹ میں چودہ پندرہ میل کا فاصلہ اگر طے کیا جائے تو رفتار وہی تین میل فی گھنٹہ کے قریب ہوتی ہے۔ واپسی کا سفر اگر جوڑ دیا جائے تو کل فاصلہ تیس بتیس میل ہوتا ہے اور وقت تقریباً گیارہ گھنٹہ۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شیر گیارہ بارہ گھنٹے میں، اگر وہ مسلسل چلتا رہے، تو چالیس بیالیس میل ضرور چل سکتا ہے۔

شیر کے رہنے کی جگہیں

شیر کے متعلق ایک بالکل انوکھی بات جس کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، بہت تعجب خیز ہے۔ جس کا کوئی سائنٹفک جواز میری سمجھ میں نہیں آتا اور نہ ہی کسی دوسرے شخص نے اس بات میں کوئی معقول رائے دی ہے۔ اگر دی ہو تو میری نظر سے نہیں گزری۔

جنگل میں شیر کے رہنے کی ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے، جہاں وہ رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایسی جگہوں میں ان صفات کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ٹھنڈی ہوں، زمین نرم ہو، پانی سے قریب ہوں اور خوب سائے دار ہوں۔ ہر جنگل میں دو ایک جگہیں ان خوبیوں کی حامل ضرور ہوتی ہیں۔ شیر انہیں جگہوں میں رہتا ہے۔ جیسے میلانی میں لگر گدھا۔ کشن پور میں نکونیا۔ ای کنٹرول۔ مڈھا میں سنگا تالاب۔ قلعہ میں نگرہ تال وغیرہ وغیرہ۔ اوپر بیان کی گئی جگہوں میں ہانکے کرائے گئے اور ان میں شیر نکلے اور مارے بھی گئے۔ اگلے سال پھر ہانکا ہوا۔ شیر دوبارہ بھی وہیں سے نکلا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیر کے رہنے کی مخصوص جگہ کبھی شیر سے خالی نہیں رہتی۔ اگر وہاں ایک مارا گیا تو دوسرے نے اسے فوراً پُر کر دیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شیر دوسرے شیر کے علاقہ میں مستقلاً آتے جاتے رہتے ہیں اور شکار بھی کرتے ہیں اور شیر کے رہنے کی جگہ خالی دیکھ کر اس میں قیام پذیر بھی ہو جاتے ہیں۔

بیز (Baze) کا کہنا ہے کہ شیر اپنے رہنے کی جگہ سے بہت مانوس ہوتا ہے اور اسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ راتوں کو کافی لمبے چکر لگانے کے بعد صبح کو شیر اپنے رہنے کی جگہ واپس ضرور آتا ہے، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ شیر کی واپسی اسی رات میں ہو جائے۔

ہم لوگوں نے مختلف بلاکوں میں شیر کے رہنے کی مخصوص جگہوں کو مقامی آدمیوں سے معلوم کیا۔ اور جب ہانکا کرایا تو ان میں سے شیر ضرور نکلے اور پھر اگلے سال بھی ان جگہوں کو شیر سے خالی نہیں پایا۔

ویسے تو شیر عام طور پر بڑی گھاس اور گھنی جھاڑیوں میں رہتا ہے، لیکن زمیندارا کے جنگلات میں شیر عام طریقہ سے دریا کے کنارے کٹاروں میں رہتا ہے۔ کٹارے جنگلی جامن کے ان کنجوں کو کہتے ہیں جو دریاؤں اور تالابوں کے کنارے اُگ آتی ہیں اور بہت گھنی اور گنجان ہوتی ہیں۔ وہاں اوپر نرم پتیوں کا ایک شامیانہ یا چھتری سی بن جاتی ہے، اس وجہ سے سورج کی روشنی نیچے زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔ دھوپ اور روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے زمین گھاس وغیرہ سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ کہیں کہیں فرن کے پودے یا بید کی جھاڑیاں اُگ آتی ہیں، جن کی وجہ سے کٹارے بہت ٹھنڈے رہتے ہیں۔ یہ جگہ دن میں شیر کے ٹھہرنے کے لیے بڑی موزوں ہوتی ہے۔

زمیندارا کے جنگلوں میں شیر کے لیے اگر ان کٹاروں کو ہنکوایا جاتا ہے تو ان میں سے شیر ضرور نکلتے ہیں لیکن ان کٹاروں کو سوائے ہاتھی کے اور کسی طریقہ سے نہیں ہنکوایا جاسکتا۔

ہمارے شہر کے قریب ایک زمیندارا کا جنگل تھا، جو اَب بلاک بن گیا ہے۔ اس جنگل میں شکار کھیلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس وجہ سے اوائل عمری میں ہم لوگوں کی پسندیدہ شکار گاہ تھی۔ ہر قسم کا گیم اور شکار کثرت سے تھا۔ اس بلاک میں ایک کٹارہ تھا جس کو لچھی کے کٹارے کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کٹارے میں جب بھی شیر کے لیے پڑادیا گیا، وہ مارا ضرور گیا۔ ہر سال اس کٹارے میں ایک نہ ایک شیر مارا ضرور گیا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کٹارہ شیر سے خالی رہا ہو۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ لچھی کے کٹارے

میں ایسی کون سی خصوصیت تھیں جن کی وجہ سے یہ کنارہ شیر سے کبھی خالی نہیں ملا۔

راجہ صاحب کی رائے تھی کہ چونکہ یہ کنارہ دیگر کناروں سے رقبہ میں بڑا ہے اور اس کا محل وقوع ایسا ہے کہ شیر یہاں سے جنگل میں جس طرف جانا چاہے، آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ یعنی یہ کنارہ جنگل کے اس ٹکڑے کا سنٹرل پوائنٹ تھا۔ دوسری خوبیاں تھیں سکون، زیادہ روشنی کا نہ ہونا، پانی کی قربت، نرم زمین، مکھی اور کیڑوں کی عدم مداخلت۔ یہ تمام باتیں ایک ساتھ اس کنارے میں مل سکتی تھیں، جس کی وجہ سے شیر ہمیشہ اس کنارے میں آ کر ٹھہرتے تھے۔

شیر تنہائی پسند جانور ہے۔ اس رائے سے تمام شکاری اتفاق کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک چینی کہاوت اگر بیان کی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، جس میں کہا گیا ہے کہ:

''ایک پہاڑی پر دو شیر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔''

اینگلس (Engles) کہتا ہے کہ ''شیر اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے الگ تھلگ رہنے والا جانور ہے۔ لیکن جوانی کے جوش کے زمانے میں وہ اکٹھے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔''

لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس باتیں بھی میرے مشاہدے میں آئیں جو قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ راجہ صاحب کہتے ہیں:

ایک مرتبہ گولا سال کے بلاک میں گھاس کے ایک قطعے کا ہانکا کرایا گیا۔ اس شکار میں محکمہ جنگلات کے ایک آفیسر بھی شامل تھے۔ اس ہانکے کے درمیان اس گھاس سے جو زیادہ سے زیادہ تین چار ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی، چار شیر نکلے۔ وہ چاروں شیر مار لیے گئے۔ راجہ صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک دوسرے پہاڑی بلاک میں ایک میل میں چار پڑے باندھے گئے۔ یہ چاروں پڑے ایک ہی رات میں مار دیے گئے۔ یہ کام چار الگ الگ شیروں کا تھا جو بعد میں ثابت بھی ہوا۔

کشن پور میں ایک تکونیا ہے جو شیروں کے رہنے کی مشہور جگہ ہے۔ اس کو جب بھی ہاتھیوں سے ہنکوایا گیا، ہمیشہ اس میں دو سے چار شیر نکلے۔ اس بلاک میں ایک دوسری جگہ اَن کنٹرول ہے۔ اس گھاس میں بھی ایک سے زائد شیر نکلے۔

یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ شیر کی عادت کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی یہ سب باتیں، حالات، رہنے کی جگہ اور جنگل کے رقبہ پر منحصر ہوتی ہیں۔

جس جنگل میں شیر کے ٹھہرنے کی جگہیں زیادہ ہوں، اور بلاک رقبہ کے اعتبار سے لمبا چوڑا ہو، اس میں شیر دور دور اور الگ الگ رہتے ہیں۔ اگر رقبہ کم اور رہنے کی جگہیں چند ہوں، تو شیر نزدیک نزدیک رہیں گے۔ بس یوں سمجھ لیجئے جیسے سبزی خور جانور کو لھا جوڑ کر گلّے کی شکل میں رہتے ہیں، شیر اس طرح نہیں رہتے، وہ اگر کم رقبہ میں بھی رہیں، تو ایک اِس کنارے پر اور دوسرا دوسرے کنارے پر رہے گا۔ ببر شیر گلّے کی شکل میں ایک ساتھ رہنے کے عادی ہیں۔ لیکن بنگال ٹائیگر جو ہمارا ''شیر'' ہے، جب آرام کرے گا تو تنہائی میں کرے گا۔ اس وقت اس کے ساتھ دوسرا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ببر شیر مل کر شکار کرتے ہیں اور کھاتے بھی مل جل کر ہیں۔ لیکن ہمارا شیر بالکل اکیلے شکار کرتا ہے اور کھاتا بھی تنہا ہی ہے۔ اگر شیرنی ساتھ ہو، تو اس کی مجال نہیں کہ پہلے وہ کھا سکے یا بچے بھی کھانے میں شریک ہوسکیں، سب کو مار کر اور غصہ کر کے بھگا دیتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی کچھ واقعات ایسے بھی دیکھنے میں آئے کہ یہ سب تھیوریاں فیل ہوگئیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

ہم لوگ ایک مرتبہ مالا بلاک میں شکار کھیل رہے تھے۔ شیر کے لیے پڑے دیے جا رہے تھے۔ صبح کو ایک آدمی جب پڑوں کو دیکھنے گیا تو اس نے بتایا کہ ایک پڑا نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ ہم لوگوں نے اس جگہ، جہاں پڑا باندھا گیا تھا، جا کر وہ جگہ دیکھی۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ پڑا درحقیقت کھل گیا ہے، شیر اس کو نہیں لے گیا۔ اب پڑے کی تلاش شروع ہوئی جس کا منہ جس طرف اٹھ گیا، اس طرف چل دیا۔ پڑا اپنے نشان تو چھوڑ نہیں گیا تھا جو اس کی مدد سے کسی خاص سمت میں جایا جاتا۔ ہم لوگ جنگل میں اس کی تلاش میں مصروف تھے کہ ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا۔ شاید اس نے ہماری جیپ کی آواز سُن لی تھی۔ اس نے بتایا کہ ابھی ابھی اس کی ایک کلونجی اور سب سے تندرست گائے کو ایک شیر نے مار دیا ہے۔ ہم سب اکٹھا ہو کر اس چرواہے کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں اس کی گائے ماری گئی تھی۔ گائے کی لاش

غائب تھی۔ اب ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ اس ٹکڑے کی اچھی طرح چھان بین کریں ۔ لہٰذا چرواہے کو وہاں سے روانہ کر دیا۔ ہم لوگ پرا باندھ کر کافی دور تک پھیل گئے اور آگے بڑھتے گئے۔ کافی تلاش کے باوجود گائے کی لاش نہیں ملی۔ لیکن مجھ کو ایک کٹی ہوئی اور کالی دم ضرور ملی۔ میں نے اس کو اٹھا کر ایک چھوٹے سے درخت پر رکھ دیا۔ اور آگے بڑھا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ ایک اور پونچھ ملی۔ میں نے آواز دے کر لوگوں کو متوجہ کیا اور پونچھ دکھا کر واقعہ بیان کیا۔ دوسرے لوگوں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ پونچھ صرف ایک ہے اور میں گھوم کر پھر اس پہلے والی پونچھ کی جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ساتھ ہی ذہن میں ایک پرانی مثل بھی کلبلا گئی۔ اکثر ہماری بزرگ عورتیں جب ہماری کسی بات کا اعتبار نہ کرتیں اور ہم بضد ہوتے کہ نہیں ایسا ہی ہوا ہے، تو وہ کہتیں ''دیدوں میں ملیدے کیوں کرتا ہے۔'' یہاں بھی لوگ ہمارے دیدوں میں ملیدے کر رہے تھے۔ لہٰذا حقیقت کو جاننے کے لیے اور غلط بحث کو ختم کرنے کے لیے میں فوراً مڑا اور اس طرف کو چلا جہاں درخت پر پونچھ رکھ آیا تھا، گیا اور ذرا سی ہی دیر میں دوسری پونچھ ہاتھ میں لیے ہوئے آیا، اور اس پونچھ کو بھی ان صاحب کے ہاتھ میں، جو دوسری پونچھ پکڑے ہوئے تھے، تھما کر ایک خاص فاتحانہ انداز میں دوسروں پر نظر ڈالی۔

ہم لوگوں نے پھر لائن بنائی اور آگے بڑھے۔ ایک بہت گھنیرے درخت کے پاس کئی شیروں کی لوٹن کے نشانات ملے۔ اور ایک جگہ پیشاب کیا ہوا بھی ملا۔ اب ہم لوگوں نے بہت محتاط ہو کر آگے بڑھنے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس ٹکڑے میں کئی شیر ہیں۔ بہت کوشش کی لیکن کوئی شیر نہیں ملا۔ ہاں ایک کھائی ہوئی گردن ضرور ملی، جو بدبو دے رہی تھی۔ مری ہوئی گائے کا نہ ملنا بہت تعجب کی بات تھی کہ تین گھنٹہ کے اندر وہ کون سا شیر تھا جو پوری ایک گائے کو کھا گیا۔ بلکہ دو دُموں کا مطلب ہے کہ دو گائیں تھیں اور ان سے معلوم ہوتا تھا کہ کم از کم تین دن پرانی ضرور ہوں گی۔ موسم سردیوں کا تھا، اس وجہ سے کوئی گوشت تین گھنٹہ میں اس قدر خراب نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب ہوا کہ تین دن میں تین بہت بڑے بڑے جانور مارے گئے اور کھائے گئے۔ شیر کی بھوک اور کھانے کی مقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے

یہ بات صاف طور سے ظاہر ہوتی تھی کہ اس ٹکڑے میں دو سے زیادہ شیر تھے جو ساتھ رہتے تھے اور ساتھ کھاتے بھی تھے۔ کچھا میں انگریزوں نے ایک جگہ بندہ باندھ کر ایک نہر نکالی تھی۔ یہ بندہ ہمارے فارم، جہاں ہم شکار کھیل رہے تھے، سے کچھا تحصیل جانے کے راستہ میں پڑتا تھا۔ یہ کوئی بہت بڑا باندھ نہیں ہے۔ اس باندھ کو بنانے کے لیے مٹی کو دریا کے کناروں سے نکالا گیا تھا، اور اس کے دھس (پشتے) بنا دیے گئے تھے۔ ایسے کئی دھس اس جگہ بنے ہوئے ہیں جو بیس بائیس فٹ اونچے ہوں گے اور اتنے ہی چوڑے۔ اس پر کثرت سے بہت اونچی گھاس جس کو ہم لوگ چپیل بولتے ہیں، اُگی ہوئی ہے۔ ان پشتوں کو بنانے کے لیے مٹی نکالنے کی وجہ سے چار چار سو یا پانچ پانچ سو گز کے لمبے چوڑے گڈھے بن گئے ہیں۔ ان گڈھوں میں لال ٹینا کثرت سے اُگا ہوا ہے۔ یہ لال ٹینا کئی شیروں کے رہنے کی عمدہ جگہ ہے۔ ہم نے بارہا اس چھوٹی سی جگہ میں کئی کئی شیر دیکھے۔ ایک مرتبہ ہاتھی سے اس میں گھسے تو دو شیر الگ الگ گڈھوں سے نکلے جو مارے بھی گئے۔ ہم لوگ، اکثر جب کبھی کوئی نئے شکاری پھنس جاتے تو ان کو چھرّے کے دو کارتوس لگا کر اس لال ٹینا میں مرغیاں مارنے بھیج دیتے۔ وہ بچارے لال ٹینا میں گھس جاتے۔ ہم لوگ رائفلیں لے کر بندھوں کے ناکوں پر بیٹھ جاتے کہ جانے کے تھوڑی ہی دیر میں نیا شکاری چیختا ہوا، گرتا پڑتا بندھوں پر ہمارے پاس اس اطلاع کے ساتھ آتا کہ نیچے گڈھے میں اس سے ایک گز دور دو شیر اُٹھ کر گئے ہیں۔ ہم لوگ اسی اطلاع پر بڑا ڈراما کرتے اور وہاں سے بھاگ کر فارم پر آتے۔ نئے شکاری دوسری صبح اپنا بوریا بستر باندھتے اور ریل میں سوار نظر آتے۔

شیر کے شکار کے طریقے

شیر ایک منجھا ہوا شکاری ہے۔ اس کو شکار کرنے کے ایک دو نہیں، بلکہ انیک طریقے آتے ہیں۔ بہت کم ایسے خوش قسمت لوگ ہوں گے جنھوں نے شیر کو شکار کرتے اور اپنے شکار کو ہلاک کرتے دیکھا ہو۔

ہندستان کے جنگلوں میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور پائے جاتے ہیں، اس وجہ

سے شیر ان کو ہلاک بھی الگ الگ طریقوں سے کرتا ہے ۔ شیر بڑے جانوروں، جیسے سانبھر، نیل، گونداور گوڑ (جنگل بھینسا) چھوٹے جانور جیسے چیتل، پاڑا۔ کاکڑ اور چوسنگھا وغیرہ کا شکار بالکل مختلف انداز سے کرتا ہے ۔ شیر کو پڑا مارتے اکثر شکاریوں نے دیکھا ہوگا لیکن پڑا مارنے کے لیے شیر کو زیادہ چالاکی اور محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جنگلی جانوروں کو مارنے کے لیے شیر کو پورا ڈرامہ کرنا ہوتا ہے اگر اس ڈرامے میں اس کو کامیابی ہوگئی تو اس کا سابقہ جانور سے دو بدو ہوتا ہے اور یہ مثل 'تنگ آمد بجنگ آمد' یہاں بالکل صادق آتی ہے۔ یعنی گھاس پھونس کھانے والا اور شیر کی ایک ڈونک سُن کر بے ہوش ہو جانے والا جانور، پکڑ لیے جانے پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ شیر شاید پکڑے گئے جانور کی اس کیفیت سے پوری طرح واقف ہوتا ہے، اس لیے وہ جانور کے کھروں اور سینگوں سے بچتے ہوئے، ایسی ماہرانہ ترکیب کا استعمال کرتا ہے کہ جانور اپنے بڑے بڑے سخت سینگوں اور کھروں کے باوجود مردہ پڑا ہوتا ہے۔

اگر ہم شیر کو ہلاکت کا انجن کہیں تو غلط نہ ہوگا اور شاید یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ لوگ شیر کے ہاتھوں شکار کے ہلاک ہونے کے منظر کو دیکھ کر اس کو ظالم، اور بھیانک اور خونخوار کہنے لگے ہوں۔

وہ لوگ جو شیر کو ظالم، خونخوار اور بھیانک خیال کرتے ہیں، اگر کبھی خود انسان کے ہاتھوں انسانوں کی مارکاٹ کے منظر دیکھ لیں تو انہیں پتہ چل جائے کہ انسان، جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، کتنی بھیانک اور خونخوار چیز ہے۔

میں نے انسانوں کی ایسی لڑائیاں دیکھی ہیں ۔ لڑتے وقت آدمی کی شکل اتنی بھیانک ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جوش اس قدر ہوتا ہے کہ سنگین کے زخم پر زخم کھاتا ہے اور محسوس بھی نہیں کرتا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اور جیسے ہی جوش کم ہوتا ہے زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے۔ میں نے دو گورکھوں کو کھکری سے لڑتے ہوئے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے پر ایسے وار کر رہے تھے اور ایسے کاری زخم ان کے آ رہے تھے اور ان کی شکلیں اتنی بھیانک ہو گئی تھیں کہ وہاں موجود دوسرے آدمی کوشش کے باوجود وہاں نہ

ٹھہر سکے۔ ان کو لڑنے سے روکنا اور بچانا تو دور رہا۔

آپ انسان کو اس کی ان تمام حرکتوں کے باوجود ظالم کیوں نہیں کہتے۔ اس کو خونخوار کے لقب سے کیوں یاد نہیں کرتے۔ اس سے آپ خوف کیوں نہیں کھاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان آپ کا بھائی برادر ہے۔ اور شیر اگر غصہ اور جوش کا مظاہرہ، جو وہ شکار کے دوران یعنی غذا حاصل کرنے کے وقت کرتا ہے، تو وہ کیوں ظالم ٹھہرایا جائے، خونخوار کہلائے اور بھیانک ہو جائے۔ اب آپ انصاف کریں، کیا شیر کسی اور طریقہ سے اپنی غذا فراہم کر سکتا ہے۔ شیر کے ساتھ پھر یہ بُرائیاں کیوں منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ نے اکثر شیروں کو چڑیا گھروں میں کھانا کھاتے بھی دیکھا ہوگا۔ کیا وہ وہاں اس وقت بھی آپ کو جوش اور غصہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملے ہیں؟ شیر جوش اور غصے کا مظاہرہ صرف اپنے شکار کو مارنے کے لیے کرتا ہے۔ اگر وہ اس طرح کا مظاہرہ نہ کرے تو شکار نہیں کر سکتا۔

شیر کبھی کتے یا چیتے کی طرح دوڑ کر اپنے شکار کو نہیں پکڑتا۔ لیکن جست لگاتے وقت شیر کو تھوڑا اسٹارٹ ضرور لینا پڑتا ہے۔ ویسے شیر بغیر اسٹارٹ کے بھی زقند لگا سکتا ہے۔ یہ دوڑ شکاری کتے کی طرح کی لمبی تعاقب والی دوڑ نہیں ہوتی۔ شکاری کتے جب کسی جانور کا تعاقب کرتے ہیں تو میلوں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ برخلاف اس کے شیر ایسا نہیں کرتا۔ اس موقع پر شیر کی تیزی اور چھپ جانے کی عادت، اس کی بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔ شیر آہستہ آہستہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے دُبکتا ہوا اپنے شکار کا تعاقب کرتا ہے اور جیسے ہی جانور کے نزدیک پہنچ جاتا ہے، بہت تیزی سے اس پر جھپٹ کر اور قلانچ مار کر اس کو دبوچ لیتا ہے اور جانور کی گردن کے نچلے حصہ کو اپنے منہ سے پکڑ کر اپنے سیدھے ہاتھ کو اس کی گردن پر رکھ دیتا ہے۔ یہ سیدھا ہاتھ آخر تک گردن سے نہیں ہٹتا۔ یہ اس کا بڑا رواں اور کامیاب داؤں ہے۔ اس میں اس کو کبھی ناکامیابی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اگر شیر کا سیدھا ہاتھ بیکار ہو جائے تو وہ شکار کرنے اور حملہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ منہ سے گردن پکڑنے کے بعد شیر ایک زبردست جھٹکا دیتا ہے اور جانور اپنے سر کے بل زمین پر آجاتا ہے۔ اس طرح جانور کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ شیر گردن یا حلقوم کو

پکڑ کر جھٹکا دیتا ہے۔ اگر شیر نے گردن کو اوپر سے پکڑا ہے تو گردن کو سیدھے نیچے نہیں دباتا بلکہ گردن کو بل دے کر نیچے کی طرف دباتا ہے۔ اور اگر حلق کے پاس سے پکڑا ہے تو جانور کی گردن کو اس طرح زمین کی طرف دباتا ہے کہ جانور کے سینگ زمین سے لگ جاتے ہیں۔ گردن کا اتنا مروڑنا اور جھٹکنے کی طاقت گردن توڑ دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور اگر گردن نہ بھی ٹوٹے تو دم گھٹ جانے کی وجہ سے بھی جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

شیر کی جھنجھوڑ کی بابت یہ بات ضرور لکھنا پڑے گی کہ وہ اس قدر شدید ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے جانور کی ہڈیوں کے جوڑ اپنی جگہ سے الگ کر دیتی ہے اور وہ انچ بھر بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ ہم لوگ گھاس کے ایک ٹکڑے کو ہاتھیوں سے ہنکوار ہے تھے، اس میں دو شیروں کی موجودگی بتائی جاتی تھی۔ اس گھاس میں سے ایک بہت بڑا شیر اُٹھا جس پر گولیاں چلیں اور گھاس کے دوسرے قطعے میں گھس گیا۔ ہم لوگوں نے اس گھاس کو گھیر کر پھر اس کا ہانکا کرایا۔ اس مرتبہ اس نے میرے ہاتھی پر چارج کر دیا اور پیچھے آ کر میرے ہاتھی کے پیر کو ہیم اسٹرنگ کرنے کے طریقے پر منہ سے پکڑ لیا۔ لیکن ہاتھی شیر کے زور لگانے پر بھی نہ گر سکا کیونکہ ہاتھی کے پیر کی بناوٹ دوسرے جانوروں کے پیروں کی بناوٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ شیر کے زور لگانے پر ہاتھی چلتے چلتے رُک گیا۔ دوبارہ شیر کے زور لگانے پر ہاتھی کھڑے سے بیٹھ گیا۔ ہاتھی کا وہ پیر جو شیر پکڑے ہوئے تھا، پیچھے کو کافی پھیل گیا۔ تیسری مرتبہ شیر کے زور لگانے پر ہاتھی اس پیر کی طرف جس کو شیر کھینچ رہا تھا، ترچھا ہو کر جھکنے لگا۔ ہاتھی کے ترچھا ہونے پر ہی شیر مجھے دکھائی دے سکا۔ اس وقت اس پر گولی چلائی۔ ہیم اسٹرنگ کر کے شیر کو شکار کرتے ہوئے بہت کم موقعوں پر دیکھا گیا ہے۔ شیر چاہے جانور کو ہیم اسٹرنگ کر کے گرائے یا اپنے اگلے ہاتھوں کی طاقت سے، جانور کے پچھلے پٹھے کو پکڑ کر اور دبا کر گرائے، اس کو مارنے کے لیے حلق کو پکڑنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ شیر نے جانور کو چاہے کسی طریقہ سے بھی گرایا ہو، گردن ضرور پکڑی ہے اور تب تک پکڑے رہا ہے، جب تک کہ جانور مر نہیں گیا۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شیر جانور کے جھٹکے کی وجہ سے خود بھی زمین پر گر گیا لیکن شیر نے اس کی گردن جس کو وہ منہ میں بھرے ہوئے تھا، نہیں

چھوڑی، اور لیٹے لیٹے گردن کو برابر مروڑتا رہا، یہاں تک کہ جانور مر گیا۔

شیر بہت ذہین اور چالاک جانور ہے۔ یہ شکار صرف مذکورہ طریقوں سے ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے شکار کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، جن کو وہ موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتا رہتا ہے یا اس کو تجربہ سے سیکھ لیتا ہے، جب کہ دوسرے شیر اس طریقہ سے واقف نہیں ہوتے۔

اینڈرسن (Anderson) اپنی کتاب 'یہ جنگل ہے' (This is the Jungle) میں ایک ایسے ہی انوکھے طریقے سے ایک شیر کے شکار کا قصہ لکھتا ہے جو گوروں، جنگلی بھینسوں (Bison) کو غصہ دلا کر ان کو اپنے اوپر حملہ کرنے پر مجبور کر دیتا تھا، اور جب گوڑ اپنی پوری طاقت سے شیر کو ٹکر مارنے کے لیے دوڑتا ہوا آتا، تو شیر خود اس موٹے تنے والے درخت سے، جس کے پاس بیٹھ کر وہ بہت بھیانک آوازیں نکالتا تھا، ایک طرف کو ہو جاتا اور گوڑ اپنے زور کی وجہ سے رُک نہ پاتا اور اس کا سر درخت کے تنے سے بہت زور سے ٹکراتا۔ شیر وہاں سے ہٹ کر پھر کسی دوسرے موٹے درخت کے نزدیک جا کر دہاڑتا۔ گوڑ پھر ٹکر مارتا۔ شیر بار بار یہ عمل کرتا جب تک کہ گوڑ کا سر خود بخود پاش پاش نہ ہو جاتا۔ اس طرح گوڑ ٹکریں مار مار کر مر جاتا تو شیر اس کو کھانے لگتا۔

شیر کی غذا

شیر گوشت خور جانور ہے۔ یہ بلا تخصیص سفید، کالا، ملائم، باسی، تازہ یا سڑا ہوا، بلکہ کیڑوں بھرا گوشت تک کھاتے دیکھا گیا ہے۔ شیر، شیر کو بھی کھا لیتا ہے بلکہ اپنے بچوں تک کو نہیں چھوڑتا۔ گلدار کو بھی بڑی صفائی سے کھا لیتا ہے، یہاں تک کہ ریچھ، لکڑ بگے، گیدڑ، بھیڑیے، غرض گوشت کی قسم سے کسی چیز کو نہیں چھوڑتا۔

اکثر تالابوں میں مینڈک پکڑ کر بھی شیر کو کھاتے دیکھا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ شیر گوبر بھی کھاتا یا چوستا ہے۔ چڑیاں بھی شیر کی دست درازی سے نہیں بچ پاتیں۔ جنگلی مرغ، مور، تیتر اور دیگر چھوٹی چڑیوں کو بھی بہت رغبت سے کھاتا ہے۔ شیر مچھلیاں بھی

کھاتا ہے۔ جوائے ایڈمسن (Joy Adimson) ایلسا (Elsa) کو اکثر مچھلیاں مار کر کھلاتی تھی۔ رینگنے والے کیڑے جیسے چوہے، گوہ اور سانپ بھی شیر کھا جاتا ہے۔ چتی سانپ جس کو Python بھی کہتے ہیں، شیر کو کھاتے دیکھا گیا ہے۔ گدھے، گھوڑے، اونٹ بھی کھا لیے جاتے ہیں۔ اینڈرسن کا کہنا ہے کہ شیر ہاتھی کو بھی کھا لیتا ہے، لیکن ہاتھی کا شکار گوشت کے لیے نہیں کرتا۔ اگر مرا ہو ہاتھی مل جائے تو کھانے سے گریز نہیں کرتا۔ ناسمجھ نوعمر شیر اکثر سیہی (Porcupine) کو کھانے کے لیے مارنے کی کوشش کرتے ہیں اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ پھر سیہی کے جسم پر موجود تیر جیسے کانٹوں سے زخمی اور کمزور ہو جانے کے بعد آدم خور بن جاتے ہیں۔ سمجھدار اور بالغ شیر چاہے کتنے ہی بھوکے کیوں نہ ہوں، کبھی سیہی کو مارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جنگل میں صرف یہی جانور ایسا ہے جو شیر کی دست بُرد سے محفوظ ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ شیر صرف اپنا مارا ہوا شکار کھاتا ہے۔ شیر دوسروں کا شکار بھی ہضم کر جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی دوسروں سے زبردستی ان کا شکار چھین بھی لیتا ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے، جو میرے ساتھ گزرا، ثابت ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ ہم لوگ ایک ایسی جگہ شکار کھیل رہے تھے جہاں بندھ باندھ کر ایک دریا کو ایک چھوٹے سے ڈیم کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ بندھے کافی اونچے تھے، جن کو قریب کی مٹی نکال کر بنایا گیا تھا۔ اسی لیے ان بندھوں کے درمیان جو جگہ بچی تھی وہ کافی نشیبی ہو گئی تھی جن میں چھپ چھپا پانی بھرا رہتا تھا۔ اور بہت سخت قسم کی گھاس جس کو کلک کہتے ہیں، بہت گھنی اُگی ہوئی تھی۔ ان بندھوں کے گورکھ دھندوں میں ایک غول دس بارہ چیتلوں کا دکھائی دیا۔ ہم تین ساتھی تھے۔ ان چیتلوں کو گھیر لیا گیا۔ چیتلیں ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک نشیب میں اُتر گئیں اور وہاں سے دوسرے بندھے پر چڑھنا شروع کیا۔ جس بندھے پر چڑھ کر چیتلیں بھاگنا چاہتی تھیں، وہ بندھا ہمارے ایک دوست کی زد پر تھا۔ اب جو چیتل نیچے گھاس میں سے نکل کر بندھے پر چڑھتی، ہم اپنی رائفل سے اس کو گرا لیتے۔ اس طرح تین فائر ہوئے اور تین چیتلیں گر پڑیں۔ میں ذرا ان سے دور دوسرے بندھے پر تھا۔ میں نے جو تڑاتڑ تین فائروں کی آوازیں سنیں تو ان فائروں کی طرف بھاگا تاکہ معلوم کر سکوں کہ گولیوں کی

بارش کس جانور پر ہو رہی ہے، کیونکہ اس بندھ پر دو تین شیر بھی رہتے تھے۔ جب میں جائے وقوع پر پہنچا تو دیکھا کہ ہمارے دوست چوتھے فائر کی تیاری کر رہے تھے اور ایک اور چیتل بندھے پر چڑھ رہی تھی ۔ میں نے آواز دے کر ان کو فائر کرنے سے روکا۔ وہ رُک گئے اور باقی چیتلیں ہمارے سامنے بندھے پر چڑھ کر دوسری طرف غائب ہوگئیں۔ اب سوال تھا ان چیتلوں کو ذبح کرنے کا۔ ان پڑی ہوئی چیتلوں کو ذبح کرنے پر کوئی تیار نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو بڑی بڑی گھاس، پھر چھپ چھپا پانی، تیسرے وقت شام کا۔ خیر یہ نیک کام کسی نہ کسی کو تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا میں اور ایک صاحب اور نیچے اُترے اور دو چیتلوں کو ذبح کیا۔ لیکن تیسری نظر نہیں آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر گھاس کو پھاڑا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کہیں آگے نہ رینگ گئی ہو۔ میں نے جیسے ہی گھاس کو پھاڑ کر آگے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شیر جس کی نو جوانی کی عمر ہوگی، تیسری چیتل کو اپنے منہ میں دابے، جیسے بلّی چوہے کو دابتی ہے، خراماں خراماں ہم کو دیکھتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ہم اپنی بندوقیں ان چیتلوں کے پاس، جن کو ذبح کیا تھا، چھوڑ آئے تھے۔ ہاتھ میں صرف چاقو تھا۔ ہم منہ پھاڑے شیر کو دیکھتے رہے کہ ہمارا شکار لیے کس شان سے سر بلند کیے چلا جا رہا ہے۔

یہ بات بہت انوکھی معلوم ہوگی اگر یہ بتایا جائے کہ شیر پتے ۔ گھاس اور پھل بھی کھاتا ہے جو اس کے فضلے کی جانچ کے بعد معلوم پڑا۔ یہ واقعہ البتہ ہندستانی شیروں کا نہیں۔ یہاں کے شیر صرف گوشت کھاتے ہیں، نباتات نہیں۔

شیر میں سونگھنے کی حِسّ

خدا نے ہر ذی روح کو پانچ مختلف حواسوں سے نوازا ہے جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے لیکن جانوروں میں عموماً ان میں سے صرف تین حواس پائے جاتے ہیں اور وہ ہیں:

۱:۔ قوت شامہ سونگھنے کی طاقت

۲:۔ قوتِ باصرہ دیکھنے کی طاقت

۳:۔ قوتِ سامعہ سننے کی طاقت

شیر بھی ان تینوں قوتوں کا حامل ہے لیکن دیکھنے اور سننے کی قوت شیر میں اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ رکھی ہے۔ سونگھنے کی قوت سے متعلق بڑے بڑے محققین اور شکاریوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت ہوتی ہے جب کہ کچھ کا کہنا ہے کہ بالکل نہیں ہوتی۔ سائنس کی اس قدر ترقی اور شیر پر اتنی تحقیق کے بعد اب اس اختلاف کا سلسلہ بالکل ختم ہو جانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں راجہ صاحب کئی واقعات بتاتے ہیں جس سے وہ ثابت کرتے ہیں کہ شیر میں سونگھنے کی قوت ہوتی ہے اور جس کا استعمال وہ شکار کی تلاش میں کرتا ہے اور رات کو خطرے کا احساس کرنے میں بھی کرتا ہے۔

شیر جنگل کا وہ جانور ہے جس کو جنگل میں کسی دوسرے جانور سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تقریباً نہ کے برابر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عادتیں جنگل کے دوسرے جانوروں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ دوسرے جانور چونکہ شیر کی غذا ہیں اور اس کا لقمہ بنتے رہتے ہیں، اس طرح سے ان کی عادتیں بالکل الگ ہوتی ہیں۔ دوسرے جانور کیونکہ شیر کی غذا ہیں اور اس کا لقمہ بنتے رہتے ہیں، اس وجہ سے خدا نے ان کو اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے مختلف قسم کی قوتیں دے رکھی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں سینگ، کُھر، سننے کی طاقت، دیکھنے کی طاقت، سونگھنے کی طاقت اور بھاگنے کی طاقت۔ وہ جانور جن کو شیر سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، ان میں خاص طور سے سونگھنے کی قوت سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگلی بھینسا تین میل دور سے خطرے کی بُو پا کر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ ہاتھی ایک میل تک سونگھنے کی قوت رکھتا ہے۔

چیتل، سانبھر اور اس قبیل کے تمام جانور، چاہے وہ ڈیئر ہوں یا اینٹی لوپ، سونگھنے کی قوت سے پوری طرح مسلح ہوتے ہیں۔ اکثر جنگل کے ٹکڑوں کو ہنکواتے وقت دیکھنے میں آیا ہے کہ چیتل شکاریوں کی لائن کے بہت قریب آجاتے ہیں لیکن لائن کو کراس نہیں کرتے۔ بلکہ کھڑے ہو کر اپنا منہ اونچا کر کے سونگھنا اور کُھروں کو زمین پر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ انہوں نے شکاریوں کی بُو، جو زمین پر یا مچان پر چھپے بیٹھے ہیں، سونگھ لی ہے اور وہ درپیش خطرے سے پوری طرح واقف ہو گئے ہیں، لیکن مجبوراً وہ پیچھے نہیں لوٹ سکتے کیونکہ پیچھے ہانکے والے ڈھول، خالی کنستر اور کلہاڑیاں درختوں پر پیٹتے بڑھے چلے آرہے ہیں

اب صرف آگے ہی جا سکتے ہیں۔ یہ جان لینے کے باوجود کہ آگے خطرہ ہے، لیکن چونکہ ابھی خطرہ دیکھا نہیں ہے، صرف بُو سونگھ کر ہی محسوس کیا ہے اور ان کے کانوں نے بھی آگاہ نہیں کیا ہے، اس لیے وہ شکاریوں کی لائن کے قریب آکر اتنی تیزی سے بھاگتے ہوئے لائن کراس کرتے ہیں کہ ان پر گولی چلانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہوتا۔ صرف بہت تیز دست شکاری ہی ان پر گولی چلا سکتے ہیں۔ دوسری طرف بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ یہی چیتل بہت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے شکاریوں کی لائن کو کراس کر گئے، اس کی وجہ صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ ایسی حالت میں ہَوا کا رُخ بدلا ہوا ہوتا ہے، یعنی وہ جنگل کی طرف سے شکاریوں کی طرف چل رہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے چیتل شکاریوں کی بُو نہیں پا سکتے۔ اس بات کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جانوروں میں سونگھنے کی قوت، ان کے لیے قوتِ مدافعت بھی ہے۔

شیر کو کبھی اپنی مدافعت یا بچاؤ کی ضرورت کسی جانور سے نہیں پڑتی، اس وجہ سے وہ اس قوت کا استعمال نہیں کرتا اور شکاری اس کا مشاہدہ نہیں کر پاتے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس طاقت کا استعمال کم کیا جائے گا وہ کمزور ہو جائے گی۔ وہ لوگ جو عقل کے مقابلہ میں طاقت اور ہاتھ پاؤں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں، ان میں عقل کم اور طاقت زیادہ ہوتی ہے، بر خلاف اس کے جو عقل کا استعمال زیادہ کرتے ہیں، ان کے دوسری قوٰی کمزور ہو جاتے ہیں۔

شیر چونکہ اس قوت کا استعمال شاذ ہی کرتا ہے، اس لیے اس کو اس کی ضرورت شکار میں بالکل نہیں پڑتی، اسی وجہ سے چند شکاریوں نے شیر میں اس قوت کا فقدان بتایا جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ شیر میں سونگھنے کی قوت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ شیر کی دُم کی جڑ میں دو غدود گردوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ غدود نر اور مادہ دونوں میں پائے جاتے ہیں جن کو اینل گلینڈز (Analglands) کہتے ہیں۔ ان غدودوں میں پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد ایک سخت قسم ک بدبودار مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ نے چڑیا گھروں میں یا شیر کے کٹہروں میں اس بدبو کو ضرور محسوس کیا ہو گا۔ شاید آپ نے اس تیز بدبو کو سڑے ہوئے گوشت اور فضائل کے امتزاج سے نکلنے والی بدبو سمجھا ہو، جو ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

قدرت کا کوئی کام بلا مقصد نہیں ہوتا۔ شیر میں بھی یہ غدود بغیر مقصد نہیں ہیں۔ ان

غددوں میں گاڑھے تیل کی طرح ایک رقیق مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ شیر اس مادّے کو، جب وہ جنگل کے اپنے راستوں پر چہل قدمی کرتا ہے، تو رُک رُک کر درختوں اور جھاڑیوں پر اسے چھڑکتا چلتا ہے، ٹھیک اس طرح جس طرح فلٹ کی پچکاری سے گھروں میں فلٹ چھڑکی جاتی ہے، بالکل اسی طرح وہ اپنی دُم اٹھا کر اور پچھلے حصہ کو درخت یا جھاڑیوں کی طرف کر کے یہ چھڑکاؤ کرتا چلتا ہے۔

محققین کی رائے ہے کہ شیر اس طرح کی بُو سے اپنی حکومت کی حدود قائم کرتا ہے، تاکہ دوسرے شیر اس کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شیر اس مادّہ کو چھڑکتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا شیر اس راستہ پر آ گیا۔ اس نے اس بُو کو محسوس کیا اور اس جھاڑی کے پاس جس پر پہلا شیر چھڑکاؤ کر گیا تھا، پہنچا۔ جھاڑیوں کو سونگھا، سونگھ کر بہت بُرے بُرے منہ بنائے، بلکہ کچھ عجیب سی آوازیں بھی نکالیں اور دوسری سمت بھاگتا ہوا چلا گیا۔ اگر شیر میں سونگھنے کی قوت نہیں تھی، تو قدرت کو کیا پڑی تھی کہ وہ اتنا پھیلا وَ پھیلاتی کسی اور طرح سے بھی ان کی سلطنت کی حدود مقرر کرا سکتی تھی۔

میں، جیسا کہ بتا چکا ہوں، اس سلسلے میں، راجہ صاحب کے علاوہ دوسرے مصنفوں کی رائے بھی پیش کر رہا ہوں، جن میں نامور شکاری اور مشاہدہ کار شامل ہیں۔ ان میں جوئے ایڈمسن (Joy Adimson) کی رائے سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ افریقہ کے جنگلوں میں رہ کر شیروں اور گلداروں کے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے میں صَرف کیا ہے۔ انہوں نے شیروں اور دوسرے جنگلی جانوروں میں اپنی آنکھوں سے، ان کے پَل پَل بھر کے تغیر اور تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ ان کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت سے واقفیت پیدا کی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی مزاج داں ہوتی ہے، یہ بھی شیر اور گلدار کی مزاج داں تھیں۔ دوسری شخصیت ہے جی۔بی۔شیلر (G.B.Scheller)۔ انہوں نے ہندستان کے مختلف نیشنل پارکوں میں رہ کر جنگلی جانوروں اور شیر کا مشاہدہ کیا اور ان پر ریسرچ کی۔ ان کا شیروں کا مشاہدہ باون گھنٹہ کا ہے، جو کہ ایک بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ برینڈر (Brender)، چمپئن (Champion)، بیکر (Baker)، پاویل (Powell)،

پیکاک (Peacock)، قطب یار جنگ، حکیم الدین ،کاربٹ (Carbet)، اینڈرسن (Anderson)، ای۔پی۔گی۔ (E.P.Gee)، کرنل کیسری سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی جنگل میں گزری، شکار کھیلا اور بہ نظر غائر جنگل کے جانوروں کی عادات اور خصائل کا مشاہدہ بھی کیا۔ ایسے لوگوں کی رائے سے اختلاف کرنا ممکن ہی نہیں۔

سب سے پہلے جوئے ایڈمسن کی رائے سُنیئے جوانہوں نے شیر کے سونگھنے کی قوت کے بارے میں لکھی ہے۔

''ایلسا کی عمر تقریباً اٹھارہ مہینہ گزرنے کے بعد، میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایلسا میں وقتی طور سے ایک خاص قسم کی تیز بُو پیدا ہو گئی ہے جو اس کی دُم کے پیچھے پیدا ہونے والے ان گلینڈس سے نکلتی تھی جن کو Anal Glands کہتے ہیں۔ وہ اس مادّے کو جس میں بہت تیز بُو ہوتی تھی، درختوں پر چھڑکتی تھی۔ حالانکہ یہ بدبودار مادّہ اس کے جسم سے ہی خارج ہوتا تھا، لیکن وہ اس بُو کو سونگھ کر ہمیشہ ناک سکوڑ لیتی تھی۔'' کیا اتنے واضح ثبوت کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت رہتی ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کاربٹ اور اینڈرسن شیر کو Smell Blind کہتے ہیں، جیسا کہ ان دونوں نے اکثر جگہ لکھا ہے۔

کاربٹ اپنی کتاب مائی انڈیا (My India) میں لکھتا ہے As tigers have no sense of smell، یعنی شیروں میں سونگھنے کی تمیز نہیں ہوتی۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں وہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''ایک عورت کی لاش، جس کو شیر نے ہلاک کیا تھا، کمبل میں لپیٹ کر ایک اونچے درخت پر رکھ دی گئی۔ شیر نے اس لاش کر اُتار لیا۔'' کاربٹ کا کہنا ہے کہ چونکہ شیر نے لاش کو درخت پر رکھتے دیکھ لیا ہوگا، اس وجہ سے اس کو اُتار لیا، ورنہ اس میں سونگھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ کاربٹ کی یہ بات چاہے شیر کے سونگھنے کی قوت کے فقدان پر دلالت کرتی ہو یا نہ کرتی ہو، لیکن یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ شیر درختوں پر چڑھ سکتا ہے۔

اینڈرسن نے اپنی کتاب میں یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ لکھی ہے کہ شیر میں

سونگھنے کی قوت بالکل نہیں ہوتی۔ اپنی بات کو تقویت دینے کے لیے وہ ایک واقعہ بھی لکھتا ہے۔
ایک مرتبہ اینڈرسن ایک پہاڑی علاقہ میں ایک آدم خور شیر کو مارنے گیا۔ یہ شیر ایک نالہ (گدیلے) کے ذریعہ پہاڑ سے اُترتا تھا۔ اس گدیلے کے نکاس پر ایسا کوئی درخت نہ تھا جو مچان کے لائق ہوتا، اس وجہ سے بیٹھنے کے لیے ایک چٹان کا انتخاب کرنا پڑا اور چھپنے کی غرض سے کچھ جنگلی گلاب اور دیگر خاردار جھاڑیوں کی ٹہنیوں کو کاٹ کر ایک ہائڈ (Hide) بنانا پڑا۔ اس ہائڈ کا منہ نالے کی طرف رکھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شیر اسی طرف سے آئے گا۔ اینڈرسن کافی دیر اس جھونپڑی نما آڑ میں بیٹھا رہا اور شیر کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن شیر نہیں آیا۔ یہ اس جگہ سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اس کے کان میں 'جنگل کے چوکیدار جانوروں' کی آواز آئی۔ یہ سمجھ گیا کہ شیر اپنے رہنے کی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اب کچھ ہی دیر جاتی ہے جو وہ سامنے سے نیچے اُترے گا۔ اس بات کو بھی کافی وقت گزر گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی، جانوروں نے آوازیں دینا بند کر دیں۔ اس نے خیال کیا کہ شاید شیر کسی اور طرف نکل گیا ہے۔ یہ ایسے ہی خیالات میں غرق بیٹھا تھا کہ یکایک اس کو اپنی گدی یعنی سر کے پچھلے حصے پر گرم ہوا کا جھونکا سا لگتا محسوس ہوا۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ گرم ہوا کس کی ہے۔ کیوں کہ علاقہ پہاڑی تھا اور وقت بھی شام کا، ایسے وقت میں اس جگہ گرم ہوا کے کیا معنی۔ غرض اسی شش و پنج میں اس نے اپنی گردن کو پیچھے موڑا تو دیکھا کہ ایک شیر اس کی ہائڈ کی دیوار سے لگا بیٹھا ہے اور اس کے منہ سے نکلنے والی گرم بھاپ، جب وہ سانس لیتا ہے تو اس کی گردن پر لگتی ہے۔ اینڈرسن کا کہنا ہے کہ "یہ وہی آدم خور شیر تھا جس کو میں مارنے آیا تھا۔ شیر اتنے قریب بیٹھے رہنے کے باوجود اس کی بو نہیں محسوس کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیر میں سونگھنے کی قوت بالکل نہیں ہوتی۔"

میں اینڈرسن کی اس رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ میری رائے میں یہ کافی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ شیر کی دوسری عادتیں بھی اس سلسلہ میں کافی وزن رکھتی ہیں۔ شیر کا جب پیٹ بھرا ہو تو وہ کشت و خون کرنے کا عادی نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اینڈرسن نے جب اس شیر کو دیکھا ہو تو وہ اسی وقت اس کے

ہائڈ کے پاس آ کر بیٹھا ہو۔ممکن ہے کہ اس وقت اس کی توجہ کسی دوسرے شکار پر مرکوز ہو، اس وجہ سے وہ اینڈرسن کو نظر انداز کر گیا ہو۔یا ممکن ہے کہ اس وقت ہوا کا بہاؤ اینڈرسن کی طرف سے شیر کی طرف نہ رہا ہو اس لیے اس نے اینڈرسن کی موجودگی محسوس نہ کی ہو۔

اینڈرسن اپنی کتاب ''انڈین جنگل'' میں مزید لکھتا ہے:

''جب کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ شیروں میں سونگھنے کی طاقت بہت کمزور ہوتی ہے، میں اس بات سے ہرگز پریشان نہیں تھا۔ میری پریشانی کا باعث جو تھا وہ یہ تھا کہ کہیں آدم خور میری موجودگی کا پتہ دیکھ کر یا سُن کر نہ لگا لے۔''

اس بات کو لکھ کر اینڈرسن نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیر کی دیکھنے اور سننے کی طاقتیں بہ لحاظ سونگھنے کے بہت زیادہ تیز اور قوی ہوتی ہیں، اور وہ اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے ان ہی دونوں طاقتوں کی مدد سے اپنے بچاؤ کے مناسب طریقوں پر عمل کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں E.P.Gee اپنے دامن کو بہت محتاط طریقہ سے بچاتے ہوئے لکھتا ہے۔

''دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی سونگھنے کی قوت بہت اچھی ہوتی ہے۔لیکن یہ اس کا استعمال نہیں کرتا یا اس کو اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی، کیونکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ اس کے سُننے اور دیکھنے کی قوتیں قابل ذکر ہیں۔''

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، جانور سونگھنے کی قوت کا استعمال دشمن سے بچنے کے لیے کرتے ہیں۔ شیر کا جنگل میں کوئی دشمن نہیں اور نہ ہی اس کو کسی کا خوف اور ڈر ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ اس قوت کا استعمال نہیں کرتا۔لیکن کبھی کبھی شیر کو بھی اس قوت کے استعمال کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ بھی اپنی اس صلاحیت کا پورا پورا استعمال کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی ایک موٹی مثال یہ ہے کہ جب شکاری اپنا پڈا کسی ایسی جگہ جہاں مچان باندھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ہو، دیتا ہے اور شیر پڈے کو مار دیتا ہے تو شکاری اس مرے ہوئے پڈے کی لاش کو سڑک پر سوسوا سو گز دور کھینچ کر ایسے مقام پر لے جاتا ہے جہاں مچان آسانی سے بندھ سکتا ہو۔

شیر اپنے مارے ہوئے شکار پر آتا ہے اور لاش کو غائب دیکھ کر چونکتا ہے۔ اب اس کے سونگھنے کی قوت بیدار ہوتی ہے اور وہ اس قوت کی مدد سے سیدھا پڑے کی لاش پر پہنچتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ دیکھنے میں کبھی نہیں آیا کہ شیر کو جب لاش نہیں ملی ہو تو وہ اِدھر اُدھر اس کو تلاش کرتا پھرا ہو۔ وہ سیدھا اس کی بدبو یا خوشبو پا کر بہت محتاط انداز میں اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا کِل (پڑا) لا کر ڈال دیا گیا ہو۔

پرانے شکاریوں کو میں نے اکثر کہتے سنا ہے کہ مچان پر بیٹھ کر کبھی سگریٹ وغیرہ نہیں پینا چاہئے۔ سینٹ اور خوشبو دار تیل کا بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ پان میں خوشبودار تمباکو بھی نہیں کھانا چاہئے، کیوں پیک میں بھی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ اگر شیر کو اس کی نامانوس خوشبو آ گئی تو وہ کبھی پڑے کے نزدیک نہیں آئے گا۔ بعض شکاری تو اس سلسلہ میں اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ کِل کے قریب پیشاب وغیرہ کرنے کو بھی منع کرتے ہیں۔ کیونکہ شیر کے لیے اس کی مہک بھی ایک نئی بُو ہوگی، جو اسے چوکنا کر دے گی۔

حکیم الدین اپنی کتاب 'سیر و شکار' میں لکھتے ہیں۔ "ہمارے پچھم طرف جہاں اس نے لاش کو رکھا تھا، آہستہ آہستہ اترنے لگا اور نالے میں ہم سے قریب تیس قدم پہنچ کر لاش کو نہ پا کر ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ چاروں طرف بڑے غور سے بڑی دیر تک دیکھنے لگا۔ اور گھسیٹن پر آہستہ آہستہ سونگھتے ہوئے آنا شروع کیا۔"

قطب یار جنگ اپنی کتاب شکار میں لکھتے ہیں۔

"اگر شیر لیٹا ہو، تو اس کے اُٹھنے کا انتظار کیجئے۔ اس میں دیر لگنے کا بہت کم امکان ہے۔ بُو، یا کوئی اور قوت یا انسان سے فطری نفرت کا مادّہ شیر کو جلد بیدار کر دیتا ہے۔"

پھر فرماتے ہیں:

"فروری۔ مارچ۔ اپریل شیروں کے لیے ملاپ کا موسم ہے۔ شیر عام طور پر جوڑے کی شکل میں نہیں رہتا۔ جب ان کی بہار کا وقت ہوتا ہے، تو شیرنی کی بُو پر یا اس کی بلند آوازوں پر کئی کئی شیر جمع ہو جاتے ہیں۔"

لیجئے میری تمام کوششیں اکارت گئیں۔ بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی کہ کچھ کی رائے ہے

کہ شیر میں سونگھنے کی قوت ہوتی ہے اور کچھ کی رائے میں نہیں۔ بات یہ ہے کہ شکاری اس سلسلہ میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس کی شکاری زندگی میں شیر کی اس خصوصیت سے اس کا سابقہ نہیں پڑتا، اس وجہ سے سُنی سنائی باتوں کو افسانوی انداز میں لکھ دیتے ہیں۔

قطب یار جنگ صرف شکاری ہی نہیں تھے، بلکہ ایک محققانہ طبیعت کے مالک بھی تھے۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ وہ اپنی ضخیم کتاب ''شکار'' میں کہیں بھی شیر کی اس صفت کا بیان وضاحت سے نہیں کرتے، صرف اشاروں میں ذکر کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اس کی صرف یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے شیر میں کبھی اس صفت کا مشاہدہ خود نہیں کیا، یا پھر اُسکا اتفاق نہیں ہوا، یا اس وقت شکاری لٹریچر میں یہ شیر کی صفت، متنازعہ رہی ہو، اس لیے انہوں نے اس بحث میں شامل ہو کر پارٹی بننا پسند نہ کیا ہو۔ جوئے ایڈمسن اور شیلر اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے ہونگے کیوں کہ ان کی کتاب ''شکار'' اب سے اَسّی سال پہلے لکھی گئی اور ان لوگوں نے اپنی ریسرچ ۱۹۶۵ء میں کی۔ قطب یار جنگ ایک ذمہ دار آفیسر، نیک اور ایماندار انسان تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں کوئی بات لغو یا صرف سُنی سنائی نہیں لکھی، جب تک کہ خود اس کی تحقیق نہ کر لی ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے شیر کی اس قوت کا ذکر نہیں کیا۔

حکیم الدین صاحب کی طبیعت میں تجسس اور مشاہدہ کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ آپ کی کہی ہوئی بات ہر اس شکاری نے دیکھی ہو گی جس کا سابقہ اس طرح شیر سے پڑا ہو، یعنی سونگھتے ہوئے لاش پر اس جگہ آنا جہاں سے وہ ہٹا کر دوسری جگہ رکھی گئی ہو، لیکن دوسرے شکاری اس بات پر غور نہیں کر سکے کیونکہ ان کی تمام تر توجہ اس وقت شیر پر گولی چلانے کے موقعے کی تلاش میں رہی ہو گی۔

راجہ ضیاء اللہ صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ اس قسم کے واقعات ہوئے۔ ان کا خیال ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت، بہت زبردست ہوتی ہے اور تجسس کا مادّہ بھی بہت ہوتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر ایک مچان پر بیٹھ گئے۔ شیر آیا لیکن مچان سے کچھ دور اس نے ہاتھی کے پیروں کے نشانات دیکھے۔ وہ ہاتھی کے پیروں کے نشانات کو سونگھتا ہوا کئی

مرتبہ نہر تک گیا اور رکل کے قریب تک واپس آیا۔ آخر اس کو مچان پر بیٹھے شکاری دکھائی دے گئے۔ شیر دریا پر چلا گیا۔ راجہ صاحب کے بھائی نے کہا چلیے واپس چلا جائے۔ شیر نے ہم کو دیکھ لیا ہے اور وہ چلا گیا ہے۔ لیکن راجہ صاحب نے اُن کو اُترنے سے منع کیا اور کہا کہ اگر اب اُترے تو شیر دوڑ پڑے گا۔ وہ بھوکا ہے۔ رکل پر تو نہیں آئے گا لیکن یہاں سے ہٹے گا بھی نہیں۔ ان کے بھائی نہ مانے۔ انہوں نے جیسے ہی اُترنے کی کوشش کی، ویسے ہی شیر نے جھاڑیوں میں سے ان کو ڈانٹا۔ وہ پھر مچان پر چڑھ گئے۔ صبح کو جب شیر چلا گیا تب ہی وہ اُتر سکے۔ لیکن سخت تعجب کی بات ہے کہ کاربٹ اور اینڈرسن ایسے آدمی اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے اور غلط نتیجہ نکال بیٹھے۔

اس سلسلہ میں پھر جوئے ایڈمسن اور شیلر کی کتابوں سے کچھ ایسے حوالے لکھوں گا جن کے بعد کسی اور بحث کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

ایک بار جوئے ایڈمسن نے جہاں ایک شیرنی کو پالا تھا، وہیں ایک مادہ گلدار جس کو وہ 'پی پا' کہتی تھی، کو بھی پالا تھا۔ اس گلدار کی مادہ کو اس نے جنگل میں بچے دینے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کو کھانا دینا جوئے کی ڈیوٹی تھی۔ لہٰذا جوئے روز اس کے لیے کھانا لے کر جنگل جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مقامی بندوقچی شیروں اور دوسرے خطرناک جانوروں سے حفاظت کے مدنظر ضرور ہوتا تھا۔ گلدار 'پی پا' کو جنگل میں تلاش کرنا ایک دقت طلب عمل تھا۔ یہ آدمی اس کام میں بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ ایک مرتبہ سخت بارش کے موسم میں جوئے گلدار کو تلاش کرنے نکلی، لیکن بہت تلاش کے بعد بھی اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ جوئے اس کی تلاش میں منہمک چلی جا رہی تھی کہ اس کے ساتھی شکاری نے اس کو کندھا پکڑ کر روک دیا۔ رُکنے پر اس نے دیکھا کہ دو شیر آگے گھاس میں اس کو گھور رہے ہیں۔ جوئے ان شیروں کو دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ وہی شیر ہیں، جن کو اس کے شوہر جارج نے پالا تھا۔ شیر، جوئے کو دیکھ کر دوسری طرف چلے گئے۔ جوئے ان کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ یہ شیر اپنے علاقے سے اس علاقہ میں شکار کی تلاش میں آئے ہوں گے کیوں کو جس علاقہ میں وہ رہتے تھے وہاں بارش کی زیادتی کی وجہ

سے شکار کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ کسی اونچے علاقے میں جس میں دلدل نہ ہوں، آگئے تھے۔ یہ جگہ 'پی پا' کے رہنے کی جگہ تھی۔ یہ شیر جوئے کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتے تھے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''ان شیروں کی موجودگی بہت پریشانی کا سبب ہوسکتی تھی کیونکہ پی پا کو اگر موٹر کا ہارن بجا کر بلایا جائے، جیسا کہ ہوتا رہا ہے تو ان شیروں کی موجودگی میں ممکن نہیں۔ یہ شیر جو اس کے شوہر جارج کے پالتو گلّے کے تھے، موٹر کے ہارن کو بخوبی پہچانتے تھے، کیونکہ جوئے ایڈمسن جب کبھی جارج سے ملنے جاتی، تو ہارن سے سگنل دیتی تھی۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ وہ گوشت کی بُو پر بھی آسکتے تھے۔ جو وہ پی پا کو کھلانے کے لیے لائی تھی۔ اس طرح وہ پی پا تک بہت آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔

کیا یہ اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ شیر سونگھنے کی طاقت کا حامل ہوتا ہے۔

اب دوسری مثال دیکھیے:۔ اپنی پالتو شیرنی کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

''ایلسا (Elsa) کی حرکتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرا چھپ چھپ کر بچوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتی ۔ اس وجہ سے جیسے ہی وہ میری خوشبو کو محسوس کرتی، ویسے ہی اپنے پنجوں کو تیز کرنے کے لیے درخت پر رگڑنا شروع کر دیتی ہے''۔

ایک اور جگہ وہ مادہ گلدار 'پی پا' کے بارے لکھتی ہیں:

''دراصل گھاس میں لگی آگ پی پا کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ لیکن بچے دھویں اور آگ کی معمولی سی خوشبو سے بھی سہم جاتے تھے اور خاص کر سنبو جو ہمیشہ چوکنا رہتے ہوئے ہوا کو سونگھتا رہتا تھا''۔

مادہ گلدار نے سونگھنے کی قوت سے کام لے کر جنگل میں آگ کے لگنے کا پتہ لگا لیا، کیونکہ آگ اس کو اور اس کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ جو لوگ افریقہ کے گھاس کے میدانوں اور جنگلوں سے ذرا سی بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ وہاں کی آگ کی تباہ کاریوں سے بھی واقفیت رکھتے ہوں گے کہ وہ کتنی تباہ کُن ہوتی ہے۔ جو جانور اس میں گھر جاتے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بہت دور سے دھویں کی بُو سونگھ کر وہ محفوظ جگہوں کی طرف فرار ہو

جاتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت ہوتی ہے اور یہ اس کی مدافعت کی قوت بھی ہے، جارحانہ قوت نہیں۔ شیر کی مدافعانہ قوت کا مشاہدہ شکاری نہیں کرسکتا۔ لیکن محققین کرتے ہیں یا دوسرے وہ لوگ کر سکتے ہیں جو جنگل میں رہتے ہیں جن کو شیر سے ہر وقت سابقہ پڑتا رہتا ہے، وہ شیر کی اس خوبی سے ضرور واقفیت رکھتے ہوں گے۔ کیوں کہ انہیں شیر کی ہر خصوصیت سے سابقہ پڑ چکا ہوگا۔ وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنیکے لیے جوان کو صرف جنگل سے ہی مل سکتی ہیں، وہ ہر وقت جنگل میں رہتے ہیں۔ وہ شیر کو سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، شکار کرتے ہوئے، شکار کا پیچھا کرتے ہوئے، اس کو ڈھوک لگاتے ہوئے، جنگل کتوں، ارنا بھینسوں اور ہاتھیوں سے خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہوئے ضرور دیکھ چکے ہوں گے۔ لہٰذا ایسے ہی لوگ شیر کی تمام خصوصیات سے واقف ہو سکتے ہیں۔

جی۔ بی۔ شیلر لکھتے ہیں۔ ایک شیر نے ایک گائے کو ۱۶ اکتوبر کو زخمی کیا۔ وہ گائے ۴ نومبر کو مر گئی۔ اس کی لاش کو گاؤں والوں نے پانچ فٹ گہرا گڑھا کھود کر گاڑ دیا اور اس گڑھے کو مٹی سے پاٹ کر، کانٹے دار جھاڑیوں سے ڈھک دیا۔ ایک شیرنی نے اس گڑھے کو کھود کر گائے کی لاش کو نکالا، اور اس نے اور اس کے چاروں بچوں نے مل کر اس کو کھالیا۔

کیا شیرنی اس گائے کی لاش کا پتہ سوائے سونگھ کر اور کسی طریقہ سے بھی لگا سکتی تھی؟ کیا وہ لاش کو گاڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی؟ اور گاڑنے کے کئی دن بعد مٹی کو پنجوں سے کھودا اور گائے کی لاش کو نکال کر کھا گئی۔

کرنل کیسری سنگھ اپنی کتاب "راجستھان کے شیر" (The Tiger of Rajisthan) میں شیر کے سونگھنے کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھتے ہیں اور اس سے یہ بات ثابت کر دیتے ہیں کہ شیر اس خصوصیت سے مسلّح ہوتا ہے۔ پہلے ان کی رائے سنئے، پھر واقعہ لکھا جائے گا۔

راجستھان کے راجہ شیر مارنے کے لیے نئی نئی جدتیں ایجاد کیا کرتے تھے جو عام شکاری نہیں کر سکتے تھے۔ یہ راجہ کبھی کبھی شیروں کو مچان تک لانے کے لیے گرم شیرنی کا پنجرا

مچان کے قریب رکھوا دیتے ۔ شیر، ہیٹ پر آئی ہوئی شیرنی کی بُو پا کر مچان کے نزدیک شیرنی سے ملنے آتے اور مارے جاتے۔

''جب شیرنی بہار پر ہوتی ہے تو اس کے جسم سے ایک خاص قسم کی بُو خارج ہونے لگتی ہے جس کو سونگھ کر شیر بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ بات آپ پر واضح کر دے گی کہ شیر میں سونگھنے کی قوت خدا کی طرف سے اس کو ملی ہوئی ایک عطیہ اور انعام ہے جس کا استعمال وہ اپنے ہم جنسوں کے لیے بھی کرتا ہے۔ صرف شکار اور دشمن سے نپٹنے کے لیے ہی نہیں کرتا۔ افریقہ کے جنگلوں میں جہاں شیر خاندانوں کی شکل میں یعنی جھنڈ (Pride) بنا کر رہتے ہیں اور جہاں شیروں کی تعداد کبھی کبھی سترہ سے بیس تک پہنچ جاتی ہے، اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی جھنڈ میں ایک ہی وقت میں کئی شیروں نے بچے دیے۔ یہ سب بچے اپنی اپنی ماؤں کے جھنڈ سے الگ ہو کر پرورش پاتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ سب بچے ایک جگہ اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب ان کی مائیں ان کو تلاش کرتی ہوئی اس جگہ پر پہنچتی ہیں تو یہ سب بچے اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ اور مائیں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے رہنے کی جگہوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بچے بدل جائیں۔ ہر ماں اپنے ہی بچوں کو ساتھ لے جائے گی۔ یہ بچے کسی دوسری شیرنی کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے، کہ قدرت نے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان میں ایک حس سونگھنے کی رکھی ہے جو ان حالات اور ایسی صورتوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہی سونگھنے کی قوت ہے جس کی بدولت بچے اپنی ماں کی بو پا کر اور ماں اپنے بچوں کی مخصوص بُو پا کر نہال ہو جاتی ہے۔

کرنل کیسری سنگھ لکھتے ہیں:

''شکاری بعض اوقات شیروں میں سونگھنے کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کبھی کبھی بال چھڑ، یعنی سُنبل (بالوں کی شکل والی سخت لچھے دار گھاس جو بہت خوشبودار ہوتی ہے) کا استعمال شیر کو مارنے کے لیے کرتے ہیں۔ بال چھڑ کی خوشبو بالکل اس خوشبو سے مماثلت رکھتی ہے جو شیرنی کے جسم سے نکلتی ہے، جب وہ بہار پر ہوتی ہے۔ شیر اس خوشبو کو بہار پر آئی ہوئی شیرنی کی خوشبو سمجھ لیتا ہے اور دھوکا کھا جاتا ہے۔

کیسری سنگھ بال چھڑ کی صلاحیت کا ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ ایک شیر کو جو گاؤں والوں کے جانور مارنے کا عادی ہو گیا تھا، مارنا چاہتا تھا۔ ایک راجہ صاحب نے ایک شیر مارنے کی خواہش ان کے راجہ سے کی۔ جس کی اجازت مل گئی لیکن ان کے ریزرو جنگل سے باہر۔ کیسری سنگھ کو اس کا انچارج بنایا گیا کہ وہ دو دن میں اس شیر کو پٹوا دیں۔ کیسری سنگھ کیونکہ اس شیر کی موجودگی اور دوست بُرد سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ کس علاقہ میں مل سکتا ہے، یہ فوراً اس جگہ معائنہ کی غرض سے ایک روز پیشتر چلے گئے کہ جا کر حالات کا جائزہ لے سکیں۔ دوسرے دن راجہ صاحب کو آنا تھا۔ انہوں نے ایک بالکل انوکھی تدبیر اس شیر کے، جو انتہائی چالاک تھا، مارنے کی کی۔ وہ اپنے ساتھ دو تھیلے بال چھڑ (سُنبل) کے لے گئے۔ اور ان کو پانی سے بھگو دیا۔ جب وہ خوب بھیگ گئے تو ایک پُرانے اور بڑے برگد کے درخت پر مچان بندھوالیا۔ اور اس مچان کے ایک سمت ان بھیگے ہوئے تھیلوں کو تقریباً ایک میل کی دوری تک زمین پر کھنچواتے ہوئے گھسیٹوا دیا۔ دوسرا تھیلا دوسری طرف اس کی سیدھ میں گھسیٹوالیا۔ اور شام کو مہمان راجہ صاحب کو اس مچان پر بٹھا کر سامنے ایک پڑے کو بندھوا دیا۔ ایسا کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ شیر جب جنگل کو کراس کرے گا تو اس کو بال چھڑ کی خوشبو ضرور آئے گی اور بہار پر آئی ہوئی شیرنی کا دھوکا کھا کر اس خوشبو کی لائن پر چلا آئے گا۔ ایسا ہونے پر اس کا درخت سے گزرنا ضروری تھا۔ درخت کے قریب پڑے کو دیکھے گا تو پڑے کو کھانے کے لیے اس پر حملہ کرے گا۔ بس یہی وہ وقت ہو گا جب اس پر گولی چلائی جاسکتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کے اندازے کے مطابق ہوا۔ شیر آیا اور مارا گیا۔

شیر کے سونگھنے کی قوت اس کی زندگی میں ایک زبردست رول ادا کرتی ہے۔ اگر شیر میں اس قوت کا فقدان ہوتا تو یہ لازمی تھا کہ شیر اب تک ہندستان کے جنگلوں سے نیست و نابود ہو گیا ہوتا۔ ہندستان کے جنگلات رقبہ کے لحاظ سے کم اور شیر کی غذا کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان جنگلوں میں جانوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ شیر اکثر دو دو۔ تین، تین دن شکار کی کمیابی کی وجہ سے بھوکا رہتا ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی بھوکا شیر کسی دوسرے بھوکے کی حدود

میں شکار تلاش کرتا ہوا اتفاقاً داخل ہو جائے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کیا صورت حال ہو سکتی ہے۔ ان کا آپس میں لڑ بیٹھنا اور پھر ایک یا دونوں کا خاتمہ ہو جانا لازمی امر ہے۔ لیکن قدرت نے ان کی دُم کے پیچھے دو غدود لگا کر، جن سے ایک تیز بدبودار مادّہ خارج ہوتا ہے اور جس کو شیر درختوں اور جھاڑیوں پر چھڑکتا چلتا ہے، یہ مسئلہ حل کر دیا۔ دوسرے شیر اس کو سونگھ کر اس شیر کی حدود کو فوراً چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح شیروں میں عموماً کشت و خون نہیں ہو پاتا۔ اور یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ شیر میں سونگھنے کی قوت بھی ہوتی ہے۔

اس بات کو ختم کرنے سے پہلے G.B. Schaller کے چند جملے ضرور لکھوں گا جو دلچسپی سے خالی نہیں اور میرے استدلال پر دلالت بھی کرتے ہیں۔

''شیر سے خارج ہونے والی بُو اس کے بہت سے کاموں میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ شیر سے خارج ہونے والی خوشبو ہی ہے جو ایک دوسرے کا پیچھا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور ان کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ وہ اس سے اپنے علاقے کی حد بندی کرتے ہیں، جسے سونگھ کر دوسرے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ علاقہ پہلے ہی سے کسی شیر کی سلطنت میں شامل ہے۔ وہ اس کو سونگھ کر یا تو اس علاقے میں رُک جاتے ہیں یا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، جیسا بھی موقع کے لحاظ سے مناسب ہو۔ یہ خوشبو دوسرے شیروں کو، جب وہ اس علاقے سے گزر رہے ہوں مطلع کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ وہ اس خوشبو سے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ آیا اس میں اس وقت شیر ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو یہ علاقہ کتنے عرصہ سے خالی پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ علاقہ کسی شیرنی کا ہو، تو اس میں سے گزرنے والا شیر اس خوشبو کو سونگھ کر معلوم کر لے گا کہ شیرنی بہار پر ہے یا نہیں۔ لی ہوسین اور وولف کا خیال ہے کہ یہ خوشبو جس سے شیر مارکنگ کرتا ہے، شیروں کے ایک دوسرے سے بھڑ جانے کو روکنے میں بڑی مددگار اور معاون ثابت ہوتی ہے یہ خوشبو بالکل ریل کے سگنل کا کام انجام دیتی ہے۔ یعنی:

تازہ نشان ـــــــ سیکشن بند ہے۔ آگے جانا خطرناک ہے۔ لڑائی بھی ہو سکتی ہے۔

کچھ عرصہ پرانے نشانات ـــــــ بہت محتاط طریقہ سے آگے جایا جائے۔

پرانے نشانات ـــــــ جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔

اس سلسلہ میں اتنا بہت کچھ لکھنے کے بعد اب کوئی وجہ نہیں رہ جاتی کہ اس سلسلہ میں آگے کسی مزید بحث کو چھیڑا جائے یا کسی اور کی رائے بطور سند لکھی جائے۔

دیکھنے اور سُننے کی قوت

شیر میں یہ دونوں قوتیں اتنی زیادہ تیز ہوتی ہیں کہ بیان نہیں کی جاسکتیں۔ شیر زیادہ تر اپنی ان ہی دو قوتوں پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے ان ہی سے کام لیتا ہے اور اس کثرت سے ان کا استعمال کرتا ہے کہ یہ قوتیں اُبھر کر بہت مضبوط ہو جاتی ہیں۔

قدرت کا یہ اصول ہے کہ جو قوت زیادہ استعمال کی جائے گی، وہ بمقابلہ دوسری قوتوں کے زیادہ قوی ہو جائے گی۔ شیر کو اپنی غذا یعنی شکار حاصل کرنے کے لیے ان ہی قوتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

شیر، دن میں شکار دیکھنے کی قوت کی مدد سے کرتا ہے اور سُننے کی قوت سے رات میں۔ آپ نے اکثر شیر کو جنگل میں گھومتے پھرتے دیکھا ہوگا۔ اس کی چال میں کتنی متانت اور شان ہوتی ہے۔ یہ رُک رُک کر آہستہ آہستہ اپنی قلمرو میں چلتے ہوئے حدود کی نشان وہی کرتا ہے۔ اس کا رُک رُک کر چلنا درحقیقت اپنے شکار کی سُن گن لینا اور اس کا بھید لینا ہوتا ہے۔ شیر اس طرح سے اپنے آس پاس کی چیزوں کے متعلق جان کاری حاصل کرتا ہے، جو اس کے خوف اور ڈر کی وجہ سے چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

شیر چلتے ہوئے اپنے کانوں کو سکوڑتا اور تانتا ہے جس کو 'کان کھڑے کرنا' کہتے ہیں۔ اس طریقہ سے شیر چلتے ہوئے بھی اپنے پاس کی چیزوں سے باخبر رہتا ہے۔ اس کو ان کی آہٹیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ وہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ کس قسم کی چیزوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ اس کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

شیر کی سننے کی قوت کا اندازہ کرانے کے لیے میں آپ کے سامنے چند واقعات پیش کرتا ہوں۔ شاید ان سے آپ سمجھ سکیں کہ شیر میں یہ قوت کتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

شیر کو جب پڈا کھلا کر مچان سے مارا جاتا ہے تو شکاری اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ مچان اور پڈے میں فاصلہ بیس پچیس گز کا ہو۔ دوسری بات جس کا خیال رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پڈا مچان کے بالکل مقابل سیدھ میں نہ ہو اور مچان سے بائیں طرف کم از کم پینتالیس ڈگری کے زاویہ پر ہو۔ یہ تمام احتیاطیں شیر کی نظر کی تیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا ضروری ہیں۔ اگر یہ طریقہ نہ اپنایا گیا تو سمجھ لیجئے دسیوں پڈے کھلا کر بھی آپ شیر پر گولی نہیں چلا سکتے۔ آپ نے اکثر شکاریوں کو دیکھا یا سنا ہوا گا کہ رات بھر مچان پر بیٹھے رہے اور صبح کو خالی ہاتھ گھر واپس آئے۔

اگر آپ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شیر پڈا کھانے نہیں آیا ہوگا تو آپ غلطی کر رہے ہیں۔ آپ ان سے پوچھیں گے تو یہ بتائیں گے کہ شیر پڈے پر آیا لیکن وہ گولی نہیں چلا سکے۔ کیا وجہ ہوگی جو گولی نہیں چلی۔ وجہ اس کی میں بتاتا ہوں۔ انہوں نے غلطی یہ کی کہ رائفل کو اَن سیف کر کے نہیں رکھا تھا۔ جب شیر پڈے کو کھانے لگا تو انہوں نے سیف اُتارا یا بندوق کے گھوڑے چڑھائے۔ ان سے جو آواز پیدا ہوئی وہ شیر نے سُن لی۔ ان آوازوں کو سُن کر شیر وہاں نہیں رُک سکتا تھا۔ اس وجہ سے وہ گولی نہیں چلا سکے یہ غلطی اکثر ناتجربہ کار شکاری کرتے ہیں جو شیر کی سننے کی طاقت کے متعلق پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ شیر کے لیے جب مچان پر بیٹھا جاتا ہے تو رائفل اور بندوق کے گھوڑوں کو چڑھا کر بیٹھا جاتا ہے۔

شیر کے شکار کا وہ طریقہ جس میں پیدل شیر کا پیچھا کیا جاتا ہے، اسٹاکنگ کہلاتا ہے۔ پیدل شکار میں اپنی بندوقوں کو پوری طرح تیار رکھا جاتا ہے۔ زخمی شیر کو تلاش کرنے کے سلسلہ میں بھی، یا شیر کے رہنے کی جگہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کو وہیں گولی کا نشانہ بنانے کے چکر میں، ایسی صورتوں میں شکاری کو جنگل میں پیدل چلتے ہوئے گھاس، سوکھے پتوں اور درختوں کی گری ہوئی سوکھی لکڑیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ شکاری ان سے بچتا ہوا چلتا ہے۔ بلکہ وہ پیر کے انگوٹھوں کے بل چلتا ہے کیونکہ ان میں سے کسی بھی چیز سے اگر آواز پیدا ہو جائے تو شیر آپ کے آنے کی آہٹ محسوس کر لے گا۔ یہ آواز آپ کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت شیر کے چارج سے آپ کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

میں بھی ایک ایسی ہی غلطی کرنے کی وجہ سے شیر کے چارج اور راجہ صاحب کے غصہ کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری غلطی کسی سوکھی لکڑی کے پیر کے نیچے آ کر ٹوٹنے کی وجہ سے یا پتّوں کے پاؤں کے نیچے آجانے کی وجہ سے، یا گھاس میں سے نکلتے وقت اس کی سرسراہٹ کی آواز کی وجہ سے نہیں تھی۔ میری غلطی یہ تھی کہ میری پتلون کی جیب میں ماچس کی ڈبیا پڑی ہوئی تھی، اس میں تیلیاں کم تھیں، اس وجہ سے وہ بج جاتی تھی۔ یہ آواز شیر نے سُن لی اور وہ چوکنا ہو گیا۔ ماچس کی آواز نے اس کو میری صحیح پوزیشن بتا دی۔ اس آواز کو سنتے ہی وہ دہاڑتا ہوا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ خدا بھلا کرے راجہ صاحب کا جن کی 470 بور ڈبل بیرل وقت پر چل گئی ورنہ میرے لیے تو اس زاویہ پر فائر کرنا اور اس کے جسم کے کسی نازک حصہ کو بیکار کرنا ناممکن تھا۔ میں نے اس روز سے شکار میں ماچس رکھنا چھوڑ دی اور لائٹر رکھنا شروع کر دیا۔

اینڈرسن اور کاربٹ دونوں شیر کو اسٹاکنگ کر کے مارتے تھے۔ یہ دونوں خاص طور سے اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ایسا کرتے وقت پاؤں کے نیچے کسی لکڑی یا سوکھے پتے کی چرمراہٹ کی آواز ہرگز نہیں پیدا ہونی چاہئے بلکہ ایسا کرتے وقت بجائے پیروں کے پنجوں کے بل چلنا چاہئے تاکہ پیروں کے نیچے کم سے کم زمین آئے اور جوتے بہت ملائم ربر کے تلے کے ہوں جن سے آواز بالکل نہ پیدا ہوتی ہو۔ جھاڑیوں کے اندر گھس کر نہ چلنا چاہئے۔ گھاس کی سرسراہٹ نہ پیدا کرنا چاہئے۔ یہ سب شکاری کیونکہ شیر کی قوت سماعت سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے، اس وجہ سے اتنی پیش بندیاں اور احتیاطیں کرتے تھے۔

میں نے خود دیکھا ہے، ایک شیر نے ہماری موٹر سے بتیس پینتیس گز دور ہوتے ہوئے بھی موٹر کے ہینڈل سے نکلنے والی کلک کی آواز، جو دروازہ کھولتے وقت ہوئی، سُن کر چھلانگ لگائی اور گھاس میں غائب ہو گیا۔ ہُوا یوں کہ ایک بلاک بجائے ہماری پارٹی کے نام بُک ہونے کے، راجہ صاحب کے نام بُک ہوا۔ ہم لوگ راجہ صاحب کے بُک بلاکوں میں شکار کھیلنے کم جاتے تھے کیونکہ مہمان بہت ہوتے تھے بلکہ روزانہ نئے نئے مہمان آتے ہی رہتے تھے۔ یہ بلاک جو راجہ صاحب کے نام بُک ہوا تھا، اس میں ہم لوگ بطور مہمان گئے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ مہمان کو بھی پچاس روپیہ فیس دینا پڑتی تھی۔ ہم لوگوں نے روپے راجہ

صاحب کو دے دیے اور کہہ دیا کہ ہماری فیس لکھنؤ یا لکھیم پور ڈی۔ایف۔او۔کے دفتر میں جمع کرا دیں تا کہ ہم لوگ بھی پرمٹ میں شامل کر لیے جائیں۔ ہمارے بھائی صاحب قاعدے قانون کے سخت پابند تھے۔ہم لوگ یہ سب انتظام کر کے رابعہ صاحب کی قیام گاہ سے اپنے گھر واپس آ گئے۔ہم لوگوں کے بلاک میں پہنچنے کی تاریخ کا بھی تعین ہو گیا۔ایک تاریخ کچھ شرائط کے ساتھ طے ہو گئی لیکن نہ جانے کیا وجہ ہوئی کہ بھائی صاحب نے دی ہوئی تاریخ سے ایک روز قبل ہی بلاک میں چلنے کی ٹھانی۔ یہ بلاک ہمارے یہاں سے بہت دور تھا۔سڑک بھی بہت خراب تھی۔راستہ میں شاردا ندی پڑتی تھی جس پر اس وقت پُل نہیں تھا۔کشتی سے موٹر اُتارنی ہوتی تھی اور پھر کافی ریت بھی پڑتی تھی۔اس وجہ سے ہم لوگ بہت صبح گھر سے نکل کھڑے ہوئے تا کہ یہ دریا دن میں ہی پار کر لیا جائے لیکن جب ہم بلاک میں پہنچے ہیں تو شام ہو چکی تھی، دھوپ ڈھل گئی تھی لیکن ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔بنگلے پر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ رابعہ صاحب کہیں تشریف لے گئے ہیں اور بس آنے ہی والے ہیں۔

کچھ دیر بعد رابعہ صاحب کا ملازم چائے لے کر آیا۔ہم لوگ چائے پینے لگے۔رات کے تقریباً آٹھ بجے رابعہ صاحب کی واپسی ہوئی۔ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک زبردست نعرہ لگاتے ہوئے جیپ سے اُترے اور بڑے تپاک سے بغلگیر ہوئے۔خوب باتیں ہوئیں۔ناشتہ پانی ہوا اور جب رات زیادہ گہری ہونی شروع ہوئی تو پھر سونے کا انتظام ہوا۔اب خنکی کچھ بڑھنے لگی تھی۔لہٰذا سب اُٹھ کر کوٹھی میں آ گئے۔اتنے عرصہ میں بھائی صاحب کا بستر کھانے کے کمرے میں لگ چکا تھا۔دوسرے کمرے میں تمام بستر بچھا کر ایک بہت موٹا سا گدا، جو چبوترے کی شکل کا تھا، تیار تھا۔یہ بستر میرا تھا۔بھائی صاحب کھانے کے کمرے میں بستر پر دراز ہو گئے۔ہم دن بھر کی ڈرائیونگ اور خراب راستہ کی وجہ سے کافی تھک گئے تھے، لہٰذا کھانا کھا کر جلدی سو گئے۔

صبح کو پانچ بجے رابعہ صاحب ایک چائے کی پیالی لیے ہوئے میرے کمرے میں آئے۔مجھ کو سوتے سے اٹھایا اور چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔یہ بالکل خلاف معمول بات تھی۔دیکھ کر دنگ رہ گیا۔میرے منہ سے بے ساختہ، یا اللہ رحم کر، نکلا۔چائے اور

راجہ صاحب میرے لیے بنا کرلائیں اور مجھ کوسوتے سے اُٹھائیں۔ خیر میں پینے لگا۔ اب راجہ صاحب فرمانے لگے۔ دیکھو یہ مارچ کی انتہائی حسین صبح ہے اور جنگل میں درختوں کی جو سُرخ سُرخ نئی کونپلیں نکل رہی ہیں، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔ یا درختوں میں شفق پھوٹی ہوئی ہو۔ اگر اس قوت بلاک میں گھوما جائے تو کتنا لطف آئے۔ تم چائے پی کر بھائی صاحب کو بھی اٹھا دو۔ وہ بھی گھوم لیں۔ ان کا اس بلاک میں آنا بہت عرصے بعد ہوا ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بھائی صاحب کو خود اٹھائیں بلکہ میں اٹھاؤں اور ان کو گھومنے پر رضامند بھی میں ہی کروں۔

ہم لوگ موٹر میں بیٹھنے کے لیے کمرے سے باہر آئے۔ راجہ صاحب ساتھ میں تھے۔ راجہ صاحب کے ایک نوعمر رشتہ دار مع اپنی بارہ بور بندوق کے برآمدہ میں کھڑے تھے۔ ان سے علیک سلیک ہوئی۔ ہم لوگ موٹر میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ میں نے راجہ صاحب سے کہا کہ آپ اپنی کوئی بندوق کیوں نہیں لے چل رہے ہیں۔ آپ تو پرمٹ ہولڈر ہیں۔ ہم لوگ نہیں ہیں۔ اب راجہ صاحب کو یاد آیا کہ وہ بغیر بندوق کے ہیں۔ راجہ صاحب نے یہ سُن کر بہت تیزی سے دروازہ کھولا اور بھاگتے ہوئے کوٹھی میں گھُسے اور اتنی ہی تیزی سے ایک ڈبل بیرل رائفل لے کر پھر موٹر میں آکر میرے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس عرصہ میں ان کے رشتہ دار جو برآمدے میں کھڑے تھے موٹر کے قریب آکر بولے، بھائی جان ہم بھی چلیں۔ میں نے ان سے کہا جناب پچھلی سیٹ تو بالکل خالی ہے آپ تشریف کیوں نہیں رکھتے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور وہ بھی بیٹھ گئے۔

اب ہماری گاڑی کوٹھی سے کافی دور نکل آئی تھی۔ ہم لوگوں کے دماغوں میں جو رات کا تناؤ تھا کم ہو چکا تھا۔ ایک آدھ بات بھائی صاحب اور راجہ صاحب میں بھی ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں نے مذاقاً راجہ صاحب سے پوچھا کہ آپ رائفل تو لے آئے کیا کارتوس بھی لائے ہیں۔ وہ بولے لایا کیوں نہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیبوں میں جلدی جلدی ہاتھ ڈالے اور بہت گھبرا کر بولے۔ ''ارے کارتوس تو نہیں ہیں''۔ اب میں نے پچھلی سیٹ پر

بیٹھے ہوئے صاحب کومخاطب کیا اوران سے پوچھا کہ وہ بھی کارتوس لائے یا وہ بھی گھر پر بھول آئے ہیں۔ انہوں نے چند کارتوس نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ دیکھا تو دوکارتوس چھرے کے تھے، ایک ریمنگٹن کی گولی تھی، بہت پرانی۔ دوہاتھ بھرے ہوئے ایس جی کے گراب۔ یہ تھی ان کی کل متاع۔ میں نے ان کوکارتوس لوٹاتے ہوئے کہا۔ دیکھنا آج اس بلاک کے جتنے شیر، گلدار، بھالو ہیں، سب ملیں گے۔ اس بلاک میں بھالواور گلدار بڑی کثرت سے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ کوایک ساتھ چار گلدار ملے تھے۔

ابھی ہم کوٹھی سے تین چار کلومیٹر ہی نکلے ہوں گے کہ بھائی صاحب نے سرگوشی میں کہا۔ 'شیر' اور گاڑی روک دی۔ ہماری نظر جب ان کی بتائی ہوئی سمت گئی تو دیکھا واقعی ایک شیر کافی اچھا، ہماری گاڑی سے بیس پچیس گز دور ایک بہت ہری کچوہ گھاس کے قطع کے کنارے کھڑا ہوا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔

راجہ صاحب نے اسی دوران اپنے رشتہ دار سے بندوق لے لی تھی۔ ایک نالی میں ریمنگٹن کی گولی اور دوسری میں ایس جی لگا کر بندوق کی نالی اس کھڑکی کے باہر نکالنا شروع کی جس طرف شیر تھا اور اسی طرف اسٹیرنگ پر بھائی صاحب بیٹھے تھے۔ اب بندوق کا کُندہ بھائی صاحب کے کندھے کے قریب آ گیا تھا اور راجہ صاحب بھائی صاحب سے کہہ رہے تھے، کوئی شارٹ ماردو۔ کوئی کِڈنی شارٹ مار واور بھائی صاحب اُلٹے ہاتھ سے بندوق کے کُندے کو ہٹاتے تھے اور 'اوں ہوں، اوں ہوں' کی آواز نکالتے تھے اور مسلسل کھڑکی کے باہر شیر کو دیکھے جارہے تھے۔

آخر راجہ صاحب کے اصرار نے ان کوزِچ کر دیا تو انہوں نے اپنا منہ گھمایا اور راجہ صاحب کو بہت گھور کر دیکھا اور بولے دیکھو میں یہ تماشہ نہیں کرنے کا۔ بس بکے ہی جارہے ہو۔ کِڈنی شارٹ ماردو۔ کِڈنی شارٹ ماردو۔ ابھی تھوڑی دیر میں میلے میں شرکت والے لوگ آنا شروع ہو جائیں گے اور یہ شیر ان کی دکان لگائے بیٹھا ہوگا۔ نہ تو یہاں ہاتھی ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا ذریعہ جس کی مدد سے اس زخمی شیر کو تلاش کیا جائے گا۔ آج شام سے حضرت مسعود غازیؒ کا عرس شروع ہو رہا ہے جن کا مزار اسی بلاک میں ہے۔ بیسیوں آدمی جنگل کے

اسی راستے سے ہو کر درگاہ پر جائیں گے۔ کیا ان کو مروانا ہے۔

بات معقول تھی راجہ صاحب کی سمجھ میں آگئی۔ یہ سُن کر راجہ صاحب بولے، اچھا میں یہیں اُترے جاتا ہوں۔ تم لوگ کوٹھی جاؤ اور اپنی بندوقیں لے کر فوراً واپس آؤ۔ جب تک میں شیر کو روکے ہوئے ہوں۔ بھائی صاحب اس پر رضا مند ہو گئے۔ راجہ صاحب نے دروازہ کھولنے کے لیے پُش بٹن پر ہاتھ رکھ کر اس کو دبایا۔ ایک بہت خفیف سی کلک کی آواز ہوئی۔ اس آواز کا ہونا تھا اور شیر کا گھاس میں زقند لگانا۔ اس کی چھلانگ لگانے میں دوسرا شیر جو ہم کو موٹر سے نظر نہیں آرہا تھا، اس نے بھی گھاس میں چھلانگ لگائی۔ یہ شیر کی قوتِ سماعت کا چھوٹا سا نمونہ تھا جو پیش کیا گیا۔

اس سلسلہ میں زیادہ کہنے سننے کی گنجائش اس وجہ سے نہیں ہے کہ شکاریوں میں یہ کوئی بہت بڑا اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر شکاری اس بات سے متفق ہے کہ شیر میں سُننے کی طاقت بہت زبردست ہوتی ہے۔

اب رہی شیر میں دیکھنے کی قوت ـــــ یہ بھی ایک سُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ اس میں بھی زیادہ ردّ وقدح کی گنجائش نہیں۔ سوائے اس کے کہ چند جملے اس سلسلہ میں لکھ دیے جائیں تاکہ وضاحت ہو جائے۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ شیر کو جب مچان سے مارنا مقصود ہوتا ہے تو مچان کو درخت کے پتّوں وغیرہ سے اس طرح چھپا دیا جاتا ہے کہ شیر کی نظر مچان پر بیٹھے شکاری پر نہ پڑ سکے۔ شکاری کو شیر سے چھپنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ کیا شکاری کو ڈر ہوتا ہے کہ شیر جیسے ہی اس کو دیکھے گا ویسے ہی چھلانگ لگا کر شکاری کو اُتار لے گا۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر ہوتا بھی ہو تو بہت بڑے اناڑیوں کے ساتھ ہُوا ہو گا۔ یہ آڑ صرف اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ رات کے اندھیرے میں بھی شیر کی نظر اتنی خوبی سے دیکھ سکتی ہے جتنی ہماری نظر، دن کے اُجالے میں دیکھتی ہے۔ مچان پر بیٹھے شکاری کی ذرا سی جنبش شیر نے اگر دیکھ لی، تو وہ پڈّے کو چھوڑ کر تاریکی میں غائب ہو جائے گا اور دوبارہ واپس آنے پر آپ کو اس کے آنے کی خبر نہ ہو گی اور آپ کا پڈّا جب آپ نا اُمید ہو کر لائٹ جلائیں گے، تو دیکھیں گے کہ غائب ہو چکا ہو گا۔

صرف اس شرمندگی سے بچنے کے لیے مچان کو پوری طرح چھپا دیا جاتا ہے۔ جتنا اچھا مچان ہوگا، اتنی ہی اچھا موقع اس پر گولی چلانے کا ملے گا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شیر نے شکاری کو پلک جھپکتے دیکھا اور وہ پڑے پر سے ہٹ گیا۔ جہاں تک شیر کے دیکھنے کی قوت کا تعلق ہے، وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ رات میں جب شکاری مچان پر بیٹھا ہو اور شیر پڑے کو مارنے آجائے اور شکاری چاہے کہ گولی پڑے کو کل کرنے سے پہلے چلا دے تو یہ شکاری کے لیے بہت مشکل اور آزمائش کا کام ہوتا ہے کیونکہ شیر ہاتھ کی اس جنبش کو جس سے بندوق کندھے پر لائی جائے گی اور بندوق کی نال کی اس جنبش کو جو نشانہ لیتے وقت جوڑنے میں ہوگی، شیر دیکھ لے گا اور فوراً اتنی تیزی سے اس جگہ سے ہٹے گا کہ آپ دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ اس وجہ سے لوگ مچان کو درخت کے پتوں وغیرہ سے خوب چھپا دیتے ہیں تاکہ بیٹھے ہوئے شکاری کو وہ دیکھ نہ سکے اور اس کی کسی جنبش کو وہ محسوس نہ کر سکے۔

اکثر اوقات یہاں تک تجربہ ہوا ہے کہ شیر نے پڑے کو مار دیا۔ شکاری مچان پر بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ شیر کے منہ کا رُخ ذرا سا تبدیل ہو، تو وہ بندوق اُٹھا کر کندھے پر لائے۔ اس اثناء میں وہ آنکھ جھپکتا ہے۔ شیر اس کی آنکھ کی جھپک جو پلک مارنے میں ہوتی ہے، دیکھ لیتا ہے۔ شیر فوراً پڑے پر سے ہٹ جائے گا۔ لہٰذا پڑے اور مچان کا فاصلہ تیس پینتیس گز سے کم کبھی نہیں رکھا جاتا۔ اگر اتنے فاصلے سے کوئی کسی کے پلک کی جھپک دیکھ لے تو اس کی نظر کی تیزی کی داد دینا پڑے گی۔

شیر زیادہ تر چھپ کر شکار کرتا ہے۔ کبھی جھاڑیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ کبھی گھاس میں چھپا ہوتا ہے۔ اس طرح چھپے ہونے کی وجہ سے کوئی آدمی یا جانور اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن شیر اس آڑ میں ہونے کے باوجود، اپنے سامنے کی ہر چیز کو بڑی صفائی سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کی نظر کو نہ تو پتے اور ٹہنیاں روک سکتی ہیں اور نہ ہی گھاس کے تنکے رُکاوٹ بنتے ہیں۔ اس کے دیکھنے کی قوت کو کانوں سے بھی بہت مدد ملتی ہے، یعنی جہاں وہ آہٹ محسوس کرتا ہے، وہیں اپنی نظریں جما دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگل میں کوئی چیز اس سے چھپی نہیں رہ سکتی۔

شیر کی طاقت

شیر کی طاقت کے متعلق بہت سی کہانیاں لوگوں نے سنی ہوں گی اور ہوسکتا ہے خود دیکھی بھی ہوں۔ شاید دنیا میں اس سے طاقت ور جانور اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ حالانکہ جسامت میں یہ بہتیرے جانوروں سے چھوٹا ہوتا ہے، لیکن طاقت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔

اینڈرسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کسی جگہ ایک شیر مویشیوں کو کھانے کا عادی ہو گیا یعنی Catlle lifter ہوگیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کے جانور مار مار کر بُرا حال کر دیا۔اس شیر کے خوف اور دست بُرد سے محفوظ رہنے کے لیے گاؤں کے لوگوں نے اپنے جانوروں کی حفاظت کے لیے باڑے بنائے جس کی دیواریں پانچ چھ فٹ اونچی تھیں۔ لیکن شیر ان باڑوں میں بھی چھلانگ مار کر گھس گیا اور اندر جا کر جانوروں کو مار ڈالا۔ پھر مع اپنے شکار کے باڑے کی دیوار پھلانگ کر جنگل میں چلا گیا۔ یہاں ایک بات ضرور عرض کر دوں۔ شیر جب گوڑی یا ریوڑ میں جانور کو مارتا ہے تو جو سب سے موٹی تازی بھینس یا گائے ہوتی ہے، اس کو ہی مارتا ہے۔ دُبلے پتلے اور مدقوق جانوروں کو شیر نہیں مارتا۔

اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھینس یا گائے چار پانچ سو پونڈ یعنی تقریباً چھ من سے کم وزن کی نہیں ہوتی۔ شیر اس کو منہ میں دباتا ہے اور گردن کے جھٹکے سے اس کو باڑے کی دیوار کے باہر پھینک دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بلی چوہے کو گردن پکڑ کر جھٹکے سے دور پھینک دیتی ہے۔ اکثر دیہات کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ شیر نے ایک بہت موٹی گائے ماری اور اس کو منہ میں دبا کر بہت گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شیر کافی وزن دار جانور کو اپنے منہ میں داب کر لے گیا اور اس کی رگڑ کے نشانات تک زمین پر بالکل نہیں پڑے۔ ایسی صورت میں لوگ غلط اندازے لگانے لگتے ہیں کہ شیر جانور کو یا تو اپنی پیٹھ پر لاد کر لے گیا ہوگا یا منہ میں کمر سے پکڑ کر اتنا اونچا اٹھا رکھا ہوگا کہ اس کی رگڑ زمین پر نہیں پڑی۔

ہمارے شہر کے نزدیک ایک زمیندارا کا جنگل تھا جس میں ایک دریا کی وجہ سے دلدل

ہوگئی تھی اور جو بہت دور تک پھیلی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک حاکم پرگنہ ایک ہاتھی پر بیٹھ کر اس دلدل سے پار ہونا چاہتے تھے۔ یہ حاکم پرگنہ شکار کے شوقین تھے لیکن جنگل سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ فیل بان نے ان کو منع کیا کہ ہاتھی اس دلدل کو پار نہیں کر سکتا، اس کے پھنس جانے کا امکان ہے کیونکہ یہ بہت بھاری جانور ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب نے فیل بان کی بات نہ مانی اور زبردستی ہاتھی دلدل میں گھسوا دیا۔ وہی ہُوا جس کا ڈر تھا۔ ہاتھی دلدل میں بُری طرح پھنس گیا۔ ڈپٹی صاحب تو کسی نہ کسی طرح باہر آ گئے لیکن ہاتھی نہیں نکل سکا۔ کئی روز اسی دلدل میں پھنسا ہوا کھڑا رہا اور آخر مر گیا۔

اس واقعہ کے کئی روز بعد ہمارا گزر اسی دلدل کی طرف ہوا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بھینس دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہم نے ٹھاکروں سے جو ہم کو شکار کھلا رہے تھے، کہا کہ کسی طریقہ سے اس بھینس کو نکالو۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور ڈپٹی صاحب کا قصہ ہم کو سنایا۔ ہم لوگ جنگل میں آگے چلے گئے۔ جب شکار کھیل کو واپس ہوئے تو دیکھا بھینس دلدل میں نہیں ہے۔ ہم نے ٹھاکر صاحب سے کہا۔ دیکھا بھینس دلدل سے نکل گئی، آپ تو کہتے تھے، ہاتھی تو نکل نہ سکا یہ بھینس کیسے نکلے گی۔ ٹھاکر صاحب ہمارے اس جملہ پر کچھ خفیف سے ہوئے۔ بولے سمجھ کچھ کام نہیں کر رہی۔ یہ بھینس دلدل سے نکل کیسے گئی۔ پھر بولے تھوڑا چکر ضرور پڑے گا، چلو ایک بار چل کر پھر سے دیکھیں کہ یہ آخر ہوا کیسے۔ ہم لوگ کافی لمبا چکر لگانے کے بعد اس دلدل کی دوسری طرف پہنچے، جہاں جامن کے درختوں کا ایک بہت بڑا کنارہ تھا۔ اس طرف کی زمین کچھ سخت تھی۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو سب نقشہ سمجھ میں آ گیا کہ یہ بھینس کیسے نکلی اور کس نے نکالی۔

اس طرف کی زمین پر ایک شیرنی کے پنجوں کے نشانات تھے جو تازہ معلوم ہوتے تھے۔ جو دلدل کی طرف گئے تھے ان ہی پنجوں کے برابر دلدل سے واپسی کے بھی نشان تھے، لیکن ان کے ساتھ کسی چیز کی رگڑن کے بھی نشان تھے۔ ہوا یہ تھا کہ شیرنی نے بھینس کو دیکھا اور قُلانچ لگا کر بھینس کی پیٹھ پر کودی، پھر اس کو منہ میں دبا کر دوسری قلانچ دلدل سے باہر لگائی اور وہاں سے وہ مع بھینس کے کنارے پر آ گری، جس کے واضح نشانات وہاں موجود تھے۔

اس کے بعد بھینس کو منہ میں دبا کر جنگل میں چلی گئی۔ اگر ہم کوشش کرتے تو اس شیرنی کو ضرور مار سکتے تھے، لیکن ہمارے ساتھی اس پر تیار نہیں ہوئے۔

ایک مرتبہ ٹنک پور میں آبادی سے بہت قریب ایک شیرنی اور ہتھنی میں جنگ ہو گئی۔ ہوا یہ تھا کہ شیرنی کے ساتھ بچے تھے اور ہتھنی کے ساتھ بھی بچہ تھا۔ دونوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ ہمارے بچوں کو دوسرا نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ان دونوں کی سمجھ میں یہ آنا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ لڑائی رات بھر چلتی رہی اور اتنی بھیانک چیخیں اور دہاڑیں دونوں نے نکالیں کہ رات بھر بستی کے لوگ سو نہ سکے۔ لوگوں نے صبح کو جا کر دیکھا تو شیرنی اور ہتھنی دونوں مرے پڑے تھے۔ اگر ہتھنی نے شیرنی کو مار ڈالا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہاتھی کے قد و قامت سے آپ بھی واقف ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ شیر جو ہاتھی کے دسویں حصہ کے برابر ہوتا ہے، وہ اپنے سے دس گنے بڑے جانور کو مار لے۔ یہ کرشمہ ہے شیر کی طاقت کا۔

اس قصہ میں تو دونوں طاقتور مر گئے۔ اب میں ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں، جو مجھ پر گزرا۔ اس سے آپ بخوبی سمجھ جائیں گے کہ شیر کتنا طاقتور ہوتا ہے۔

ایک بلاک میں ہم کو چرواہوں سے اطلاع ملی کہ ایک شیر نے ان کی ایک گائے پکڑ لی ہے اور اس کو کھینچ کر ایک گھاس کے قطعے میں گھس گیا ہے۔ یہ گھاس لمبائی میں میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن چوڑائی میں کہیں بھی دو سو گز سے زیادہ نہیں تھی۔ کیونکہ یہ ایک برساتی دریا کا بیڈ تھا، جو اس وقت سوکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ اگلے روز ہاتھی لائے اور گھاس کا ہانکا کرایا۔ اس میں سے شیر نکلا۔ ہم تین شکاری اس شکار میں تھے۔ میں اکیلا ایک ہاتھی پر تھا۔ دوسرے ہاتھی پر میرے بھائی صاحب اور ان کے ایک دوست تھے۔ تیسرا ہاتھی خالی تھا، اس پر کوئی شکاری نہیں تھا، صرف فیل بان تھا۔ شیر نکلا۔ تین گولیاں چلیں۔ شیر زخمی ہو گیا اور پھر گھاس میں واپس چلا گیا۔ دوبارہ پھر اس کو رگیدا گیا۔ وہ پھر گھاس سے باہر آیا۔ اس پر پھر دوبارہ گولی چلی۔ اب کی اس کا سیدھا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ وہ گر پڑا۔ ٹانگیں اوپر کر کے پھڑ پھڑانے لگا۔ ہمارے بھائی صاحب نے کارتوس کا لالچ کیا اور فیل بان کے بہت کہنے کے باوجود دوسری

گولی نہیں چلائی، لیکن ان کے دوست جوان کے ساتھ بیٹھے تھے اور جن کے پاس چار سو چار بور سنگل بیرل رائفل تھی، انہوں نے اس چت پڑے پھڑ پھڑاتے ہوئے شیر پر ایک گولی ضرور چلا دی۔ لیکن یہ گولی اس کے لگی نہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شیر جو اپنے حواس کھو چکا تھا، پھر سنبھل گیا اور اُٹھ کر گھاس میں گھس گیا۔ میں کیونکہ گھاس کی دوسری طرف تھا، اس وجہ سے اس قصہ سے واقف نہیں ہو سکا۔ جب دوبارہ شیر گھاس میں واپس گیا، تب بھائی صاحب نے پکار کر مجھ سے کہا۔ شیر دوبارہ زخمی ہو کر گھاس میں گھُسا ہے، تم اپنے ہاتھی کو نکال لو۔ میں نے اپنا ہاتھی نکال لیا اور باہر نکل کر بھائی صاحب کی طرف چلا۔ بھائی صاحب اپنے ہاتھی پر وہیں کھڑے تھے اور بہت نروس تھے۔ کچھ شرمندہ بھی تھے۔ میں نے ان کو تسلی دی اور کہا، میں شیر کو دوبارہ نکال دوں گا، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آپ ہی اس کو ماریں گے۔ لیکن اب اس کو فی الحال چار گھنٹے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ میری یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ہم لوگ وہاں سے ہٹ کر اپنی جیپ پر آ گئے، جو وہاں سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور سڑک پر کھڑی تھی۔ جیپ پر ہمارے دو ساتھی اور بیٹھے تھے جو شیر کا شکار نہیں کھیلتے تھے اور بہت پریشان تھے۔ کیونکہ وہ گولیاں چلنے اور شیر کے دہاڑنے کی آواز برابر سُنتے رہے تھے۔ایک صاحب نے جیپ پر آ کر ان سب کو شیر کے زخمی ہونے کے واقعات سُنائے۔ کافی بحث و مباحثہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ جیپ کو کوٹھی بھیجا جائے اور کھانا وغیرہ یہیں منگوا لیا جائے۔ اسی دوران میں نے دو تین مقامی لوگوں کو، جو ملازم تھے اور ہمارے ساتھ تھے، ہاتھیوں پر بھیج کر اس گھاس کے چاروں طرف درختوں پر بٹھوا دیا تا کہ اگر شیر اس گھاس سے نکلے تو معلوم ہو جائے کہ کہاں گیا۔ اس انتظام اور کھانا آنے میں کافی وقت گزر گیا۔ یہ واقعہ شاید نو یا دس بجے دن کا تھا۔ فروری کا مہینہ تھا اور دن چھوٹا۔ شام کا دُھندلکا جلد پھیلنے لگتا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد رائے ہوئی کہ اب پھر واپس چلا جائے۔

ہم لوگ پھر اس گھاس کے پاس پہنچے۔نوکروں سے دریافت کیا۔انہوں نے کہا شیر نے گھاس نہیں چھوڑی۔ نکلا نہیں اس گھاس میں سے، اور اکثر غُرغُرایا بھی ہے۔ میں نے کنٹرول اب کی مرتبہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پہلے بھائی صاحب کے ہاتھی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بوتل

کی گردن کی طرح مخروطی شکل کی تھی۔ میری سمجھ کے مطابق شیر اسی جگہ سے نکل سکتا تھا۔ میں دونوں ہاتھی لے کر جنگل کی طرف، جس طرف گھنی گھاس تھی، چلا، تاکہ اوپر سے نیچے کی طرف شیر پر دباؤ ڈالنا ٹھیک ہوگا۔ یہ بات ہمارے بھائی صاحب کو پسند نہیں آئی۔ ان کی رائے تھی کہ دوسری طرف سے شیر پر دباؤ ڈالا جائے۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بھائی صاحب نے طعنہ دیتے ہوئے کہا، شاید تم ڈر گئے ہو۔ ان کی بات سُن کر مجھ کو اتنا غصہ آیا کہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر جدھر وہ کہہ گئے تھے، اس طرف ہاتھیوں کو موڑ دیا۔ اس وقت میرے ہاتھی پر بھائی صاحب کے ایک چہیتے ملازم، بھائی صاحب کی خوشامد کر کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس شیر کے چھوٹے بچے بھی ہیں، جن کو یہ پکڑیں گے۔ میری ذمہ داری ان کی جبہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ ایک تو شیر کے نکالنے کی ذمہ داری اور شیر بھی کون، زخمی شیر، دوسرے ان بے وقوفوں کی حفاظت کی ذمے داری جو شیر کے بچے پکڑنا چاہتے تھے۔ میں غصّے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اس طرف چل پڑا جس طرف بھائی صاحب نے بتایا تھا۔ یہاں گھاس ہاتھی ڈُباؤ تھی۔ کچھ دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے ہاتھی کو کم اونچی گھاس کی طرف مُڑوادیا۔ یہ کچھ چھدری گھاس تھی او راس میں کچھ چھپ چھپا پانی بھی تھا۔ ابھی ہمارے ہاتھی بیس پچیس گز ہی گئے ہوں گے کہ شیر نے چارج کر دیا۔ اس کی دہاڑ سُن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیلا بہت بڑا بنڈل سا ہے، جو لڑھکتا ہوا میرے ہاتھی سے آگے خالی ہاتھی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس ہاتھی کے فیل بان نے جو شیر کی شکل دیکھی تو گھبرا گیا اور ہاتھی کی گردن سے کود کر گدّے پر آ کھڑا ہوا۔ پہلے سر سے اپنا انگوچھا اچھال کر شیر پر پھینکا اور بھیانک آوازوں سے چلانے لگا۔ پھر میں نے دیکھا کہ شیر اس کے ہاتھی کے پیٹ کے نیچے گھس گیا ہے۔ اب فیل بان نے اپنا انکش شیر پر پھینکا۔ اس کا ہاتھی یہ شور وغوغا سن کر خود گھبرا گیا تھا اور سرپٹ بھاگے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گھاس کے باہر آ گیا۔

اب قصہ سنئے میرا۔ جب شیر اس ہاتھی پر جھپٹا، تو میرا ہاتھی شیر پر جھپٹ پڑا۔ جھپٹ کی بات میں نے یوں کہی کہ میرا ہاتھی پہلے اپنے دونوں پیروں کو دو ڈھائی فٹ زمین سے ایک

ساتھ اُٹھاتا تھا اور پھر ایک ساتھ زمین پر لاتا تھا۔ اُس کی اِس چال نے مجھے جُھلا ڈالا، اور مجھ کو شیر پر گولی چلانے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی یہ چال شروع ہی سے تھی۔ یہ ایک بالکل نیا ہاتھی تھا جو پہلی مرتبہ شکار پر لایا گیا تھا۔ یہ جانوروں کو دیکھ کر ان پر جھپٹ پڑتا تھا۔ معلوم نہیں ڈر کی وجہ سے یا غصہ کی وجہ سے۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے اس کے پیروں میں لوہے کا خاردار چھلا، جس کو ہونچی کہتے ہیں، ڈال دیا گیا تھا۔ اور اس میں ایک رسی باندھ دی گئی تھی جو ہاتھی کی پیٹھ پر بندھے ہوئے کھٹولے میں اٹکا دی گئی تھی۔ جب یہ بھاگتا تھا تو میں رَسّی کو کھینچتا تھا اور فیل بان انکش سے اس کو روکتا تھا۔ جب کہیں دس بیس گز چلنے کے بعد یہ رُکتا تھا۔ سب نے مجھ کو بہت منع کیا کہ میں اس ہاتھی پر نہ بیٹھوں، لیکن فیل بان کی خوشامد سے مجھے مجبور ہونا پڑا۔ یہ فیل بان بھی نیا تھا اور جنگل میں اکیلا جانے سے ڈرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں اس کے ہاتھی پر بیٹھوں گا تو اس کی ہمت بندھی رہے گی۔ ورنہ اکیلے وہ شیر کو نہیں نکال سکتا۔ اور نہ ہی کسی ایسی گھاس میں گھسنے کی ہمت کر سکتا ہے جس میں شیر کے رہنے کا امکان ہو۔

جب وہ ہاتھی گھاس سے باہر ہو گیا تو شیر کہیں گھاس ہی میں رُکا رہا۔ میں نے اپنے ہاتھی کو قابو میں کیا، جو بھاگ رہا تھا۔ پھر اس کو مُڑا کر گھاس سے باہر لانا چاہا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے ہاتھی نے ٹھوکر کھائی اور وہ پچھلی طرف تھوڑا اُجھک گیا۔ اس کا جھکنا تھا کہ دونوں نوکر آ کر میرے اوپر لد گئے۔ میں فیل بان کے پاس ہاتھی کی گردن سے اوپر چوڈنڈی پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے دونوں پاؤں چوڈنڈی سے باہر نکال کر ہاتھی کی گردن پر رکھے ہوئے تھا۔ ہاتھی کی پیٹھ پر میری بیٹھک شروع ہی سے یہی تھی۔ میں ان لوگوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ہاتھی کی رسّی جو پہونچی سے بندھی ہوئی تھی، برابر جھٹک رہا تھا کہ کہیں ہاتھی بیٹھ نہ جائے۔ میری پہونچی کے جھٹکے کی وجہ سے ہاتھی بیٹھ تو نہ سکا لیکن چلا پھر بھی نہیں۔ میں نے اور فیل بان نے بہت کوشش کر کے اس کو چلنے پر مجبور کیا۔ ہاتھی چلنے لگا، لیکن کیسے جیسے کوئی چوپایہ تین ٹانگوں پر چلتا ہو، یعنی ایک طرف جھکا ہوا اور پچھلے پیر کو گھسیٹتا ہوا۔ میں سمجھا شاید ہاتھی کے پھسل جانے کی وجہ سے اس کی ٹانگ کو کچھ نقصان پہنچ گیا ہے، اس وجہ سے یہ تین ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ اب میں نے نوکروں سے کہا میرے اوپر سے ہٹو۔ دیکھوں تو معاملہ کیا ہے۔ دونوں نوکر ردتے

ہوئے بولے بھیا شیر نے ہاتھی کی پچھلی ٹانگ پکڑ لی ہے اور اس سے لپٹا ہوا ہے۔ اب ہاتھی نے چلنا بالکل بند کر دیا۔ اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ اور پھر بیٹھنے لگا اور بیٹھتے ہی ایک طرف کروٹ کے بل جھکنے لگا۔ اب میں نے نوکروں کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ہٹو، اور اگر نہیں ہٹے تو میں تمہیں دھکا دے دوں گا۔ یہ سُن کر وہ ذرا سا ایک طرف کو ہوئے، تب میں نے دیکھا کہ شیر میرے ہاتھی کی اُلٹی ٹانگ منہ سے پکڑے ہوئے ہے اور اس کو کھینچتا ہے، جیسے ہی شیر طاقت لگا کر اس کو کھینچتا ہے، ویسے ہی ہاتھی اُس طرف کو جھکتا چلا جاتا ہے۔ میں نے اُلٹے کندھے پر بندوق لا کر ایک گولی چلائی۔ معلوم نہیں شیر کے لگی یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا کہ میرا ہاتھی ایک دم کھڑا ہو گیا اور کھڑا ہوتے ہی ناک کی سیدھ میں جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے پہونچی کی مدد سے اور فیل بان نے انکش کی مدد سے ہاتھی کو روکا، ورنہ جس طرف اس کا رُخ تھا، اگر وہ جنگل میں گھس جاتا تو ہم سب کی موت یقینی تھی۔ شیر پھر گھاس میں گھس گیا۔ باقی ہاتھیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دیکھی آپ نے شیر کی طاقت ـــــ یہ اس شیر کا قصہ ہے جو اَدھ مَرا تھا اور جو دوسرے دن صبح کو مردہ اُٹھایا گیا۔ اس کو اُٹھانے سے پہلے اس پر کوئی اور گولی نہیں چلائی گئی تھی۔

دوسرا واقعہ شیر کی طاقت کا کچھا میں دیکھا، جس کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے، جس میں شیر نے ایک ٹریکٹر کا اسٹیرنگ وھیل اُکھاڑ لیا تھا۔

کچھا میں ایک شیر کڑنگے میں پھنس گیا۔ صبح کو جن لوگوں نے کڑنگا جانوروں کو پھنسانے کے لیے لگایا تھا، وہ اسے دیکھنے گئے تو ان کو بجائے کسی ہرن وغیرہ کے، شیر پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چلاتے ہوئے بھاگے اور جب کچھ عرصہ بعد مسلح ہو کر آئے تو شیر وہاں سے غائب تھا۔ کڑنگے کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شیر کا اگلا ہاتھ کڑنگے میں پھنسا تھا۔ شیر نے جب لوگوں کو آتے دیکھا تو طاقت لگا کر اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ہاتھ کڑنگے سے نکل تو نہیں سکا، ہاں ٹوٹ کر جہاں کڑنگے میں پھنسا ہوا تھا، کڑنگے میں ضرور لگا رہ گیا۔

ریلوے کا انگریز آفیسر ایک مرتبہ کسی جنگل کے اسٹیشن پر لائن کے معائنہ کے لیے سیلون سے گیا۔ اس کا سیلون ایک طرف خالی لائن پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس اسٹیشن کے لوگوں نے

اس سے کہا کہ یہاں ایک آدم خور شیر ہے جو شام کو اکثر اس اسٹیشن پر آجاتا ہے، لہٰذا آپ رات میں اس بھیانک اسٹیشن پر سیلون میں نہ رہیں۔ لیکن وہ انگریز افسر نہیں مانا اور رات کو اپنے سیلون ہی میں سویا۔ رات میں گرمی کی وجہ سے اور کھڑکیوں کے بند ہونے کی وجہ سے سیلون بھٹی کی طرح گرم ہو گیا۔ صاحب بہادر نے گرمی سے پریشان ہو کر سیلون کی کھڑکی کھول دی۔ رات میں کسی وقت وہی آدم خور شیر آ گیا اور کھڑکی کھلی دیکھ کر سیلون میں گھس گیا۔ صاحب بہادر کو تو مار ہی دیا، لیکن اس کے کودنے کے زور کی وجہ سے سیلون بھی لائن سے اُتر کر ایک طرف ترچھا ہو گیا۔

اینڈرسن نے لکھا ہے کہ کسی جنگل میں سے ایک ٹرک بانس لاد کر لے جایا جا رہا تھا۔ ایک شیر نے بانسوں سے بھرے اس ٹرک کو اُلٹ دیا اور ڈرائیور کو اُتار کر کھا گیا۔

ان تمام واقعات سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ شیر میں کس بلا کی طاقت ہوتی ہے۔

شیر کا وزن

جہاں تک شیر کے وزن کا تعلق ہے، اس کا انحصار اس کے رہنے کے علاقوں اور غذا کی فراہمی پر ہے۔ ہندستان میں شیر شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس ملک کا شمالی حصہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس خطہ کی آب و ہوا بمقابلہ جنوبی علاقے کے انتہائی سرد ہے اور خشک ہے۔ پہاڑوں سے اُتر کر دریاؤں کے میدان ملیں گے۔ ان میدانی علاقوں میں کاشت ہوتی ہے۔ پانی کی فراوانی ہے لیکن راجستھان کا علاقہ ریگستانی ہے یعنی گرم اور خشک۔ ان کاشت کے میدانوں کے بعد بندھیا چل کا پلیٹو ہے جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور پتھریلی زمین پائی جاتی ہے، لیکن زیادہ تر علاقہ ناقابل کاشت ہے، جہاں کی زمین کہیں سُرخ تانبے کے رنگ کی، کہیں سیاہی مائل سرخ لوہے کے زنگ کے رنگ کی اور کہیں لوہے کی طرح کالی ہے۔ اس میں کاشت نہیں ہوتی لیکن یہ علاقہ جمادات کی کانوں سے مالا مال ہے۔ اس کے بعد بہت گھنے جنگلوں کا خطہ بالکل جنوب میں آتا ہے۔ اس میں مشرقی مغربی گھاٹ بھی

آتے ہیں۔ دریاؤں اور جھیلوں کا علاقہ کیرل بھی آتا ہے جس میں ہر قسم کے نباتات اور ٹراپیکل جنگلوں کی افراط ہے۔

جغرافیائی حالات اور موسموں کی شدّت کا اثر ہر ذی روح کے تن و توش اور توانائی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ جو علاقے سرد ہوتے ہیں، ان علاقوں کے رہنے والے، چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان، اُن علاقوں کے لوگوں سے جو گرم اور مرطوب ہوں، جثہ اور طاقت میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق شیر پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن جانوروں کے معاملہ میں اور خاص طور پر شیر کے معاملہ میں غذا ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلا لکھا ہے، اُتر کے پہاڑوں کے شیر جنوبی ہندستان کے شیروں کے برابر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑوں پر شکار کرنا ایک بہت دقّت طلب امر ہے۔ پہاڑوں کے چوپائے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سانبھر جو ہندستان کا سب سے گرانڈیل چوپایہ ہے، وہ بھی میدانی علاقہ کے سانبھر سے چھوٹا ہوتا ہے۔

اول تو شیر روز شکار نہیں کر پاتا، دوسرے تیسرے دن اس کو شکار مل جائے بھی تو پہاڑی جانور وزن اور قد میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے شیر کے دیو اشتہا کو پوری طرح تسکین نہیں دے سکتا۔ شیر کا کھانا کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جانور کو مار کر کچھ حصہ فوراً کھالیتا ہے۔ شیر زیادہ تر شکار رات ہی میں کرتا ہے اور بچا کھچا کھانے کے لیے کل پر اُٹھا رکھتا ہے۔ جب جانور چھوٹا ہوگا تو کل کے لیے کتنا بچ سکتا ہے۔ کیونکہ شیر کی کم سے کم خوراک بھی بیس سیر یعنی چالیس پونڈ گوشت ضرور ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے شیر غذا کی کمیابی کی وجہ سے اور سخت محنت کی وجہ سے زیادہ تر بھوکے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو اتنی غذا نہیں مل پاتی جتنی غذا کی انہیں ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان کا جسم زیادہ پھیل اور بڑھ نہیں پاتا۔ اوپر لکھے جملے کی انگریزی کا ایک جملہ بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ یعنی پہاڑوں کے شیر 'انڈر فیڈ' ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے جنوبی ہند کے شیر گرم اور مرطوب موسم کی وجہ سے جسمانی لحاظ سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ جنوبی ہندستان کے شیروں کی اوسط لمبائی نو فٹ یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور پہاڑ کے شیر بھی اسی لمبائی کے ہوتے ہیں۔ لیکن ترائی اور میدانی علاقوں کے شیر بہت جسیم اور موٹے تازے

ہوتے ہیں۔ لمبائی میں بمقابلہ جنوبی ہند کے شیروں کے یہ شیر ایک فٹ سے ڈیڑھ فٹ تک بڑے ہوتے ہیں۔

میدانی علاقوں میں زیادہ تر شیر دس فٹ، بلکہ اس سے کچھ زیادہ لمبائی کے ہوتے ہیں۔ کاربٹ نے تو ایک شیر شاید گیارہ فٹ سے بھی زیادہ لمبائی کا مارا تھا۔

یہ بارہا کا تجربہ ہے کہ وہ شیر جو کسی گاؤں کے قریب یا جنگل میں گوڑیوں (جانوروں کے باڑے) کے قریب مارے گئے، جسمانی ساخت کے لحاظ سے بہت قدآور اور لمبے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے لیے وہاں کھانے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اگر کبھی جنگلی جانور شکار نہ کر سکے تو گوڑی سے کوئی تگڑی گائے یا بھینس مار لائے، جو کم از کم اس کو تین دن تک تو غذا سے بے فکر کر دیتی تھی۔ گاؤں کے نزدیک رہنے کا بھی یہی فائدہ تھا۔ جب جنگل سے شکار نہ ملا، گاؤں والوں کے جانور مار لیے۔ کھانے کی طرف سے بے فکر۔ غذا کی افراط اور اس کی طرف سے بے فکری شیروں کی لمبائی چوڑائی تو بڑھاتی ہی ہے، ان کے وزن کو بھی بڑھا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے شیروں کے وزن علاقوں کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں۔

ویسے شیر کا وزن کم سے کم ڈھائی سو پونڈ کے لگ بھگ ہوسکتا ہے۔ اس سے کم وزن کا شیر اگر کہیں تو لا گیا ہو تو وہ یا تو مریض ہوگا یا مدقوق، صحت مند شیر نہیں ہوسکتا۔ شیر کا زیادہ سے زیادہ وزن چھ سو پینتالیس پونڈ تک ہونا چاہیے۔ ویسے ایک شیر ۱۹۲۲ء میں مارا گیا تھا جس کا وزن چھ سو پینتالیس پونڈ تھا۔ اسمیتھیز نے ۱۹۴۵ء میں ایک شیر مارا تھا جس کا وزن سات سو پانچ پونڈ تھا۔

اگر ان چاروں شیروں کے وزن کو جوڑا جائے اور حاصل جمع کو چار سے تقسیم کر دیا جائے تو اوسط، پانچ سو تئیس آتا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام حالات میں شیر کا وزن پانچ سو پونڈ سے ساڑھے پانچ سو پونڈ تک ہوسکتا ہے۔ دوسرے محققین بھی شیر کا لگ بھگ یہی وزن بتاتے ہیں۔

شیر کی چھلانگ

چھلانگیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک لمبی چھلانگ جس کو لانگ جمپ کہتے ہیں۔ دوسری اونچی چھلانگ جس کو ہائی جمپ کہتے ہیں۔

ہندستان کے جنگلوں کا کوئی جانور شیر کی اس صفت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شیر کے جسم کی یہ دونوں صلاحیتیں، طاقت اور جسم کا لوچ، اس کے چھلانگ لگانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لمبی لمبی چھلانگیں بڑی آسانی سے لگا لیتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے، کودنے میں جسم کا لوچ ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ دوسرے جسمانی طاقت بھی ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ جب کسی شے میں یہ دونوں چیزیں یکجا ہو جائیں تو اونچا کودنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔

قطب یار جنگ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ شیر کو ایک نالہ کودتے ہوئے دیکھا۔ جب اس نالے کے دونوں کناروں کا فاصلہ ناپا گیا تو بیس فٹ نکلا۔ یہ فاصلہ شیر نے بڑی آسانی سے کود کر طے کر لیا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک شیر نے بغیر دیکھے ہوئے بلکہ بیٹھے بیٹھے دس بارہ فٹ لمبی اچھال ماری۔ اگر کوئی اس طرح دس بارہ فٹ لمبی چھلانگ لگا سکتا ہے، تو دوڑ کر یا اسٹارٹ لے کر تیس بتیس فٹ کو دنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جو لوگ جنگلوں میں گھومنے پھرنے کے شائق ہیں، انہوں نے اکثر جنگل کے درختوں کے تنوں پر لمبے لمبے گھاؤ دیکھے ہوں گے۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ گھاؤ شیر کے ناخونوں کے ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ مجھے یہ گھاؤ ناپنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت ناپنے کے لیے کوئی ٹیپ وغیرہ میرے پاس نہیں تھا، لیکن اندازہ کرنے کے لیے میں بیل گاڑی کی پٹیا پر کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھ لمبے کر کے اس گھاؤ کو چھوا۔ بیل گاڑی کی پٹیا زمین سے تقریباً چھ فٹ اونچی ضرور ہو گی۔ میں جب ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوتا ہوں تو میری انگلیوں کے پوروے زمین سے ساڑھے سات فٹ اونچے ضرور رہتے ہیں۔ اگر چھ فٹ اور ساڑھے سات فٹ کو جوڑا جائے تو حاصل جمع

ساڑھے تیرہ فٹ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیر اونچائی میں ساڑھے تیرہ چودہ فٹ تک ضرور کود سکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ مچان ہمیشہ چودہ فٹ یا اس سے کچھ اونچا باندھا جاتا ہے۔

شیر کی یہ تمام صفتیں جو میرے ذہن میں تھیں، بیان کر چکا ہوں۔ نہ صرف شکاری بلکہ عام آدمی کے لیے بھی شیر کی ان صفات کا جاننا ضروری ہے۔ لیکن برسبیل تذکرہ اگر شیر کی ایک اور عادت کا ذکر کر دیا جائے تو میرے خیال میں کوئی نامناسب بات نہ ہوگی۔

شیر کا ملاپ (جوڑا ملانا)

کسی شکاری نے، یہاں تک کہ جوئے ایڈمسن نے بھی اپنی کسی کتاب میں شیر کے ملاپ (Mating) کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہ شیر کی وہ صفت ہے، جس کو شکاری کبھی دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں، وہ لوگ جو جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں یا شیروں کو شوقیا پالتے ہیں، یا چڑیا گھروں میں وہ لوگ جو اس کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں شیر کی اس صفت کے چشم دید گواہ ہو سکتے ہیں۔

شیرنی جب بہار پر ہوتی ہے تو ایک خاص آواز کے ساتھ شیروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شیرنی کی اس آواز کو سُن کر جنگل کے تمام جوان شیر، شیرنی کے آس پاس اکٹھا ہو جاتے ہیں اور پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے ایک یدھ شروع ہوتا ہے جس کو آپ سوئمبر کہہ سکتے ہیں۔ تو اس بھیانک جنگ میں جو بہادر جیت جاتا ہے، وہ وقتی طور سے بلاشرکت غیرے اس شیرنی کا مالک ہو جاتا ہے، لیکن یہ کوئی بندھا ٹکا قانون نہیں ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہو۔ اکثر لوگوں نے ایک گرم اور بہار پر آئی ہوئی شیرنی کے ساتھ ایک سے زیادہ شیر بھی دیکھے ہیں۔

جب شیر اور شیرنی یک جا ہو جاتے ہیں تو وہ جنگل کے دوسرے جانوروں کے لیے بہت بھاری اور مشکل وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں شیر جس جانور کو دیکھتا ہے، دوڑ پڑتا ہے اور مار دیتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں لوگوں نے پانچ پانچ چھ چھ جانوروں کی لاشیں ایک جگہ جمع

دیکھیں۔ اس وقت شیر آدمی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ اس کو بھی دیکھتے ہی دوڑا دیتا ہے۔ ویسے عام حالت میں شیر آدمی کو دیکھ کر خود ہٹ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شیر ملاپ کے وقت بالکل تنہائی چاہتا ہے اور کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اس وقت وہ آوازیں بھی بڑی ڈراؤنی آواز خوفناک نکالتا ہے جو اپنی نوعیت میں عجیب سی ہوتی ہیں اور جن کو شیر کی عام آواز ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ بہادر سے بہادر آدمی بھی ان آوازوں کے سننے کی تاب نہیں لاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شکاری ان آوازوں کو سُن کر شیر کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرتے اور جنگل چھوڑنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں، اس وجہ سے وہ شیر کے اس فطری عمل کو بھی دیکھ نہیں سکتے۔

ایک مرتبہ راجہ صاحب 'گولا بلاک' میں ایک بہت بڑے کنارے کا ہانکا کروانا چاہتے تھے جو گولا بھیرا روڈ سے پچھم کی طرف تھا۔ اس ہانکے کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا کئی اور گانوؤں سے پاسی اس ہانکے کے لیے بلوائے گئے تھے۔ کیونکہ یہ کنارہ بہت گھنا اور کانٹے دار جھاڑیوں اور پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم لوگ اپنی جائے قیام سے اس جگہ پیدل روانہ ہوئے۔ ہانکے والوں کو جگہ بتا دی گئی تھی۔ وہ وہیں اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہم لوگ جب پُل پر پہنچے ہیں، جو لکڑی کا بنا ہوا تھا، تو اس وقت ہانکا کرنے والے وہاں موجود تھے۔ ہانکا کرنے والوں میں سے ایک بڑھا پاسی راجہ صاحب کے پاس آیا اور ان سے سرگوشی کے انداز میں کچھ باتیں کیں۔ میں چونکہ ان سے کچھ فاصلے پر تھا، اس وجہ سے ان کی باتیں نہیں سن سکا۔ راجہ صاحب نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں ان کے قریب گیا تو انہوں نے کہا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ پُل پر کھڑے رہو۔ اور کسی ہانکے والے کو پُل کے نیچے دریا کے کنارے مت اُترنے دینا۔ میں بھی آتا ہوں۔ مجھے یہ حکم دے کر راجہ صاحب اس پاسی کے ساتھ پُل سے اُتر کر پچھم کی سمت چل دیے۔ راجہ صاحب کی واپسی کافی دیر بعد ہوئی۔ اس دوران راجہ صاحب جدھر گئے تھے اس طرف سے شیر کی کچھ عجیب قسم کی بھیانک دہاڑنے کی آوازیں آئیں۔ میں ان آوازوں کو شیر کی آواز ماننے کو آج تک تیار نہیں۔ جب راجہ صاحب واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ ان کناروں کا ہانکا نہیں ہوگا۔ تم سب لوگ پھر

اسی جگہ چلو۔ وہیں ہانکا ہوگا۔

اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد ایک بار جب راجہ صاحب موڈ میں تھے، تب انہوں نے اس کنارے کا ہانکا نہ کرانے کی وجہ بتائی۔ بولے، میں نے خود اپنی آنکھ سے کنارے کے دوسری طرف شیر کو جفتی کرتے دیکھا تھا۔ اگر اس کنارے کا ہانکا ہوتا تو کئی ہانکے والوں کا شیر سے زخمی ہو جانا لازمی تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر میں نے اس روز ہانکا ملتوی کرا دیا تھا۔

لیکن پھر دوسرے مہینے میں نے اُس شیر کو مارلیا۔ اس روز تم میرے ساتھ نہیں تھے۔

یہ شیر کی وہ صفت ہے جسے عموماً شکاری نہیں دیکھ سکتا۔ شیر جفتی کرتے وقت پیچھے سے سوار ہوتا ہے اور شیرنی کی گردن کی کھال منہ سے پکڑ لیتا ہے لیکن بہت ملائمت کے ساتھ۔ اس کے بڑے بڑے دانت شیرنی کی کھال پر خراش نہیں ڈالتے۔ شیر کا یہ موڈ کم از کم پانچ یا سات دن رہتا ہے۔ اس درمیان میں ایک دن میں پندرہ یا بیس مرتبہ جماع کرتا ہے۔ لیکن جماع کا وقفہ بہت قلیل ہوتا ہے۔ بمشکل تمام بیس یا تیس سکنڈ کا وقت۔ انزال کے وقت شیر ایک بھیانک آواز نکالتا ہے اور فوراً شیرنی پر سے اُتر آتا ہے۔ شیرنی بھی فوراً گھوم جاتی ہے اور اظہار طمانیت کے طور پر شیر کو ایک پنجہ رسید کرتی ہے۔

شیر کی ایک اور عادت ہے، جو بہت عجیب ہے۔ وہ جب دریا میں تیرے گا تو دھار کے خلاف سمت میں تیرے گا۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنا اس کو پسند نہیں۔ جب شیر کو کسی دریا یا نہر کو پار کرنا ہوگا تو ناک کی سیدھ میں دوسرے کنارے پر جانے کی کوشش کرے گا۔ اگر دھار یا پانی کا بہاؤ اس کو پیچھے کھینچ کر اس سیدھ سے جس پر وہ جانا چاہتا ہے، اِدھر اُدھر ہٹا دے تو وہ پھر واپس اسی جگہ چلا جائے گا جہاں سے پانی میں داخل ہوا تھا۔ چاہے اس نے آدھا راستہ ہی کیوں نہ طے کر لیا ہو۔ واپس آ کر وہ پھر دھار کو کاٹنے کی کوشش کرے گا۔ اگر اس مرتبہ بھی اس کو کامیابی نہ ہوئی تو پھر وہ تیسری مرتبہ کوشش کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائے۔ برابر اسی طرح تیرتا رہے گا، دوسرے کنارے پر تب ہی نکلے گا جب تک وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ سیدھا تیر کر آیا ہے۔

یہ منظر میں نے اور راجہ صاحب نے خود کھیری برانچ میں دیکھا ہے۔

شیر کے متعلق جہاں تک میرا علم اور تجربہ تھا، میں نے اس کو آپ کے سامنے پیش کر دیا، یا یوں سمجھئے کہ یہ باب تو ختم ہو گیا۔ لیکن اگر راجہ صاحب کے چند دلچسپ واقعات اس کتاب میں نہ لکھے گئے تو میرا خیال ہے کہ یہ کتاب ادھوری رہ جائے گی۔ ہماری شکاری زندگی میں کچھ ایسے کیریکٹر بھی سامنے آئے جن کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کے ساتھ بڑی نا انصافی ہوگی۔

ہمارے شکاری ساتھی
اور
ان کے دلچسپ قصے

ہم لوگوں میں ایک زبردست عیب ہے کہ کسی چیز پر مکمل عبور حاصل کیے بغیر ہی اپنے آپ کو اس کا ماہر خیال کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے شکاری بھی اس عیب سے بری نہیں۔ اگر اتفاق سے کسی شخص کو بندوق کا لائسنس مل جائے تو وہ بلا روک ٹوک شکار کھیلنے لگتا ہے اور اگر کہیں اس نے دھوکا دھڑی سے دو ایک جانور مار لیے تو وہ اپنے آپ کو کاربٹ سمجھنے لگتا ہے۔ پھر آپ کو اس سے شکار کے معاملہ میں بہت محتاط ہو کر گفتگو کرنی ہوگی۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ شکاری بہت جھوٹا ہوتا ہے۔ وہ آپ سے شکار کے ایسے محیرّالعقول قصے بیان کرے گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔

ایک مرتبہ پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ لاہور میں ایک دوست نے میری ملاقات چند شکاری حضرات سے کرادی۔ وہ لوگ مرغابی وغیرہ کا شکار کھیلتے تھے۔ نیک اور شریف لوگ تھے۔ کبھی ان کو ہندستان آنے کا موقع نہیں ملا۔ اس وجہ سے یہاں کے جغرافیائی حالات سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ سے یہاں کے شکار کی بابت پوچھا۔ میں نے ان کو یہاں کی وسیع اور خوبصورت جھیلوں کے بارے میں بتایا۔ مرغابیوں کی اقسام کے متعلق بتایا جو خطوں کے حساب سے بٹی ہوئی تھیں۔ سو میل لمبی چوڑی چلکا جھیل اور وہاں مرغابیوں کی کثرت کے متعلق بتایا جو اس جھیل میں گرتی ہیں۔ اس میں ٹاپوؤں کے متعلق بتایا، جہاں کیوڑے کی خودرو جھاڑیاں اُگتی ہیں، ان میں سانپوں کی کثرت ہے۔ مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے جنگلوں کے متعلق بتایا، جہاں آم اور املی کے گھنے جنگل ہیں۔ وہاں کی زمین کے متعلق بتایا

جو پانی پڑنے پر جل تھل ہو جاتی ہے۔ ان میں ارنا بھینسوں کے متعلق بتایا جو انتہائی خطرناک اور غصیلے ہوتے ہیں۔ جن کی ناک تین میل دور سے آدمی کی خوشبو سونگھ لیتی ہے۔

ہمالیہ پہاڑ کی ترائی کے گھنے جنگلوں کے متعلق بتایا، جس میں اُگنے والی گھاس کی ''اقساموں'' کے متعلق بتایا۔ اس میں پائے جانے والے جانوروں کے متعلق بتایا۔ اس میں اُگنے والے کوروں کے درختوں کے متعلق بتایا کہ وہ کتنے گھنیرے، لمبے اور موٹے ہوتے ہیں۔ اور ان کی عمر دوسو سال تک ہوتی ہے۔ ڈھاک کے جنگلوں کے متعلق بتایا۔ اس کے موٹے موٹے سرخ پھولوں کے متعلق بتایا جو چیت مہینے میں کھلتے ہیں اور جب وہ کھلتے ہیں تو جنگل میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آگ لگی ہو۔ پہاڑ پر کاسنی کے جنگلوں کی بابت بتایا کہ جب وہ پھولوں سے بھرے ہوتے ہیں تو جنگل میں کتنی خوشبو پھیلتی ہے۔ بَن چمبلی اور چمپا کی خوشبوئیں جنگل میں کیسا رنگ بکھیرتی ہیں۔ ان میں رہنے والے ہاتھی کتنے گرانڈیل ہوتے ہیں۔ روگ ہاتھی کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ بانجھ کے درخت پہاڑوں کو کتنا پانی فراہم کرتے ہیں۔ ان میں مرغ اور فیزنٹ کتنی اقسام کے ہوتے ہیں۔ چکوریں کتنی خوبصورت ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ لوگ سُنتے رہے اور دنگ ہوتے رہے۔ کیونکہ پاکستان میں یہ کچھ نہیں ہوتا۔ پھر شیر کی بات چھڑی۔ ان لوگوں نے شیر مارنا تو کُجا، دیکھا تک نہیں تھا۔ ان کے ہاں اول تو جنگل ہے ہی نہیں اگر کچھ ہیں بھی تو جانوروں اور چڑیوں کی یہ اقسام بالکل نہیں۔ پھر شکاریوں کی بات چل نکلی۔ ان کے ملک کے لوگ ان 'خرافات' میں بالکل نہیں پڑتے۔ نہ ہی ان کے پاس اتنا فالتو وقت ہے اور نہ مواقع، جو وہ یہ سب کچھ کریں۔ پھر بات شکار کے لٹریچر پر چلی۔ اس وقت ان میں سے ایک صاحب نے بہت سینہ پُھلا کر کہا۔ انہوں نے ایک کتاب پڑھی تھی، جو بھارت کے ایک شکاری نے لکھی تھی اور جو کئی شیر سُندر بن میں مار چکے ہیں۔ پاکستان میں اب وہ شیروں اور اس کے شکار پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں۔ اور شاید ان کی کسی کتاب کے چند قصے بی۔ بی۔ سی سے بھی نشر کئے جا چکے ہیں۔ ان کا نام یہ...... ہے۔ آپ نے بھی شاید یہ نام سنا ہو۔ ان کے نام لینے پر مجھے یاد آیا کہ یہ صاحب میرے ہی شہر کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد شاید محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ وہ ایک مرتبہ راجہ ضیاء اللہ صاحب کے ساتھ کسی شکار میں

گئے بھی تھے۔ ان کی 'بہادری' کا ایک قصہ رابعہ صاحب کے ملازم نے مجھ کو بھی سنایا تھا۔ ان کے اس واقعے کو یاد کر کے اور سُندر بَن ایسے جنگل میں ان کے شیروں کے شکار کا سُن کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میرے خیال نے فوراً پلٹا کھایا اور ذہن میں آیا کہ خدا بڑا کارساز ہے۔ اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ جس کو جب اور جہاں چاہے نواز دیتا ہے۔ میں تعجب کرنے والا کون۔ مجھے زیرِ لب مسکراتا دیکھ وہ صاحب میرے سَر ہو گئے۔ وہ میری مسکراہٹ کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔ میں کیا بتاتا۔ بات بنا کر خاموش ہو گیا اور ان سب سے رخصت چاہی۔ یہاں آ کر رابعہ صاحب سے ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی اس کا خوب خوب لطف لیا۔ پھر بولے تم ان سے ملے کیوں نہیں۔ تمہاری لیاقت میں اضافہ ہو جاتا۔

لیجئے بات کیا تھی اور لے کیا بیٹھا۔ قصہ مختصر۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بندوق اور وہ بھی بارہ بور، اس کا چلانا مذاق نہیں ہے، رابعہ صاحب، جنہوں نے زندگی بھر بندوق چلائی، دسیوں بندوقیں اور رائفلیں چلا چلا کر بیکار کر دیں، کارتوسوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر سال میرے نانا جان بارہ بور کے دس ہزار کارتوس منگواتے تھے جو میں اور صرف میں ہی چلا چلا کر ختم کر دیتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بھی یہی اصول میرا رہا۔ تم بھی جانتے ہو۔ اب جب کہ کارتوس ناپید ہو گئے ہیں، تب بھی میں تم سب سے زیادہ کارتوس پھونکتا ہوں۔ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو گے کہ میں بہت اچھی بندوق چلانے والوں میں سے ہوں۔ لیکن آج میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ مجھے بارہ بور چلانا نہیں آتی۔ میں بالکل اناڑی تھا، اتنے کارتوس پھونکنے کے بعد بھی۔ لیکن آج میں اگر یہ کہوں کہ بڑھاپے میں جب میرے مرنے کے دن قریب آئے ہیں، تو مجھ کو بارہ بور چلانا آ گئی ہے تو غلط نہ ہو گا۔

میں یہ سن کر جل گیا اور کہنے لگا کہ اچھا اب آپ اپنے اُس استاد کا نام بتا دیں تا کہ میں بھی ان سے کچھ سیکھ لوں۔ بولے سنو۔ اس کا نام ہے N-R-A-I۔ یہ تو جگہ ہے ملنے کی۔ نام اس کا ہے اسکیٹ (Skeat)۔ پھر رابعہ صاحب بولے، جب میں نے اسکیٹ پر بندوق چلانا شروع کی، تب مجھ کو اندازہ ہوا کہ میں پہلے کتنی غلط بندوق چلاتا تھا۔ ہاں اب کچھ یوں ہی سی شُد بُد ہو گئی ہے۔

یہ ہیں راجہ صاحب کے تاثرات بارہ بور کے بارے میں۔ جنہوں نے لاکھوں کارتوس چلا دیے۔ اُن لوگوں کو کیا کہیئے جن کو ابھی کل ہی بندوق کا لائسنس ملا ہو۔ او راس سے پہلے انہوں نے کبھی بندوق چھوئی بھی نہ ہو اور سمجھنے لگیں اپنے آپ کو مارکس مین۔ کیا یہ درست ہے۔

لیجئے میں پھر بہک گیا۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ شکار کھیلنے سے پہلے بندوق چلانے کا طریقہ سیکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کام میں وقت اور پیسہ، دونوں برباد کرنا ہوتا ہے۔ تب کہیں جا کر آدمی بندوق کی ابجد سے واقف ہوتا ہے۔ رائفل چلانا بمقابلہ بندوق کے زیادہ آسان ہے۔ اس میں تھوڑی پریکٹس آدمی کو اس لائق کر دیتی ہے کہ وہ صحیح نشانے پر گولی لگا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے لوگ بارہ بور چلانا بہت آسان سمجھتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے کارتوس میں سیکڑوں چھرّے ہوتے ہیں جو پھیل کر تھوڑے بہت یا دو ایک نشانے پر لگ ہی جایا کرتے ہیں۔

شیر کے شکار کے کچھ موٹے موٹے اصول ہیں، جن پر کاربند ہونا لازمی ہے۔ جو ان اصولوں کی پروانہیں کرتے، وہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو واقعات بیان کروں گا جو میری بات کو درست سمجھنے میں بہت مدد دیں گے۔

کسی کا قول ہے کہ شیر کا شکار بہت محفوظ مقام اور بڑے بور کی بندوق سے کرنا چاہئے۔ محفوظ مقام، مچان ہو گیا۔ ہاتھی ہو گیا۔ بڑی بور 375 میگنم ہو گئی۔ اس سے بڑے بور بھی ہوتے ہیں۔ رائفل سنگل بیرل نہ ہو بلکہ ڈبل بیرل ہو، کیونکہ ڈبل بیرل ایک ہی ایکشن سے دو فائر کر سکتی ہے۔ جب کہ سنگل بیرل سے ایک وقت میں صرف ایک ہی فائر ہو سکتا ہے۔ بولٹ کو کھینچ کر کارتوس نکالنے اور دوبارہ لوڈ کرنے میں وقت درکار ہوتا ہے اور وہ وقت جو اس کے کھینچنے اور چڑھانے میں ضائع ہوتا ہے، بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اسی مختصر وقت میں موت اور زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔

ایک بار ایسی ہی ایک چھوٹی سی بداحتیاطی کی بدولت، ایک زندگی کا خاتمہ ہوا، اور ایک بہت معزز خاندان تباہ ہو گیا۔ دوسرے واقعے میں زندگی تو نہیں گئی، لیکن شیر کا ڈر اتنا غالب ہو

گیا کہ اس کا نام سُن کر ان کو پسینہ آنے لگا۔ اس واقعہ کے بعد شکار میں اکثران کے فیصلے غلط ہونے لگے وہ خودغرض ہو گئے اور یہ چاہنے لگے کہ خطرہ دوسرے اٹھائیں اور شیر کے شکاری وہ کہلائیں۔ ان کی اس ذہنیت کی بدولت اکثر لوگ ان کے ساتھ شکار کھیلنے کے دوران مشکلوں میں گھر چکے ہیں۔

شیر کا شکار، شیر کو شیر سمجھ کر کرنا چاہیے، کتا بلی سمجھ کر نہیں۔ یہ جملہ میرے ایک عزیز نے دوسرے رشتہ دار سے کہا تھا۔ جو بچپن سے میرے کانوں میں گونجتا تھا۔ اِس وقت جو اس جملہ کو لکھا تو وہ واقعہ یاد آ گیا، جو آج تک ذہن کی گہرائیوں میں دَبا ہوا پڑا ہے۔

میرے شہر میں ایک بزرگ، شیر کے بڑے زبردست شکاری تھے۔ ان کی ایک شکاری پارٹی تھی جس میں صرف ان کی پسند کے لوگ ہی ان کے ساتھ شکار میں جا سکتے تھے۔ میرے ایک جواں عمر رشتہ دار نے ایک مرتبہ ان کی بڑی منت سماجت کر کے ان کے شکار میں اپنے لیے جگہ نکال ہی لی۔ میرے یہ رشتہ دار بہت نڈر اور بہادر انسان تھے۔ ڈر اور خوف، وہ جانتے ہی نہ تھے۔ ان کی اس خصوصیت سے ایک دوسرے بزرگ جن کے ساتھ یہ شکار میں گئے تھے، خوب واقف تھے اور اُن کا بہت لحاظ اور خیال بھی کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کی لوکل پالیٹکس میں ان کے بڑے حامی اور مددگار تھے۔ جنگل میں پہنچ کر ایک ٹکڑے کے ہانکے کا انتظام ہوا۔ جس کے درمیان ایک کچّی سڑک نکلتی تھی۔ ان کو بھی ایک جگہ بیٹھنے کو کہا گیا۔ لیکن بزرگ نے ان کے ساتھ یہ احتیاط ضرور برتی کہ علاقہ کے ایک معزز ٹھاکر کو، جن کا یہ بھی بہت لحاظ کرتے تھے، ان کے ساتھ بٹھا دیا۔ لیکن ان ٹھاکر سے چپکے سے یہ کہہ دیا کہ اگر ہانکے میں شیر وغیرہ نکل آئے تو اِن کو اُس پر فائر نہ کرنے دیا جائے۔ ٹھاکر نے حامی بھر لی۔ ہانکا شروع ہو گیا۔ اب بدقسمتی ملاحظہ ہو۔ ہانکا پڑنے کے تھوڑی دیر بعد ایک شیر ان کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شیر کو دیکھ کر پوچھا، ٹھاکر صاحب کیا ہے یہ۔ ٹھاکر صاحب نے کہا ارے لالہ تم اس کو نہیں جانتے۔ یہ شیر ہے۔ وہ بولے ارے ٹھاکر یہ شیر نہیں ہے۔ یہ تو کتا ہے۔ اتنی دیر میں شیر جنگل سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا، جس کے کنارے یہ لوگ لائن بنائے بیٹھے تھے۔ ہاں، میں یہ بات بتانا تو بھول ہی گیا کہ اس ہانکے کے دوران ابھی شکاری زمین پر ہی بیٹھے تھے،

مچانوں کا انتظام نہیں ہوسکا تھا۔

شیر نے جیسے ہی جنگل چھوڑ کر سڑک کراس کی، ویسے ہی ان صاحب نے اپنی بندوق سے گولی اور گراب کے کارتوس نکال لیے۔ اور جیب سے چھ نمبر کے کارتوس نکال کر بھر لیے ٹھاکر نے پوچھا، لالہ یہ کیا کر رہے ہو، بولے اس کو ماروں گا۔ ٹھاکر نے کہا چھ نمبر سے مارو گے۔ ٹھاکر تو اتنا سننے کے بعد درخت پر چڑھ گئے اور انہوں نے، جیسے ہی شیر ان سے دس بارہ فٹ آگے گیا ہوگا، اس کے چوتڑوں پر چھ نمبر کے دونوں فائر کر دیے۔ فائر کا لگنا تھا اور قیامت کا آنا۔ شیر اتنی ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوا بھاگا کہ خدا کی پناہ۔ تمام لوگ اپنی اپنی جگہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، وہ بزرگ جن کے ساتھ یہ شکار کھیلنے آئے تھے، بھاگ کر ان کے پاس آئے۔ دیکھا کہ ٹھاکر ندارد، ان سے پوچھا ٹھاکر کہاں گئے۔ انہوں نے درخت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اتنے میں ٹھاکر بھی اُتر کر ان کے نزدیک آگئے۔ بزرگ نے ٹھاکر سے پوچھا کیا شیر نکل آیا تھا۔ کیا انہوں نے اس پر فائر کئے۔ کیا وہ زخمی ہوگیا۔ وہ اتنی زور سے چیخیں کیوں مار رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ٹھاکر صاحب بولے میں نے ان کو لاکھ منع کیا، لیکن لالہ مانے ہی نہیں اور غضب یہ کیا کہ بجائے گولی گراب کے اس کے چوتڑوں پر چھ نمبر کے دو فائر کر دیے۔ اب وہ سالا چیختا نہیں تو اور کیا کرتا۔ اب ان بزرگ نے شکاری صاحب سے پوچھا۔ کیا تم نے شیر پر چھ نمبر کا چھرّا چلا دیا۔ ہاں بھائی صاحب۔ کتے پر اور کیا چلاتا۔ ان بزرگ نے آنکھیں نکال کر کہا، کیا وہ کتا تھا۔ وہ بولے کتا نہیں تو اور کیا تھا۔ بھائی صاحب آپ دیکھ نہیں رہے، سالا کیسے کتے کی طرح پوں پوں کرتا بھاگا چلا جا رہا ہے۔

نینی تال سے نیچے کاٹھ گودام سے تقریباً چالیس پچاس کلو میٹر پورب کی سمت ایک شکاری بلاک ہے، جس کو نندھور کہتے ہیں۔ اس بلاک میں مرغ، کلیج اور فیزنٹ کی اتنی افراط ہے اور وہ اتنے نڈر ہیں کہ آپ ایک گھنٹہ میں دس بارہ مرغ اور کلیج بڑی آسانی سے مار سکتے ہیں۔ یہ بلاک چاروں طرف سے پہاڑوں کی بہت اونچی اونچی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اور ایک پہاڑی دریا بھی ان ہی پہاڑیوں سے نکل کر اس کی وادیوں میں بہتا ہوا پیلی بھیت کے میدانوں میں نکل جاتا ہے۔ یہاں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں تو دو دو تین تین میل لمبی

چوڑی وادیاں بن گئی ہیں۔ ان ہی وادیوں میں دریائے گرا پیچ وخم کھاتا ہوا بہتا ہے جو کسی بھی جگہ ران سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس بلاک کے شمال میں فارسٹ کی ایک کوٹھی بنی ہوئی ہے جس کے تین طرف دریا بہتا ہے اور چوتھی طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے، جو ہمالیہ سے مل جاتا ہے۔ اس کوٹھی کا نام 'دُرگا پیپل' ہے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم لوگ پانچ بجے شام کی چائے پی کر مرغ اور کلیج مارنے کی غرض سے کوٹھی سے روانہ ہوئے۔ یہ راستہ تقریباً ایک یا ڈیڑھ میل دریائے گرا کے ساتھ سیدھا چل کر پچھم کو مُڑ جاتا تھا۔ اس کے بعد دوسری وادی شروع ہو جاتی تھی۔ اس میں لال ٹینا کی جھاڑیوں کی کثرت تھی۔ اُتر کی جانب چھوٹی پہاڑیوں کی ڈھلانیں تھیں جن پر بہت گھنے پیڑ اُگے ہوئے تھے اور بہت سے نالے ان پہاڑیوں سے اُترتے تھے، اس وجہ سے اس دو میل سیدھے راستے پر ہر طرح کے شکار کے ملنے کے امکانات رہتے تھے۔

ہم لوگ کوٹھی سے اس جگہ جانے کی نیت سے نکلے۔ ابھی کوٹھی سے زیادہ دور نہیں جا پائے ہوں گے کہ ایک شیر دریا کے دوسرے کنارے پر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا فاصلہ سڑک سے سو، سوا سو گز رہا ہوگا۔ راجا صاحب اور ان کے دوست گاڑی رُکوا کر نیچے اُترے اور لمبے لمبے ڈگوں سے شیر کی طرف بڑھے۔ شیر چلتا رہا۔ اس نے چھپنے یا بھاگنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہاں اس کے چھپنے کے لیے بہت عمدہ جگہیں تھیں۔ ان لوگوں نے شیر کے کافی نزدیک پہنچ کر ایک فائر کیا۔ فائر کی آواز سُن کر شیر جھاڑیوں میں گھس کر غائب ہو گیا۔ راجہ صاحب نے کہا شیر زخمی ہو کر بھاگا ہے۔ لیکن ان کے دوست جنھوں نے اس پر فائر کیا تھا، یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس وجہ سے یہ لوگ دریا پار کر کے اس اونچی چبوترہ نما جگہ پہنچے جس پر شیر چل رہا تھا۔ جہاں اس پر گولی چلائی تھی۔ تھوڑی ہی تلاش کے بعد وہ جگہ مل گئی۔ وہاں خون کی چند بوندیں پڑی تھیں۔ اور وہیں پر ایک ہڈی کا چھوٹا ٹکڑا بھی پڑا تھا۔ بات صاف ہو گئی۔ یعنی شیر زخمی ہو گیا ہے، لیکن تصدیق سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گولی اس کے کس جگہ لگی ہے۔ لہٰذا سب کی رائے ہوئی کہ اس کو اس وقت چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔ اب کل صبح دیکھا جائے گا۔ بات معقول تھی۔ سب لوگوں نے اتفاق کیا اور شکار کھیلنے آگے بڑھ گئے۔

دوسرے دن صبح نو بجے اس شیر کو تلاش کرنے پھر وہاں پہنچے جہاں خون نظر آیا تھا۔ وہ جگہ دریا سے تقریباً تین فٹ اونچی تھی اور اس کے کنارے کنارے سوسوا گز لمبائی تک چلی گئی تھی۔ شمال کی طرف یہ پہاڑ سے مل گئی تھی اور جنوب میں پتلی ہوتی ہوئی دریا کے پانی سے جا ملی تھی۔ یعنی اُتر سے دکھن تک ایک ڈھلان تھا جو دریا اور پہاڑ کے درمیان چبوترے کی شکل کا ہو گیا تھا اور جس کی چوڑائی سوسَوا سو گز رہی ہو گی۔ اس سطح مرتفع پر درخت بہت گنجان اور بڑے بڑے اُگے ہوئے تھے۔ جھاڑیاں اور جنگلی بیلیں بھی بکثرت تھیں۔ لال ٹینا تو اتنا گھنا تھا کہ چند گز آگے دیکھنا محال تھا۔ یہ جگہ شیر کے تلاش کرنے کے لحاظ سے بہت خراب تھی۔ جگہ جگہ بولڈر اور چٹانیں بکھری ہوئی پڑی تھیں، جن میں چلنا آسان نہ تھا۔

یہ پارٹی تین آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اس میں راجہ صاحب، ان کے دوست جنہوں نے کل گولی چلائی تھی اور ایک فارسٹ گارڈ شامل تھا۔ یہ تینوں آدمی بہت سنبھل سنبھل کر چھوٹی بڑی چٹانوں کو پھلانگتے جھاڑیوں پر خون کے قطروں کو تلاش کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب خون کافی تعداد میں مل رہا تھا۔ جھاڑیوں کی شاخیں اور پتے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ لیکن تھوڑا چلنے کے بعد ایک بہت بڑا بولڈر (پتھر) ان کے راستہ میں حائل ہو گیا اور خون کے نشانات بولڈر کے اُتر اور پچھم دونوں طرف دکھائی دیے۔ یہ بڑی پریشان کن بات تھی اور ظاہر کرتی تھی کہ بولڈر کی ایک سائڈ ناقابل گزر ہے، اس وجہ سے شیر وہاں سے پلٹ کر بولڈر پر سے ہوتا ہوا پہاڑی پر چڑھا ہے۔ لیکن یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ شیر پہاڑی پر اُتر کی طرف گیا ہے یا پچھم کی طرف۔ اس وجہ سے یہ پارٹی بولڈر کے پاس رُک گئی۔ طے ہوا کہ راجہ صاحب اُتر کی طرف جائیں اور پچھم کی طرف کوئی اور جائے۔ یہ بولڈر تقریباً دس بارہ فٹ لمبا چوڑا اور اتنا ہی اونچا تھا۔ اس کے کنارے بالکل سپاٹ تھے جس کی وجہ سے اس پر چڑھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

راجہ صاحب بہت محتاط ہو کر قدم قدم چلتے ہوئے رائفل کو کندھے پر لگائے، آگے بڑھنے لگے۔ ابھی یہ مشکل دس بارہ قدم ہی آگے گئے ہوں گے کہ ایک بندر جو وہیں کسی درخت پر بیٹھا تھا، کر کرایا۔ اس کی آواز سن کر راجہ صاحب رُک گئے اور اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگے۔ ابھی یہ چار چھ قدم ہی واپس ہوئے ہوں گے کہ شیر دہاڑتا ہوا اُن پر دوڑ پڑا۔ شیر کا یہ

چارج ایک لحاظ سے بہت خطرناک تھا۔ ایک تو ناہموار زمین اور دوسرے اس کی چال جو کسی جانور کی تو معلوم ہی نہیں ہو تی تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بہت بڑا ڈرم ہے جو لڑھک رہا ہے اور زمین کی ناہمواری اس کو گدے کھلا رہی ہے۔ تیسرے نزدیکی۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ رائفل کی گولی کو نزدیک کے ٹارگیٹ پر صحیح نشانے پر بٹھانا بہت مشکل کام ہے۔ لہٰذا وہی ہوا۔ راجہ صاحب نے گولی چلائی جو شیر کے کسی نازک حصہ کو نقصان نہیں پہنچا سکی۔ لیکن ان کے دوست جو پتھر کے دوسری طرف تھے، ان کے لیے اس شیر پر گولی چلانا زیادہ آسان تھا کیونکہ شیر کی سائڈ ان کی طرف تھی۔ راجہ صاحب کے دوست نے اس پر اپنی 470 بور سے تڑ تڑا کر دو فائر کیے جس میں سے ایک گولی اس کو لگی فائروں کی آواز سن کر اور گولی کے دھکے سے شیر کا منہ اب راجہ صاحب کی طرف سے مڑ کر اُن کے دوست کی طرف ہو گیا، اور وہ راجہ صاحب کو چھوڑ کر ان کے دوست کی طرف تین ٹانگوں پر لڑکھتا ہوا پلٹا۔ راجہ صاحب نے فائر کرنیکے بعد ۔اپنی رائفل کا بولٹ کارتوس بدلنے کے لیے کھینچا۔ بولٹ کھینچتے ہی وہ رائفل سے نکل کر ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ انہوں نے بولٹ اور رائفل وہیں پھینکی اور کندھے پر سے بارہ بور اُتاری جو سیلنگ سے ان کے کندھے پر لٹک رہی تھی اور جس میں الفا میکس کے دو کارتوس لگے ہوئے تھے۔ لیکن اتنے عرصہ میں شیر ان کے دوست کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اپنے بھیانک منہ کو کھولے ان پر حملہ آور ہو نا چاہتا تھا۔ ان کے دوست اپنی رائفل کا سیف چڑھاتے تھے، اور اس پر فائر کر تے تھے۔ لیکن رائفل کے دونوں کارتوس تو چل چکے تھے، وہ چلتی کیا خاک۔ وہ اتنے نروس ہو گئے تھے کہ اپنی جیب میں سے دوسرے کارتوس نکال کر لگانا ہی بھول گئے۔ ان چلے ہوئے کارتوسوں پر ہی فائر کیے جاتے تھے۔ جب شیر نے پنی گردن آگے کھینچ کر ان کو پکڑنا چاہا، انہوں نے اس کے منہ کو اپنی رائفل کی نال سے ہٹانے کی کوشش کی اور جب اس میں کامیاب نہ ہو سکے، تو اپنے پیر کو اٹھا کر اس کے منہ پر مارنے کی کوشش کی۔ اور جیسے ہی ان کا پیر اس کے منہ کے قریب گیا، شیر نے ان کے پیر کو منہ سے پکڑ لیا۔ یہ لڑ کھڑا کر گر پڑے اور بڑی زور سے چیخے۔ راجہ دوڑو۔ شیر مارے ڈالتا ہے۔ راجہ صاحب ان کی آواز سن کر واقعی دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ شیر اور ان کے دوست، دونوں ایک دوسرے سے گتھے

پڑے ہیں۔ شیر اپنا الٹا پنجہ اٹھا کر ان کو کھینچنا چاہتا تھا، ویسے ہی راجہ صاحب نے اپنا پیر اس کے اگلے پنجہ پر رکھ کر دبا دیا۔ وہ اپنا پنجہ نہیں اٹھا سکا۔ لیکن اس نے اپنا سر ضرور اٹھایا۔ جیسے ہی اس کا سر زمین سے ذرا سا اٹھا، ویسے ہی بندوق کی نالی راجہ صاحب نے اس کے منہ میں گھسیڑ دی اور زور لگا کر اس کی حلق میں ٹھونسنے کی کوشش کی لیکن شیر نے پھر بھی ان کے دوست کی ٹانگ، جو منہ میں دبائے ہوئے تھا، نہیں چھوڑی۔ اب راجہ صاحب خالی ہاتھ تھے۔ ان کی رائفل پہلے ہی بیکار ہو چکی تھی اور دور پڑی تھی بارہ بور شیر کے حلق میں اُتر چکی تھی۔ ان کے دوست کی رائفل بھی کچھ دور پڑی تھی۔ شیر دم ہی نہیں توڑ رہا تھا۔ یہ کیا کرتے۔ اسی وقت انہیں فارسٹ گارڈ یاد آیا جو بھاگ کر ایک درخت پر چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اس کو آواز دی جو بدقت تمام درخت پر سے اُتر کر ان کے پاس آیا۔ اس کی بندوق شیر کے کان پر رکھ کر ایک فائر کیا، تب کہیں جا کر اس کی جان نکلی۔ اب سوال تھا ان کی ٹانگ کو شیر کے منہ سے نکالنے کا اُس دن معلوم ہوا شیر کے جبڑے میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ دونوں آدمیوں نے پوری طاقت لگا کر اس کا منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن مرے ہوئے شیر کا منہ کھولنے میں یہ لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔ راجہ صاحب نے فارسٹ گارڈ سے اپنی رائفل منگوائی۔ اس کی نال بھی شیر کے منہ میں ٹھونسی گئی۔ اور قینچی بنا کر دونوں بندوقوں کی نالوں کو اُٹھایا گیا۔ تب کہیں جا کر ان حضرت کا پیر شیر کے منہ سے باہر نکلا۔ یہ کھسک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھا۔

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

جس طرح نندھور کے واقعہ کے چمپئن راجہ صاحب نے اپنے ایک ساتھی کی جان ایک زخمی شیر سے بچائی تھی۔ بالکل ایسا ہی ایک واقعہ براہی بلاک میں ہوا، جس میں دو شکاری ایک زخمی شیر نے مار ڈالے اور ان کے شکاری دوست اُن کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

اس واقعے کا لکھنے کا مقصد کسی کی دل شکنی یا بُرائی کرنا مقصود نہیں، بلکہ شکاریوں کے گوش گزار کچھ ایسے نکتے بیان کرنا ہے کہ اگر ایسی صورت حال آن پڑے تو اپنے اوسان نہیں

کھونے چاہئیں۔

کچھ ایسی عادتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے آدمی کو اکثر سوسائٹی میں شرمندہ ہونا پڑ جاتا ہے اور کبھی کبھی وہی عادتیں بڑے حادثوں کا باعث بھی بن جاتی ہیں، جن میں موت تک واقع ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک خراب عادت ہمارے ایک شکاری دوست، جو ایک بہت بڑے سرکاری عہدہ پر تھے، ان میں بھی تھی۔ ہمارے یہ دوست بہادر اور طاقت ور انسان تھے۔ گوشت کھانے کے بہت شوقین، اس وجہ سے دوسرے تیسرے دن شکار مارنا ان کی ضرورت ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ بے تکلف جنگلوں میں گھسر تے اور جنگل کے محکمہ والوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس وجہ سے وائلڈ لائف والے ان کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے سامنے آنے سے بھی ڈرتے تھے۔ وائلڈ لائف والوں سے اکثر میری ملاقاتیں شکار کے سلسلہ میں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ان کی شکایتیں کرتے۔ انہی لوگوں نے بتایا کہ ان کے محکمہ میں ان کی ایک بلیک فائل کھول دی گئی ہے اور محکمہ کسی دن انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے والا ہے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ جنگل میں پکڑے تو ضرور گئے، لیکن وائلڈ لائف والوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ ایک شیر کے ذریعہ۔ کیسی جوان موت ہوئی ان کی اور کیسی بیکسی کی۔ وہاں پر نہ تو ان کا عہدہ کام آیا، نہ ہی طاقت اور نہ ہی ان کے وہ ہم راہی جو شکار میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

اس واقعہ میں تین چار بڑی فاش غلطیاں کی گئیں۔ اس طرح کی غلطیاں اکثر شکاری کر جاتے ہیں۔ غلطی نمبر ایک، وہ بُری عادت جوان افسر میں تھی اور جس کا ذکر آگے آئے گا۔ دوسری غلطی ایسے لوگوں کا ساتھ جو کم ہمت اور ناتجربہ کار تھے۔ تیسری غلطی بڑی پارٹی کا ہونا۔ چوتھی غلطی ہائی وراسٹی رائفل کا شیر پر استعمال، جو شکار کے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ جس بلاک کا یہ ذکر ہے، وہ ایک طرف نیپال سے ملا ہوا ہے اور دوسری طرف پکلیا سے، اس وجہ سے اس بلاک میں ہر قسم کے شکار کی کثرت ہے۔

یہ افسر گرمیوں کی ایک رات اپنی جیپ سے سڑک پر آہستہ رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھی سرچ لائٹ سے جنگل کو منور کئے، جانور تلاش کر رہے تھے۔ ابھی تک ان کو

جانور تو ایک بھی نہیں ملا تھا البتہ ایک شیر پانی پینے ضرور آتا ہوا دکھائی دیا۔ جیسے ہی سرچ لائٹ کی تیز روشنی اس پر پڑی وہ بڑی تیزی سے نہر کی سڑک سے نیچے جنگل میں اُتر گیا اور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ان لوگوں نے اپنی جیپ اس سے بیس پچیس گز دور کھڑی کر دی۔ جھاڑیاں چھدری تھیں۔ اس لیے سرچ لائٹ کی روشنی میں بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان افسر نے بجائے بڑے بور کی رائفل یا بارہ بور کی گولی چلانے کے تین سو تین بور کی رائفل کی ایک گولی اس کے ماردی جو اس کے جسم کے اگلے حصہ کو چھیدتی ہوئی اس کے بدن کے پار ہو گئی۔ شیر بندوق کی آواز سے ڈر کر جنگل میں بھاگ گیا۔ اس وقت اس نے گولی کے زخم کی تکلیف کو محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ گولی بہت چھوٹی تھی اور طاقت ور بھی تھی اس لیے اس کے جسم کو زیادہ نقصان نہ پہنچ سکی۔ چوٹ بھی گرم تھی اس وجہ سے شیر کو بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ لیکن جنگل میں داخل ہو کر جب شیر کے زخم کو ہوا لگی اور بھاگنے کی وجہ سے خون بہنا بند نہ ہوا، تب اس کی سمجھ میں آیا کہ جیپ سے اس کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اور نقصان پہنچانے والے آدمی ہیں۔ خون کافی نکل جانے کی وجہ سے شیر جنگل میں دور تک نہ جا سکا اور اپنے دل میں انسانوں کے تیئں نفرت لیے ہوئے، وہیں فالسے کی جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ جنگل کا یہ ٹکڑہ پہلے زمینداری میں تھا، اس وجہ سے اس میں کوروں کے بہت پتلے پتلے لیکن بہت لمبے درخت تھے، جن کو بَلّی کہتے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ بیب گھاس کی جھاڑیاں تھیں۔ باقی جگہ فالسے کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اس وجہ سے نظر بہت دور تک نہیں جا سکتی تھی۔

یہ افسر پرانے شکاری ہونے کی وجہ سے اس جنگل سے بخوبی واقف تھے۔ بندوقوں کے بارے میں بھی بہت اچھی معلومات رکھتے تھے۔ اور شیر کی عادتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس وجہ سے رات میں جیپ سے جنگل میں نہیں گئے۔ وہیں سے اپنی جائے قیام پر واپس آ گئے۔ دوسرے روز صبح یہ لوگ پھر اسی جگہ پہنچے جہاں رات میں شیر پر گولی چلائی تھی۔ کیونکہ یہ اب گورنمنٹ ریزرو فاسٹ تھا، اس وجہ سے ہاتھی وغیرہ سے شیر کو ڈھونڈنا مناسب نہیں تھا۔ وقت بھی دن کا تھا، لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ سب ساتھی پَرا باندھ کر جنگل میں گھسیں اور اگر شیر دکھائی دے تو گولیاں چلائیں۔ یہ طے کر کے یہ لوگ جنگل میں گھس گئے۔

ابھی نہر سے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے، ویسے ہی ان کے کانوں میں لوگوں کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ افسر فوراً سمجھ گئے کہ شیر نے کچھ لوگوں کو رپٹا دیا ہے جس کی وجہ سے جنگل میں یہ شور مچا ہوا ہے۔ یہ تیز قدم بڑھاتے ہوئے اس طرف چلے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی پوری پارٹی لائن بنائے چلی۔ یہ لوگ جب اس جگہ پہنچے جہاں سے شور کی آوازیں آرہی تھیں تو دیکھا کچھ لوگ کوروں کے پتلے پتلے پیڑوں سے چپٹے چلا رہے ہیں۔ اور ان کے نزدیک کچھ کھاپڑ، کچھ لاٹھی بلّم بھی پڑے ہیں۔ ان لوگوں نے شکاریوں کو دیکھ کر درختوں سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ ان کو اُترتے دیکھ کر ان افسر نے ان کو ڈانٹا اور پوچھا، پہلے یہ بتاؤ کہ ان پتلے پتلے سیدھے درختوں پر چڑھ کیسے گئے۔ اور دوسری بات یہ بتاؤ کہ اتنی صبح اتنے لوگ جنگل میں کیوں آئے۔ وہ بولے صبح کو ہم لوگ جنگل میں کھابڑیں لگانے جا رہے تھے۔ جب یہاں پہنچے تو ایک شیر جھاڑیوں سے نکل کر ہم پر جھپٹ پڑا۔ کچھ لوگ تو بھاگ گئے مگر ہمارے کندھوں پر کھابڑیں لدی تھیں، اس وجہ سے ہم بھاگ نہیں سکے۔ ہم ان کو پھینک کر ان درختوں پر چڑھ گئے۔ شیر تھوڑی دیر ان درختوں کے چکر کاٹتا رہا۔ پھر سامنے والی جھاڑیوں میں چلا گیا اور شاید اب بھی وہیں بیٹھا ہے۔

ان افسر نے ان لوگوں سے کہا، اچھا تم ان درختوں پر ہی بیٹھے رہو۔ ہم جاتے ہیں اور اس شیر کو مارتے ہیں۔ جب مر جائے تو تم اُترنا۔ تم لوگوں کو نیچے دیکھ کر پھر دوڑ سکتا ہے۔

الغرض وہ درختوں پر چڑھے اور پہلے کی طرح تنوں سے چپکے رہے اور شکاری پارٹی اس طرف جدھر ان لوگوں نے شیر کو جاتے دیکھا تھا، پرا باندھ کر چلی۔ ابھی یہ لوگ نالہ کی جھاڑیوں تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ ان جھاڑیوں میں بھونچال سا آگیا۔ ایک شیر بڑی بھیانک آوازیں نکالتا ہوا ان پر جھپٹ پڑا۔ یہ شیر جس طرف سے نکلا تھا، اس طرف ان افسر کے بھائی کا ایک نوکر بندوق لیے چل رہا تھا۔ شیر پہلے اس پر جھپٹا۔ یہ آدمی کافی تجربہ کار پُرانا منجھا ہوا شکاری تھا۔ یہ شیر کو داؤں دے گیا۔ اور بھاگ کر ایک درخت پر جو دس بارہ فٹ اونچا تھا چڑھ گیا، اب شیر نے پلٹ کر ان افسر کے بھائی پر حملہ کیا۔ انہوں نے اس پر اپنی بارہ بور کی بندوق سے ایک فائر کر دیا۔ وہ بھی بہت پُرانے اور باہمت شکاری تھے، اس وجہ سے بھاگے نہیں۔ ان

کا فائر شاید لگا نہیں یا دو ایک گراب لگ بھی گئے ہوں۔ لیکن وہ شیر کو روک نہ سکے۔ فائر کے ہوتے ہی شیر نے ایک قلانچ لگائی اور ان کے سر کر منہ سے پکڑ کر دبا دیا۔ تڑاخ کی ایک آواز ہوئی، اور وہ مردہ ہو کر زمین پر گر پڑے۔ تڑاخ کی آواز اور شیر کو ان پر کودتے دیکھ کر وہ افسر اپنے بھائی کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑے۔ ارے دڈا کو شیر نے مار ڈالا۔ اور جیسے ہی شیر نے ان کو دیکھا، انہوں نے تھری ناٹ تھری کا ایک فائر کر دیا اور یہیں پر ان کی بُری عادت نے انہیں لے ڈالا۔ ان کی بری عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی سے بات کرتے اور وہ شخص انہیں پسند نہ آتا تو یہ بات کرتے وقت اپنا منہ فوراً دوسری طرف موڑ لیتے۔ اپنی اس عادت سے مجبور ہو کر جب انہوں نے شیر پر گولی چلائی تو لبلبی دباتے وقت اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ فیر ہو گیا جو خالی گیا۔ شیر فائر کی آواز سُن کر ان کے بھائی کی لاش کو چھوڑ کر ان پر جھپٹ پڑا اور جب دوبارہ انہوں نے اپنا منہ شیر کی طرف موڑا ہے، تب تک شیر ان سے ایک گز کے فاصلے پر آچکا تھا۔ یہ دوسرا فائر نہ کر سکے۔ بس بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب شیر ان کے پیچھے پیچھے اور یہ آگے آگے۔ درختوں کے گرد کاوے کاٹ رہے تھے۔ شیر سے پیچھا چھڑانے کی اس سے بہتر اور کوئی دوسری تدبیر اس وقت ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ درخت پتلے اور لمبے تھے۔ جن پر یہ چڑھ نہیں سکتے تھے۔ موٹے تنے والے بھی نہیں تھے جس کی اوٹ میں یہ چھپ جاتے۔ شیر ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ جب یہ شیر کو ڈاج دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور اس نے بھاگتے ہوئے منہ مارا اور ان کی پنڈلی کو پکڑ لیا۔ یہ گر پڑے۔ شیر ان کی ٹانگ داب کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو گولی بنا کر ایک درخت کے تنے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ شیر ان کی ٹانگ کو کھینچتا تھا اور یہ طاقت لگا کر اس کو کھینچنے نہیں دیتے تھے۔ یہ رسہ کشی کتنی دیر چل سکتی تھی۔ کہاں شیر اور کہاں ایک زخمی انسان۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک اس طرح نہیں رہ سکتے، تو چلّا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی جو بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے بھائی کا نوکر جو درخت پر چڑھ گیا تھا اور ان کے ساتھ ان کے ایک اور ساتھی، جو اسی درخت پر چڑھ گئے تھے، ان کی آواز سن کر ہوش میں آئے اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کئی فائر اس شیر پر کر ڈالے، جو شیر کے بھی لگے اور شیر کے شکاری کے

بھی۔ آخر شیر اور شکاری دونوں شکار ہو گئے۔

صندل سنگھ

اس کتاب کے کسی قصہ میں ایک نام صندل سنگھ آیا تھا، جو کچھا میں شیر کا زبردست شکاری تھا اور وہاں کے جنگلات کے متعلق زبردست جانکاری رکھتا تھا۔ وہ وہاں کے ہر قسم کے جانوروں کے رہنے کی جگہوں سے واقف تھا۔ جنگلی جانور موسم کی تبدیلی کے ساتھ اپنے رہنے کی جگہوں کو بھی بدلتے رہے ہیں۔ لیکن صندل سنگھ ہر موسم میں ہر جانور کے رہنے کی جگہ جانتا تھا۔ اس وجہ سے بہت کامیاب شکاری تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اصلی شکار تو جنگل میں جانوروں کی تلاش ہے جو میں کرتا ہوں۔ یہ کام آپ لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔ میں ہر موسم میں ہر وقت جنگل میں گھس جاتا ہوں، اور اس کا کونا کونا کھنگالتا ہوں۔ آپ اگر شکار کھیلنا چاہتے ہیں تو جنگل کا جغرافیہ پڑھیں۔ دنیا کا جغرافیہ پڑھنا وقت کی بربادی ہے۔ اس سے آپ کا کبھی سابقہ نہیں پڑے گا۔ جنگل کا ہر پیڑ ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ اس کی پہچان کیجئے۔ کیونکہ یہی درخت مل کر جنگل بناتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کی ہے۔ بس بندوق پکڑی اور شکاری بن گئے۔

ہم لوگوں نے ہزار جتن کئے، کاش یہ شخص اپنے علم کے سمندر سے ہم کو ایک چلّو ہی دے دے، لیکن کیا مجال جو ایک لفظ بھی بتایا ہو۔ کاش صندل سنگھ تم ہم کو کچھ بتا دیتے تو آج ہزاروں لوگ اس سے فائدہ اٹھا چکے ہوتے۔ اور تمہارے نام سے تمہارا گاؤں جان لیا گیا ہوتا جو آج ویران پڑا ہے۔ سینکڑوں لوگ بربنائے عقیدت وہاں جا چکے ہوتے۔ اور اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوا ہوتا تو میں تمہارا مزار ضرور بنوا دیتا۔ ہر سال عرس کرواتا، میلا لگا کرتا۔

صندل سنگھ کی یہ خوبیاں ایک دن خود ان کو سنائی جا چکی ہیں لیکن شائع ان کے مرنے کے بعد ہو رہی ہیں۔ صندل سنگھ ایک انتہائی خود غرض انسان تھا۔ اور شاید شہر کے لوگوں سے متنفر بھی۔ یہی وجہ رہی ہوگی جو وہ ہمارے کہنے سے کبھی ہمارے ساتھ کہیں نہیں گیا۔ لیکن جب اس کا دل کہیں جانے کو چاہے گا، وہ آئے گا اور ایسے ایسے سبز باغ دکھائے گا کہ آدمی اس کے

ساتھ جانے پر مجبور ہو جائے۔ ورنہ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں پڑا رہے گا۔ صندل سنگھ ہم کو ہمیشہ دھوکے دیتا رہا اور ہم دھوکے کھاتے رہے۔ ہر دھوکے کے بعد ہم پیچ و تاب کھاتے اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر ان کو ساتھ نہ لے جانے کا تہیہ کرتے لیکن یہ قسمیں ہمیشہ توڑی گئیں۔ کیونکہ وہ ہماری مجبوری تھا۔ اور وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ یہ لڑکے بغیر صندل سنگھ کے کچھ نہیں ہیں۔ چاہے لاکھ منچلے ہوں، جیالے ہوں۔

شوئی تقدیر کہ اتفاق سے صندل سنگھ میری ایک کمزوری سے واقف ہو گیا۔ میرے دل میں کبھی ایسا خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ کسی دن میرے ساتھ کوئی شرارت کر جائے گا۔ اور مجھے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میری جنگل میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ، سانپ ایک کمزوری ہے۔ میں سانپ سے بہت ڈرتا ہوں اور کبھی اسے مارتا بھی نہیں۔ ابھی حال ہی کی بات ہے، ایک روز کہیں سے ایک سانپ میرے کپڑے بدلنے والے کمرے میں آ گیا۔ حالانکہ سب فرش موزیک کے ہیں اور یہ کمرہ دوسری منزل پر ہے۔ اس سانپ کو میرے ملازم نے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے مجھ کو اس کی اطلاع بھی دی۔ اس اطلاع پر میں تین دن اس کمرے میں نہیں گیا۔ حالانکہ نماز بھی وہیں پڑھتا تھا۔ کپڑے وغیرہ بھی سب وہیں تھے۔ لیکن نہ میں کپڑے لینے گیا اور نہ ہی وہاں نماز پڑھنے گیا۔ تین روز کے بعد جب مجھے فرصت ہوئی تو الماریوں کو ہٹوا کر جب تک میں نے خود ایک ایک کونا اور آڑ نہیں دیکھ لی، میں اس کمرہ میں نہیں گیا۔

جب میری یہ کمزوری سب کو معلوم ہو ہی گئی تو اب بتانے میں کیا حرج ہے۔ جس دن صندل سنگھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں سانپوں سے بہت ڈرتا ہوں، وہ اس دن سے تاک میں رہنے لگا کہ کہیں موقع ملے اور وہ مجھے سانپ سے بھڑوا دے۔ میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ صندل سنگھ جنگل کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اور ہر اس جانور کی، جو اس علاقے میں پایا جاتا تھا، رہنے کی جگہ سے واقف تھا۔ کچھا میں سانپوں کی بھی افراط تھی۔ سینکڑوں قسم کے سانپ کچھا میں پائے جاتے تھے۔

ایک روز صندل سنگھ نے آ کر اطلاع دی کہ وہ ایک نالے میں مرغوں کے رہنے کی

جگہ دیکھ آیا ہے ۔ آج دو پہر بعد کھانے سے فارغ ہو کر وہاں چلا جائے۔ہم لوگوں کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ دو پہر بعد صندل سنگھ کے ساتھ اس جگہ کے لیے چل دیے۔ ہم لوگ تین شکاری تھے۔ نالے پر پہنچ کر صندل سنگھ نے مرغوں کو نالے سے نکالنے کا ایک پلان بنایا جس میں ہمارے دونوں ساتھیوں کو نالے کے کنارے پر رکھا اور مجھ سے دھیرے سے کہا کہ تم نالے میں اُتر جاؤ۔ بالکل سوکھا ہے اور کہیں کہیں چھوٹا بھی ہوگیا ہے۔ تم کو اس وقت مرغیاں سوتی ہوئی ملیں گی۔ جو تم بہت آسانی سے بیٹ لو گے۔ اور جو تم سے بچیں گی، وہ ہی اُوپر آئیں گی۔ اور معلوم نہیں کس کنارے پر آکر اُتریں۔ اگر تم کنارے پر ہوئے تو ممکن ہے تمہارے پاس کوئی آئے ہی نہیں ۔ میں صندل سنگھ کی اس تجویز پر ان کا انتہائی ممنون ہوا۔ اور اپنے دونوں ساتھیوں کو دونوں کناروں پر بھیج کر خود نالے میں اُتر گیا۔ اس نالے میں کہیں کہیں ہلکی جھاڑیاں اور گھاس تھی، کہیں ریت بھی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن مرغیاں اب تک دکھائی نہیں دی تھیں۔ میں بہت ہوشیاری سے قدم سنبھالے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ جو پہنچا تو اس جگہ کی گھاس ہری تھی اور نالے میں چھپ چھپا پانی تھا۔ میں اس پانی سے بچنے کی وجہ سے گھاس میں گھس کر نالے کے ڈھلوان پر ہو کر آگے بڑھنا چاہتا تھا، ویسے ہی میرے پیروں سے فٹ بھر آگے ایک سانپ کے پھنکارنے کی بہت تیز آواز میرے کانوں میں آئی۔ میری نظر جو سامنے اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چیتی سانپ (Python) تقریباً زمین سے چار فٹ اونچا اپنا منہ میری طرف کئے اپنی لمبی زبان کو بہت تیزی سے لپ لپا تا اپنے منہ کے اندر باہر کر رہا ہے اور جھوم رہا ہے ۔ اس کو دیکھ کر مجھے جھُرجھُری آگئی اور نہ جانے دو کام کیسے ہو گئے۔ ایک تو میں نے فائر کیا، دوسرے ایک بہت بھیانک چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں پیچھے کی طرف اچھل کر کودا ہوں تو ایک چھپاک کے ساتھ نالے کے پانی میں چت گرا۔ میری چیخ کی آواز سُن کر، ارے کیا ہے، کیا ہے، کرتے ہوئے نالے میں کودے۔ ادھر صندل سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا کچھ نہیں۔ شاید ان کو چیتی مل گئی جو اس نالے میں رہتی ہے۔ میں ان کو بتانا بھول گیا تھا۔ میں چوہے کی طرف بھیگا ہوا بہت خفیف اور جھینپا ہوا اُٹھا۔ بندوق اٹھائی اور نالے کے باہر آیا۔ باہر آکر جان میں جان آئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کو درست کیا۔ بندوق

سے خالی کارتوس نکالا اور ایس جی کا گراب لگایا اور دل میں طے کر لیا کہ صندل سنگھ جیسے ہی نالے سے باہر آئے گا، مار دوں گا۔ شاید صندل سنگھ موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا تھا اور مجھ کو کارتوس بدلتے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا وہ دوسرے کنارے سے نکل کر جنگل ہوتا ہوا بھاگ نکلا۔ اس کے بعد کئی روز تک وہ میرے سامنے نہیں پڑا۔ جب میرے دوستوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ پھر اس نالے میں اُترے اور گھاس میں دیکھا کہ سانپ زخمی پڑا ہوا اپنا سر پٹک رہا تھا۔ ان لوگوں نے ایک فائر اور کیا۔ سانپ مر گیا۔ اور نہ معلوم کتنی دقتوں کے بعد اس کو گھسیٹ کر نالے کے باہر لائے۔ بہت لمبی چیتی تھی۔ دس گیارہ فٹ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ اس کے جسم کے بیچ میں ایک جگہ پھولی ہوئی تھی۔ فارم پر لا کر اس کا پیٹ کھلوایا تو دیکھا، ایک پورا پاڑہ اس کے پیٹ میں بیٹھا ہے جس کا ذرا سا حصہ بھی نہیں گلا ہے۔ اس کے فوٹو لیے گئے۔ اس کی کھال کے کئی جوڑے جوتے بنوائے گئے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن لکھ رہا ہوں کہ اس واقعہ کے بعد یار لوگوں نے کافی عرصہ تک میرا انکو بنایا اور خوب خوب مذاق اُڑایا۔

تو یہ تھا صندل سنگھ اور یہ تھے میرے اس کے تعلقات۔ وہ کبھی کبھی ہم لوگوں سے بندوق لے کر سور مارنے جنگل چلا جاتا تھا، جس کا وہ بہت شوقین تھا۔ اس کے اس شوق میں ہم لوگ کبھی اس کا ساتھ نہ دے سکے، حالانکہ اس شکار میں شامل ہونے کو بہت دل چاہتا تھا۔

ابھی صندل سنگھ سے آپ پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہوں گے۔ ممکن ہے آپ کے ذہنوں میں اس کا کوئی خاکہ بنا ہو، جو اصلی نہ ہوگا جب تک کہ اس کی تصویر لفظوں سے کھینچ کر نہ بنائی جائے۔ میں جو بات عرض کرنے جا رہا ہوں، اس میں ذرّہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ ہاں، اس بات کا امکان ہے کہ الفاظ کی کمی میرے مافی الضمیر کو پوری طرح واضح نہ کر سکے۔

صندل سنگھ کا قد پانچ فٹ دس انچ ضرور رہا ہوگا۔ لیکن چلتے وقت کبھی بڑھ جاتا تھا، کبھی گھٹ جاتا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس کا ایک پیر، پنجہ کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کبھی ایڑی کے بل زمین پر نہیں رکھا گیا۔ پنجہ بالکل سیدھا ہو گیا تھا۔ اگر وہ اس پیر پر کھڑا ہوتا تو ضرور پانچ فٹ دس انچ ہوتا۔ لیکن دوسرے پیر پر کھڑا ہونے سے اس کا قد آٹھ نو انچ کم ضرور ہو جاتا تھا۔ لہٰذا جب وہ چلتا تھا تو کبھی لمبا اور کبھی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ پہلے چاہے کسی مذہب کا

ماننے والا رہا ہو لیکن اب صورت سے سکھ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک کچّی داڑھی تھی جس میں گولف کی گیند کے برابر ایک جُوڑا بندھا رہتا تھا۔ بال کچھ سیاہ تھے اور کچھ سفید۔ تعداد سفید بالوں کی زیادہ تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں جن کو ہمارے یہاں چیاں ایسی کہتے ہیں۔ اور مِچی مِچی سی تھیں۔ جن میں بے انتہا کیچڑ بھری رہتی تھی۔ اور ایک آنکھ سے مستقل رطوبت خارج ہوتی رہتی تھی۔ اور شاید اس کی روشنی بھی زائل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس آنکھ پر ہمیشہ بھنگے اور مکھیاں لپٹی رہتی تھیں، جن کو وہ کبھی اُڑانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ جلد کی رنگت پہلے معلوم نہیں کیسی تھی، اب تو اس کا کوئی رنگ ہی نہ تھا۔ کیونکہ صندل سنگھ پانی صرف پینے کے لیے استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اس کو دوسرا مصرف پانی کا معلوم ہی نہیں تھا۔ چہرا چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ پورا جسم صرف کھال سے منڈھا ہوا معلوم ہوتا تھا، گوشت کی قسم کی کوئی چیز جناب کے جسم میں تھی ہی نہیں۔ کلائی بہت چوڑی تھی اور ہاتھ کا پنجہ جسم سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔

چرس پینے کے بہت شوقین تھے۔ اس کے سرور میں کھوئے رہنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس خشک نشہ کی وجہ سے کھانسی ان کو ہمیشہ پکڑے رہتی تھی۔ جب وہ کھانستے تو سینہ پر جمع بلغم خرخر کی آوازیں نکلتیں، سانس ہمیشہ پھولی رہتی تھی جیسے یہ ابھی میلوں بھاگ کر آرہے ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود صندل سنگھ ایک انتہائی بہادر اور نڈر انسان تھے۔ خوف ان کی 'لُغد' میں ناپید تھا۔ خوف ان کی ڈکشنری میں کبھی لکھا ہی نہیں گیا۔ جنگل کے ایک ایک درخت سے اس طرح واقف تھے جیسے کوئی پامسٹ ہاتھ کی لکیروں سے واقف ہوتا ہے۔ رات میں جنگل میں لہڑو سے چلے جارہے ہیں۔ یہ لہڑو میں پیچھے اوندھے پڑے ہیں اور کھانس رہے ہیں۔ لہڑو بان پوچھتا ہے۔ صندل سنگھ آگے لیکھ نہیں معلوم ہو رہی، گاڑی گھاس میں چل رہی ہے اور گھاس بھی اتنی اونچی جس میں ہاتھی ڈوب جائے۔ یہ سنتے ہی صندل سنگھ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے۔ لہڑو سے نیچے اُترتے۔ پہلے ایک میلی چیکٹ پوٹلی کہیں سے نکالتے اس میں سے ایک کالی گولی نکالتے، پھر کچھ پرانا انتہائی غلیظ کپڑا نکالتے اور کسی سے ماچس مانگتے۔ اس کپڑے کو جلاتے اور گولی اس پر رکھ کر اوندھے ہو جاتے اور دھواں جب تک اس میں سے نکلتا اس کو سانس سے کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے جاتے۔ اس وقت ایک خاص قسم کی خوشبو

نکلتی اور فضا اس سے معطر ہو جاتی اور صندل سنگھ پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ یہ دُہرے ہو ہو جاتے۔ آنکھوں سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا اور وہ دُھندلا جاتیں لیکن یہ کیفیت جلد ختم ہو جاتی۔ ان کے جسم میں ایک سخت توانائی آجاتی۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ یہ منہ اُٹھا کر آسمان کو دیکھتے۔ دور کھڑے ہوئے درختوں کی پھنگیوں کو دیکھتے اور گاڑی کو دائیں بائیں گھواتے۔ زمین کو پاؤں سے ٹٹولتے اور ذرا دیر بعد کہتے، سیدھے چلو۔ خود گاڑی کے پیچھے پیدل چلتے۔ پھر کود کر گاڑی پر بیٹھ جاتے اور کہتے، لیکھ پر تو چل رہے ہو۔ میری نیند بلا وجہ خراب کی۔ یہ کہہ کر پھر اوندھے ہو جاتے۔ ہم لوگ ٹارچ کی روشنی پہیوں پر ڈالتے اور دیکھتے کہ واقعی گاڑی لیکھ پر ہے۔ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ میلوں لمبے چوڑے ہاتھی ڈباؤ گھاس میں رات کے وقت یہ لیکھ اتنی جلدی کیسے تلاش کر لیتے ہیں۔

صندل سنگھ کی دوسری خوبی ان کا گھاس میں چلنا تھا۔ یہ گھاس میں بمقابلہ سڑک اور ہموار زمین کے بہت تیز رفتار سے چلا کرتے تھے۔ ہم لوگ گھاس میں کبھی ان کے برابر نہ چل سکے۔ وہ ہمیشہ ہم سے آگے رہتے تھے۔

ان کی تیسری خوبی گھپ اندھیری رات میں نشانے پر گولی مارنا تھی۔ جو کبھی خطا نہیں ہوئی۔ یہ ہم لوگوں سے اکثر دو کارتوس اور بندوق لے کر رات میں جنگل نکل جاتے۔ صبح کو واپسی ہوتی۔ سؤر ضرور مار کر لاتے۔ میں نے ان کو کبھی خالی ہاتھ لوٹتے نہیں دیکھا۔ ہاں ایسا تو ضرور ہوا کہ گولی تو چلاتے سور سمجھ کر اور وہ نکلتا پاڑھ۔ جس رات ایسا ہوتا۔ اس روز صندل سنگھ دن بھر بہت مغموم رہتے۔

ایک مرتبہ انہوں نے توڑہ دار بندوق سے ڈیڑھ گز کی دوری سے ایک شیر پر، اس کو سؤر سمجھتے ہوئے گولی چلا دی۔ یہ ایک کھیت کے کنارے گڈھا کھود کر بیٹھ گئے تھے بجائے سؤر کے شیر آ گیا یہ سمجھے بہت بڑا لومڑا آ گیا ہے۔ ماردی گولی۔ مر گیا شیر۔ صندل سنگھ کئی روز تک جھونپڑی سے باہر نہ نکلے۔ بہت مغموم رہے۔ لوگوں نے پوچھا، ارے بھئی باہر کیوں نہیں آتے۔ بولے، اب نظر بہت کمزور ہو گئی ہے۔ لومڑا اور شیر میں تمیز نہیں کر پاتا۔ لوگوں کے بہت سمجھانے پر انہوں نے باہر نکلنا شروع کیا۔ اور کچھ دن بعد پھر وہی دھندا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم لوگ کچھا میں مقیم تھے۔ شکار کھیلا جا رہا تھا۔ ہم لوگوں کے قیام کو کئی دن گزر چکے تھے، لیکن صندل سنگھ نہیں آئے۔ چودھری سے معلوم کیا کہ صندل سنگھ آج کل کہاں ہیں۔ وہ بولا، آجکل بہت اونچا اُڑ رہے ہیں۔ فلاں فارم پر بہت دیکھے جاتے ہیں۔ اس فارم کے منیجر کی بندوق سے روز شکار کھیل رہے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں آکر کیا کریں گے۔ میں نے آپ لوگوں کے آنے کی خبر اُنہیں کرا دی ہے۔ انہوں نے جواب میں کہلا دیا ہے کہ آجکل انہیں فرصت نہیں ہے۔ جب ہو گی آجاؤں گا۔ ہم لوگ سمجھ گئے صندل سنگھ کی آجکل چودھری سے 'جنگی' چل رہی ہے۔ لیکن دل میں ایک کھٹک سی ضرور پیدا ہوئی۔ اور ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں صندل سنگھ ہمارے ہاتھ سے نکل نہ گئے ہوں۔ اگر کہیں ایسا ہوا تو بڑی پریشانی ہو گی۔ لیکن خدا بڑا کارساز ہے۔

ایک روز کیا دیکھتے ہیں۔ صبح کو بہت تڑکے صندل سنگھ چلے آرہے ہیں۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں اور بہت پریشان لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کے چہرے سے ان کے دل کی کسی کیفیت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ ہم لوگ ابھی بستروں میں دُبکے پڑے تھے کیونکہ اس روز سردی بہت تھی، اور ایک دن پہلے دیر تک شکار کھیلتے رہے تھے۔ کئی فارموں کے پیدل چکر لگائے تھے۔ اس وجہ سے کچھ تھکن سی تھی۔ لیکن صندل سنگھ کو دیکھ کر مارے خوشی کے ہماری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً بستر سے باہر آئے۔ صندل سنگھ پر سوالوں کی بوچھار کر دی اور ان کے اتنا عرصہ نہ آنے پر شکایتوں کے دفتر کھول دیے۔ صندل سنگھ مسکراتے رہے اور جب ہمارے سوالوں کی بوچھار کچھ کم ہوئی تو بولے ہم کو آپ لوگوں کے آنے کا اسی روز معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ سے جنگل جانے کا اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے ہم جنگل جاتے تھے تاکہ جانوروں وغیرہ کے ٹھکانوں کا پتہ معلوم کریں کہ کس فارم پر زیادہ نکل رہے ہیں۔ اس وجہ سے دو دن نہیں آسکے۔ اب ایک جگہ جنگل میں دیکھ آئے ہیں۔ وہاں بہت چیتلیں ہیں، اور مرغ بھی بہت ہیں۔ لیکن وہ جگہ یہاں سے کچھ دور ہے۔ آپ لوگ ناشتہ وغیرہ کر لیں، پھر وہیں چلتے ہیں۔ آج اور ابھی دھاوا بول دیا جائے۔ ممکن ہے کسی اور کو وہ جگہ معلوم ہو جائے اور وہ آپ سے پہلے جا کر سب شکار خراب کر دے۔ پھر آپ شکایت

کریں گے کہ صندل سنگھ نے دھوکا دیا۔ ان کی یہ گفتگو اور منطقی دلائل سُن کر ہم جوش سے دیوانہ ہو گئے ۔ ذہن مرغوں اور چیتلوں کے غول میں پھنس گیا۔ اور دل ہی دل میں ایک دوسرے سے زیادہ مارنے کے پلان بنائے جانے لگے۔ اوراس خوشی میں ان کی تمام پچھلی حرمزدگیوں کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔

اب سُنیئے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ جیسا بیان ہو چکا ہے۔ وہ ان دنوں ایک دوسرے فارم پر دیکھے جا رہے تھے اور وہاں کے منیجر کی بندوق سے شکار بھی کھیل رہے تھے۔ جس روز یہ صبح کو ہمارے پاس آئے ہیں، اس روز رات میں یہ جنگل میں ایک درخت پر بیٹھے سؤروں کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو ان کے نکلنے کی جگہ معلوم ہو چکی تھی۔ ان کا ایک پیر درخت کی شاخ کے نیچے جھول رہا تھا ۔ قضا کا مارا ایک شیر ان کے درخت کے نیچے سے خود سؤروں کی تلاش پر نکلا۔ ان کا لٹکتا ہوا پیر اس کی پیٹھ کے بالوں میں مس ہوا۔ یہ سمجھے سؤر آ گیا۔ انہوں نے بندوق کی نال نیچے کی اور داغ دی۔ سب گراب شیر کی پیٹھ پر لگے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ شیر نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ صندل سنگھ نے جو شیر کی دہاڑ پاؤں کے نیچے سنی تو سمجھ گئے کہ آج پھر کچھ گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ یہ فوراً درخت سے کودے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کودنے پھاندنے میں یا شاید شیر کے دہاڑنے کی وجہ سے بندوق ان کے ہاتھ سے گر پڑی۔ یہ بندوق چھوڑ چھاڑ بلارُ کے گاؤں پہنچے۔ ان کو ہم لوگوں کے آنے کا تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ صبح ہی صبح ہم پر حملہ آور ہوئے کیونکہ ایسے موقع پر ہم لوگ ہی ان کے کام آ سکتے تھے لیکن اُستادی یہ کر گئے کہ یہ سب قصہ اس وقت ہم لوگوں کو نہیں سنایا۔ اور ہم کو ہمارے ہی جال میں پھانس لیا۔ اگر کہیں اس قصّہ کی ذرا سی بھی بھنک ہمارے کانوں میں پہنچ گئی ہوتی تو صندل سنگھ ہم کو بے وقوف نہیں بنا سکتے تھے۔ اور بندوق وہیں پڑی رہتی یا کوئی اور اُٹھا لے گیا ہوتا۔ کاش ایسا ہی ہوا ہوتا تو اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑی جا چکی ہوتی، اور یہ شکار کھیل چکے ہوتے، اور ہماری جانیں ان کی وجہ سے آئندہ جن مصیبتوں میں پڑنے والی تھیں، نہ پڑی ہوتیں۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

ہم لوگوں نے جلدی جلدی اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور چل دیے صندل سنگھ کے ساتھ۔

صندل سنگھ ہم لوگوں کو راستہ بھر اس جگہ کے جانوروں کی تعداد، ان کے بڑے بڑے سینگوں اور مرغوں میں پھنسائے رہے کہ بالکل سوچنے اور سوال کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں یہ رات میں درخت پر بیٹھے تھے، تو کیا دیکھتے ہیں، وہاں ایک شیر کتے کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے جو ہم لوگوں کو دیکھا تو مارے غصہ کے دیوانہ ہو گیا۔ اور غصہ میں چیخنے دہاڑنے لگا۔ اس کی دہاڑ نے ہمارے اوسان خطا کر دیے۔ دل حلق میں آکر اٹک گیا۔ اور گلا بالکل خشک ہو گیا۔ بھاگے سر پر پیر رکھ کر۔ صندل سنگھ نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ تھوڑی دور جا کر رُکے، ذرا دم لیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ کہیں شیر تو نہیں آ رہا ہے۔ شیر تو نہیں آیا تھا لیکن صندل سنگھ بھی نہیں تھے۔ ان کو نہ پا کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اپنی بزدلی پر لعنت بھیجی۔ بندوق رائفل ہوتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ صندل سنگھ بے چارہ ڈیڑھ پاؤں کا آدمی کیسے بھاگ سکتا تھا۔ شیر نے اس کو پکڑ لیا اور اب بیٹھا اس کو کھا رہا ہوگا۔ سخت قلق ہوا۔ اس بات کا نہیں کہ صندل سنگھ کو شیر کھا گیا۔ ان کو تو رات کو ہی کھا لینا چاہئے تھا۔ افسوس تھا تو اس بات کا کہ جب رات میں جنگل میں ہم راستہ بھٹک جائیں گے تو بتائے گا کون؟ ان تمام خیالات کے آتے ہی ہمارے بھاگتے ہوئے قدم رُک گئے۔ حالات پر غور کیا تو عقل نے یہ بات سمجھائی۔ اس بزدلی کے بعد کچھا میں شکار کھیلنے کے سب راستے بند ہو چکے ہوں گے۔ ایسے بزدلوں کے ساتھ جنگل میں کون شخص جانا پسند کرے گا جو بندوق رائفل ہوتے ہوئے بھی اپنے ساتھی کو شیر کا لقمہ بنوائیں۔ اور جیسے ہی یہ خیال ہمارے دل میں پیدا ہوا، ویسے ہی ہماری ٹوٹی ہوئی ہمت واپس آگئی اور ہم دوبارہ لوٹ پڑے۔ دیکھا صندل سنگھ ایک درخت پر بیٹھے ہیں اور ہاتھ سے ہم کو نزدیک آنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ نزدیک جا کر ہم نے پوچھا، تم شیر کے پیٹ سے نکل کر درخت پر کیسے چڑھ گئے۔ بولے تم لوگوں کے ساتھ میں بھی بھاگا، لیکن ڈیڑھ ٹانگ سے کہاں تک بھاگتا۔ یہ درخت دیکھا، اس پر چڑھ گیا۔ اب اُتارو پوچھا، ارے شیر کی بات بتاؤ، کہاں ہے۔ تم کو اس نے چھوڑا کیسے۔ وہ بولے، ہم لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ سمجھے کہ شیر آ رہا ہوگا۔ لیکن وہ آیا ہی نہیں۔ وہ خود اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہیں چلاّتا رہا۔ وہ تو اب بھی وہیں ہے اور ویسے ہی بیٹھا ہے۔ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ سُن کر

ہم لوگوں کی جان میں جان آئی۔ بڑی دقتوں سے صندل سنگھ کو اس درخت پر سے اُتارا۔ دوبارہ پھر شیر کی طرف چلے، لیکن بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر آڑ لیتے ہوئے۔ رائفل کو کندھے سے لگائے، لبلبی پر انگلی رکھ کر۔ دیکھا کہ اب بھی کتے کی طرح بیٹھا ہے۔ گولی ماری۔ گر پڑا۔ دوسری گولی ماری۔ ٹھنڈا ہو گیا۔ نزدیک پہنچے۔ صندل سنگھ کی بندوق اُٹھائی۔ کندا ٹوٹ گیا تھا۔ اور نال بھی خم کھا گئی تھی۔ اس درخت کو دیکھا جس پر صندل سنگھ بیٹھے تھے۔ شیر نے تختہ میں اس کی چھال اُدھیڑ دی تھی۔ آس پاس کی گھاس بھی نوچ ڈالی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس جگہ پر کسی نے ہل چلا دیا ہو۔

اس واقعہ کے نتائج ہمارے حق میں بہت بہتر نکلے۔ اس دن کے بعد سے صندل سنگھ کو ہم لوگوں نے بندوق دینا بند کر دیا۔ اب وہ ہمارے دست نگر تھے۔ ان کی ہزار منّت اور خوشامد کے باوجود، ان کا قصہ ہر اس آدمی کو سنایا گیا جو کچھا میں مل سکا۔

اس واقعہ کے بعد ان کی کچھا کے علاقے میں اتنی کرکری ہوئی کہ انہوں نے دوسرے فارموں پر جانا بالکل ترک کر دیا۔

بس اب صندل سنگھ بلاشرکتِ غیرے ہمارے تھے اور صرف ہمارے۔

دو بندوقچی

ایک مرتبہ شکار میں ایئر فورس کے دو آفیسر کہیں سے وارد ہو گئے جو راجہ صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ ہم لوگوں کو نہ جانے کیوں راجہ صاحب کے دوستوں سے کُدرہتی تھی۔ اُن کو دیکھ کر ہماری پارٹی نے ناک بھوں ضرور چڑھائی، لیکن یہ لوگ ہم لوگوں میں جلدی ہی گھل مل گئے۔ راجہ صاحب نے ان لوگوں کو میرے سپرد کر دیا کہ میں ان کو شکار دکھلاؤں کیونکہ پارٹی میں، میں ہی ان لوگوں کے ہم عمر تھا باقی ہماری پارٹی میں سب بوڑھے لوگ تھے، جو اپنی کھال میں مست رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ ہماری پارٹی میں دوسری خرابی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی پارٹی میں کسی 'باہر والے' کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

جب یہ لوگ میرے سپرد کر دئے گئے تو بوڑھوں نے میرا پیچھا لے ڈالا، بولے دیکھو

ان کو زیادہ منہ مت لگانا۔ جلدی چلتا کر دینا۔ پارٹی ایسی صورت میں تم کو بھی زیادہ برداشت نہیں کرے گی۔

مشکل یہ آن پڑی کہ ان میں سے ایک افسر کی بیوی میرے ایک P.S.O دوست کی لڑکی نکل آئی۔ دوسرا، میرے بڑے بھائی کے داماد کا دوست نکل آیا۔ اور لطیفہ یہ رہا کہ جو اس کا نام تھا، وہی ہمارے بھائی کے داماد کا نام تھا۔ اور جو میری بھتیجی کا نام تھا، وہی اس کی بیوی کا نام تھا۔ اس نے کہا کہ اکثر ان کے داماد کے خطوط اس کو ڈلیور ہو جاتے ہیں۔ میرے بھائی کی چھوٹی لڑکی میری بہت چہیتی تھی، اس وجہ سے میں ان لوگوں سے بہت جلد گھل مل گیا اور مانوس ہو گیا۔ اور ملٹری کے آفیسر اور خاص طور سے ایئر فورس کے آفیسر ہوتے ہوئے بھی بہت نفیس لوگ نکلے۔ میرے زیادہ دوست، فورس ہی کے لوگ ہیں۔ لیکن پارٹی کے الٹی میٹم کے بعد میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ راجہ صاحب مجھ کو دیکھتے اور مسکراتے کہ دیکھیں بچہ اس ڈائی لما سے کس طرح باہر نکلتا ہے۔ مجھ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چیلنج کرتے۔ میں مارے غصّہ کے تلملا کر رہ جاتا۔

خیر کسی نہ کسی طرح وہ دن تو کٹ گیا۔ کوئی خاص شکار نہ ملا۔ رات میں بھی یہ لوگ کوئی جانور نہ مار سکے۔ رات کو جب ہم لوگ شکار سے واپس آ گئے تو سب لوگ کھانے کی میز پر اکٹھا ہوئے۔ کھانے کی میز پہ شکار اور اس کی باریکیوں پر بات چیت ہونے لگی، جس میں ایئر فورس کے افسروں کو کوئی دخل نہیں تھا۔ دوران گفتگو ان لوگوں نے راجہ صاحب سے بلاک میں جانوروں کی کمی کی شکایت کی۔ راجہ صاحب نے ان کو بتایا کہ وہ لوگ ابھی پورا بلاک نہیں دیکھ پائے ہیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کل ان لوگوں کو کھیری گڑھ کا ٹکڑا دکھلاؤ۔

میں نے عرض کیا کہ اس میں صرف جیپ یا لہڑ دے سے شکار ہو سکتا ہے۔ اور جیپ آپ لوگوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم لیمبسڈر سے گھومتے ہیں جس سے شکار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ راجہ صاحب نے فرمایا۔ کل چار بجے تم کار سے وہاں پہنچ جانا۔ پھر لہڑ دوں پر بیٹھ کر اس ٹکڑے کو دیکھ لینا یہ سنتے ہی میرے دل میں گدگدی سے ہونے لگی۔

جنگل کا یہ ٹکڑا کوٹھی سے دور تھا اور اس میں سروس روڈ بھی نہیں تھیں۔اس وجہ سے شکاریوں کی پہنچ سے باہر تھا۔اس بلاک میں جب بھی شکاری آتے، بلاک کے سارے جانور یہاں تک کہ شیر بھی اس ٹکڑے میں بھاگ کر پناہ لیتے۔ہم لوگوں کو بھی اس ٹکڑے میں جانے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔اس وجہ سے میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ چلو کل بہت سے جانور مارے جائیں گے اور ہمارے بڈھوں کی شکاری پارٹی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔

اگلے دن چار بجے ہم لوگ موٹر سے اس جگہ جہاں لہڑو ملنے والے تھے، پہنچ گئے۔دو لہڑو اور کئی دیہاتی وہاں موجود تھے۔ہم لوگ موٹر سے اُتر کر لہڑوؤں پر بیٹھنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔میں نے لہڑوؤں میں گھاس بھروائی اور قالین وغیرہ ڈلوائے۔طے یہ ہوا کہ ہم تینوں آدمی ایک لہڑو پر بیٹھیں اور دوسرے لہڑو کو خالی ساتھ میں رکھا جائے۔یہ لہڑو شکار بھرنے کے کام آئے گا اور اس لہڑو پر سے سب گھاس دوسرے لہڑو پر بھر دی جائے تاکہ بیٹھنے میں تکلیف نہ ہو، کیونکہ ہم لوگوں کو پاؤں سمیٹ کر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔یہ انتظام ہو ہی رہا تھا کہ ہمارے مہمانوں کے ساتھ جو 'آیا' ایک افسر کے بچّے کے کھلانے کے لئے ساتھ آئی تھی، اس نے جا کر ان کی بیویوں سے جانے کیا کہہ دیا کہ وہ خواتین اس کی بات سُن کر موٹر میں اکیلے ان دیہاتیوں کے ساتھ جو خالی ہاتھ تھے (یعنی بندوق وغیرہ نہیں تھی) رُکنے پر بالکل تیار نہیں ہوئیں۔ان کا اصرار تھا کہ تینوں شکاریوں میں سے ایک آدمی ان کی اور ان کے بچے کی حفاظت کے لیے یہاں رُکے کیونکہ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔پھر بولیں، ہم لوگوں کو کوٹھی ہی میں رہنا چاہئے تھا۔ان کے شوہروں نے اپنی بیویوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بالکل نہ ڈریں۔موٹر میں بیٹھی رہیں اور گاڑی کے شیشے چڑھا لیں۔ان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔لیکن وہ لوگ بغیر کسی ذمہ دار کے وہاں اکیلی ان نہتے گاؤں والوں کے ساتھ رُکنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔لہٰذا مجبوراً مجھ کو وہاں رُکنا پڑا اور دونوں افسروں کو گاؤں والوں کے سپرد کر کے اس ٹکڑے کی طرف روانہ کر دیا۔مجھ کو اپنے وہاں رُکنے کا بہت قلق تھا۔میرا موڈ بے انتہا خراب ہو گیا۔

شاید لہڑو ابھی اس جنگل کے ٹکڑے میں داخل ہی ہوئے ہوں گے کہ تابڑ توڑ دو فائروں کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ فائروں کی آواز سُن کر میرا موڈ اور خراب ہوگیا۔ حالانکہ ان کی بیویاں میری ہر طرح دلجوئی کر رہی تھیں، لیکن میرا موڈ تھا کہ ہر فائر کی آواز پر بگڑتا جا رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے 34 فائروں کی آوازیں گنیں۔ ہر فائر کی آواز کے ساتھ میں دل ہی دل میں کہتا ''کیا سالے اس ٹکڑے کے سب جانور آج ہی مار ڈالیں گے''۔ خدا خدا کر کے فائروں کی آوازیں آنا بند ہوئیں اور ان کا قافلہ جنگل سے نکل کر موٹر کے پاس پہنچا۔ میں لپک کر پیچھے لہڑو کے پاس گیا۔ وہاں پہنچ کر میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ لہڑو بھی پہلے لہڑو کی طرح خالی تھا۔ صرف دو گاؤں والے بیٹھے تھے۔ میں نے لہڑو والوں سے پوچھا۔ جانور کہاں ہیں؟ وہ بہت سوکھا منہ بنا کر بولا۔ بھیا، کوئی جانور مرا ہی نہیں۔ لیکن اس ٹکڑے میں بندوق کے چھرّوں اور گولیوں کا سیسہ ضرور بکھرا ہوا مل جائے گا۔ پہلے میں منہ لٹکائے ہوا تھا، اب شکاری منہ لٹکائے ہوئے تھے۔

پہلے وہ لڑکیاں جو میری دلجوئی کر رہی تھیں، اب ان شکاریوں پر پھبتیاں کس رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں شکاریوں میں سخت جنگ ہوگئی۔ میں بڑی مشکل سے ان کو موٹر میں بٹھا کر کوٹھی لا سکا۔ کوٹھی پر آتے ہی انہوں نے اپنا سامان بیگوں میں ٹھونسا۔ حالانکہ راجہ صاحب ان کو بہت روکتے رہے، یہاں تک یاد دلایا کہ رات کا وقت ہوگیا ہے اور ان کو جنگل سے نکلنے میں کافی لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ اسی وقت چلے گئے۔ ایک پیالی چائے تک نہیں پی۔ لیکن یہ سب نے دیکھا کہ وہ دونوں افسر جو موٹر میں ساتھ آئے تھے، ایک دوسرے سے مخالف سمت میں منہ موڑے بیٹھے تھے اور ان کی بیویاں بھی منہ پُھلائے الگ الگ بیٹھی تھیں۔

خیر وہ لوگ چلے گئے اور دوسرے روز کے بعد میری پارٹی بھی چلی گئی۔ لیکن راجہ صاحب نے مجھ کو روک لیا۔ کیونکہ پرمٹ ختم ہونے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں نے راجہ صاحب سے کہا، کل لہڑو پھر منگوا لیجئے۔ اور اس ٹکڑے میں جہاں وہ لوگ 34 فائر کر چکے ہیں، دوبارہ شکار کھیلا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بلاک کے سب جانور دن میں اسی

ٹکڑے میں ٹھہرتے ہیں۔ راجہ صاحب کو بھی یہ بات پسند آئی۔

اگلے دن ہم لوگ اپنی گاڑی سے اس جگہ پہنچے جہاں فوجی لوگوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں پھر دولہڑ دموجود ملے۔ ایک لہڑو پر میں اور راجہ صاحب بیٹھ گئے۔ دورے لہڑو پر ان کے بڑے لڑکے اور دوایک دیہاتی بیٹھے۔ یہ لڑکا اس وقت دس بارہ سال کا رہا ہوگا۔

یہ مہینہ فروری کا تھا۔ وقت تین بجے دن کا رہا ہوگا۔ ہمارے دونوں لہڑو آگے پیچھے اس ٹکڑے میں گھسے۔ واقعی یہ ٹکڑہ، بلاک کے دوسرے ٹکڑوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں بہت اونچے اونچے کوروں کے درخت تھے جو آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے نیچے جگہ جگہ فرن اُگا ہوا تھا، گھاس یعنی کھُر بہت کم تھا۔ کچھ ایسی اَنڈر گروتھ تھی جیسی پہاڑوں پر ہوتی ہے، جو آنکھوں میں کھٹک کے بجائے ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ اس ٹکڑے میں ایک برساتی نالا بھی تھا جو دریا کی طرح چوڑا ہوگیا تھا۔ لیکن آج کل خشک تھا۔ اس میں بہت ہری کلک اُگی ہوئی تھی جو پانچ چھ فٹ اونچی رہی ہوگی۔ سروس روڈ ایک بھی نہیں تھی۔ بلکہ سیکنڈ کلاس روڈ بھی نہیں تھی۔ صرف لہڑو کی لیکھ تھیں۔ اور یہ گاؤں والے ان کی بھول بھلیوں سے بخوبی واقف تھے۔

اب سُنیے، پرسوں جہاں 34 فائر ہوئے تھے، آج ایک گھنٹہ گھومنے کے بعد بھی کسی ایک جانور کا سایہ تک نہ دیکھ سکے۔ بڑی کوفت ہوئی۔ یہ کوفت پرسوں فوجیوں کے ساتھ نہ جانے کی کوفت سے زیادہ سخت تھی۔ دوسری کوفت یہ تھی کہ میری بندوق کی ایک نال ایک مرغ پر فائر کرتے وقت پھٹ گئی تھی۔ مجھ کو بڑا تعجب ہوا کہ ڈمسکس بیرل بھی پھٹ سکتی ہے۔ کیونکہ میری بندوق انتہائی قیمتی اور عمدہ قسم کی بندوق تھی۔ اور برڈ شوٹنگ کے لے بہت آئیڈیل تھی، کیونکہ بہت ہلکی تھی۔ چھوٹی نالیں تھیں اور ڈبل لاچیکو تھی۔ میرے ہاتھ پر بہت چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ میں اس کو کندھے پر نہیں لا سکا۔ فیر کر دیا اور شکار گر گیا۔

میری بندوق کے پھٹنے کے کئی سال بعد ایک نواب صاحب سے دلّی کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اگر ڈمسکس بیرل فوگ (کہرہ Fog) میں چلائی جائے تو یہ پھٹ سکتی ہے۔ یہ بات سُن کر اپنے اوپر بہت غصہ آیا، کہ یہ بات مجھ کو پہلے کیوں نہ معلوم ہو

سکی۔ اگر یہ بات پہلے معلوم ہوگئی ہوتی تو میری بندوق نہ پھٹتی۔ اور اس روز جس دن ہم لوگ جنگل میں گھوم رہے تھے، اور ایک شیر جو ہمارے لہڑو سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر ترچھا کھڑا ہوا ہم لوگوں کو گھور رہا تھا، بچ کر نہ گیا ہوتا۔

ہُوا یہ کہ جب اس ٹکڑے میں گھومتے گھومتے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہوگیا تو میں نے راجہ صاحب سے کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹکڑے میں ایک جانور بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اس ٹکڑے میں کوئی شیر آج صبح کہیں سے آگیا ہے۔ اور کیونکہ یہ ٹکڑہ بہت صاف ہے، کھُر بالکل نہیں ہے، اس وجہ سے جانور یہاں سے بھاگ کر دوسرے کسی گھنے ٹکڑے میں پناہ لینے چلے گئے ہیں۔ میری ایسی دقیق بات سن کر بھی راجہ صاحب بالکل نہیں بولے۔ ہوں ہاں تک نہیں کی۔ میں مارے غصّہ کے تلملا گیا اور بہت منہ بگاڑ کر راجہ صاحب سے کہا۔ ''اب آپ اپنا سارا علم پیٹ میں لے کر قبر میں چلے جایئے گا۔ اگر ہم کو نہ معلوم ہو سکا اور آپ نے نہ بتایا تو کیا ہم دُبلے ہو جائیں گے۔'' راجہ صاحب کی یہ بہت خراب عادت ہے کہ وہ شکار میں بالکل نہیں بولتے، اور میری زبان چُپ نہیں رہ سکتی۔ میرے مزاج میں تجسس بہت ہے۔ میں پوچھوں گا ضرور، وہ بولیں گے نہیں۔ مارے ضد کے بعد میں کسی شکاری واقع کو ان سے معلوم کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔ میں کچھ عرصہ بعد بھول بھی جاتا ہوں۔ یہاں تو روز شکار کھیلنا اور روز ایک نئی صورت حال سے نپٹنا ایک عادت سے بن گئی ہے۔

راجہ صاحب کی اس عادت کی وجہ سے میں نے آج تک ان پر قلم اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ہزاروں واقعات ہوئے جو تشریح طلب تھے، اگر اس وقت ان کی وضاحت کر دی گئی ہوتی تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ لیکن مقدر میں تو کاربٹ، اینڈرسن، کیسری سنگھ، شیر جنگ کو نامور ہونا لکھا تھا۔ ان کی تقدیر میں تو صرف گولا اور شاہ آباد لکھا ہے۔ لیکن میں آپ سے حلفیہ کہتا ہوں کہ راجہ صاحب ان سے بڑے شکاری ہیں اور جو تجربہ راجہ صاحب کو ہے، وہ کسی دوسرے کو نہیں کیونکہ راجہ صاحب نے دسیوں طریقہ سے شکار کھیلے ہیں۔ یوپی کے شیر کے مزاج کو جتنا راجہ صاحب جانتے ہیں، اتنا نہ تو کاربٹ جانتا تھا اور نہ ہی اینڈرسن۔

ہم لوگوں کے لہڑو اس وقت دریا کے سوکھے ہوئے بیڑ (تھالے) کے کنارے گھاس

میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی وقت ایک سانبھر نے بڑی زور دار آواز نکالی۔ میں نے راجہ صاحب کو پھر مخاطب کیا اور کہا۔ یہ بھری دوپہری میں سانبھر کیوں بول رہا ہے۔ میں نے دیکھا راجہ صاحب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھ رہے ہیں اور میری کسی بات کا جواب بھی نہیں دے رہے، اس لیے میں بھی خاموش ہو گیا اور لہڑو ہانکنے والے سے کہا کہ اس گھاس کو پار کر کے دریا کے دوسرے کنارے پر چڑھ چلو۔ اس نے لہڑو سوکھے دریا کے بیڈ میں، جو اُتھلا تھا، ڈال دیا۔ اور دوسرے کنارے پر چڑھ کر دوسرے ٹکڑے میں گھسنے کی کوشش کی۔ لیکن یہاں گھاس اور بروائی اتنی گھنی تھی کہ بیل اس میں لاکھ کوشش کے باوجود گھس نہ سکے۔ کئی جگہ سے کوشش کی لیکن ہر جگہ ناکامیابی حاصل ہوئی۔ ہمارا لہڑو پھر بیڈ میں اُتر گیا اور لیکھ پر پہنچنے کی کوشش کی۔ اس جگہ لیکھ گھومی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ہمارا لہڑو پیچھے رہ گیا۔ وہ لہڑو جس پر راجہ صاحب کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا، بالکل موڑ پر تھا اور ہمارے لہڑو سے آگے ہو گیا تھا۔ اس لہڑو نے جیسے ہی موڑ موڑی، ویسے ہی راجہ صاحب کے لڑکے نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ''ابّا شیر۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ ہمارا لہڑو بہت تیزی سے موڑ مڑا اور اس کے لہڑو کے آگے ہو گیا آگے ہو کر سیدھے لیکھ پر رُکا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک انتہائی تندرست شیر ہمارے لہڑو سے تقریباً آٹھ دس گز آگے چل کر بائیں ہاتھ کو رُک گیا ہے اور لیکھ کے کنارے ایک ذرا سی اونچی جگہ پر ترچھا کھڑا ہو گیا ہے۔ اور منہ ہم لوگوں کی طرف کر کے چمکتی ہوئی آنکھوں سے لہڑووں کو گھور رہا ہے۔ ہمارے لہڑو جہاں پر تھے، وہیں رُک گئے۔ ہر آدمی کی آنکھیں شیر پر مرکوز ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم سب بھول گئے کہ ہم کہاں ہیں، اور شیر کی خوبصورتی میں کھو گئے۔ شاید میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ چونکہ میری بندوق کی نال صبح کو پھٹ گئی تھی اس وجہ سے ایک فاربیڑ کی سنگل بیرل بندوق منگوائی تھی۔ لیکن یہ بندوق تھی تو انگلش، لیکن بہت پُرانے ماڈل کی تھی۔ اس کے کندے اور بیرل کا ایلائن منٹ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ میں نے کئی مرغوں پر فائر کئے جس کے چھرّے کبھی مرغے کے آگے پڑے اور کبھی پیچھے۔ لیکن اُسے اس لیے لے لیا کہ ہاتھ میں کوئی ہتھیار تو ہونا ہی چاہئے۔ اتفاق کی بات کہ راجہ صاحب بھی اپنی کوئی رائفل ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ اس وقت اُن کے پاس ایک بارہ بور ڈبل بیرل تھی۔ اور ایک بائیس بور رائفل لہڑو میں رکھی

ہوئی تھی۔ میں چندلمحوں کے بعد جب اس نظارہ کی رنگینی سے حقیقت کی طرف لوٹا تو میری بندوق کی نال شیر کے دل کا نشانہ لئے ہوئی تھی،اور میں راجہ صاحب سے کہہ رہا تھا۔ راجہ صاحب میں گولی چلاتا ہوں۔آپ شیر کو روک لیجئے گا۔

راجہ صاحب نے سرگوشی میں کہا۔''تم بندوق نہ چلانا۔تمہاری بندوق بہت پرانی ہے۔ اور کارتوس بہت ہیوی لوڈ کے ہیں۔ صبح تو ایک بندوق پھاڑ چکے ہو۔ اب کیا اس کو بھی پھاڑنے کا ارادہ ہے۔

یہ سنتے ہی میری بندوق کا کندا بہت آہستہ آہستہ کندھے سے اُتر کرلہڑو پر آ گیا۔ میں پھراس دل کش نظارہ میں کھو جانا چاہتا تھا کہ راجہ صاحب نے فرمایا۔ میں گولی چلاتا ہوں تم شیر کو روک لینا۔ میں نے اپنی نظریں شیر پر گاڑے گاڑے راجہ صاحب سے کہا۔ راجہ صاحب۔ میری بندوق شیر کو مارنے میں تو پھٹ جائے گی،کیا شیر کو روکنے میں نہیں پھٹے گی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ راجہ صاحب ڈبل بیرل رکھ کر بائیں بور لہڑو سے اُٹھا رہے ہیں۔ میں نے اپنی نظر شیر سے ہٹائے بغیر ان سے کہا۔آپ اس ہوائی بندوق سے شیر کے کس حصہ پر فائر کریں گے۔ راجہ صاحب بولے میں شیر کی آنکھ پر فائر کرنے جارہا ہوں۔

میں نے کہا اس کی ایک ہی آنکھ پھوٹے گی۔ دوسری سے یہ ہم کو دیکھ رہا ہے، پلک جھپکتے میں یہ ہمارے لہڑو پر ہوگا۔ میں اس کو روک نہیں پاؤں گا۔

میں نے محسوس کیا کہ راجہ صاحب نے بندوق رکھ دی ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر شیر کے ہر حصہ کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ایسی حالت میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ شیر کے جسم کے کس کس حصہ میں کون سی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ کھڑے ہونے کا انداز کیا ہوتا ہے، کان کس پوزیشن میں رکھتا ہے۔ آنکھیں کیا کرتی ہیں۔ دُم کس پوزیشن میں ہوتی ہے۔ اب میں نے اپنی آنکھوں کے اس زاویے سے یہ بھی دیکھا کہ اب راجہ صاحب بائیں بور کندھے پر لے آئے ہیں اور بہت آہستہ سے بولٹ کو کھول کر کارتوس کو چیمبر میں لانا چاہتے ہیں۔ میں نے گھوم کر بغیر ان کی رائفل کے بولٹ پر ہاتھ رکھ دیا او بہت لجاجت سے کہا:

راجہ صاحب میں لہڑو سے اُتر ے جاتا ہوں اور آپ کے لڑکے کو یہاں بھیج دیتا ہوں۔
پھر آپ بائیس بور سے کیا۔ بلکہ بالکوا کی ہوائی بندوق سے فائر کریں، مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ راجہ صاحب بولے گھبراؤ نہیں۔ شیر تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔

بہر حال میرے کہنے سے راجہ صاحب نے بائیس بور سے شیر پر فائر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب راجہ صاحب شیر کو دیکھ کر بولے دیکھو، اب یہ کان نچیا رہا ہے۔ (یعنی کانوں کو جنبش دے رہا ہے) اگر مارنا نہیں ہے تو چلو۔ ورنہ یہ اب دوڑ پڑے گا۔

یہ سنتے ہی ہمارے لہڑو بان نے بیلوں کی ناتھن ڈھیلی چھوڑ دیں۔ بیل ناتھوں کے ڈھیلے ہوتے ہی وہ بڑی تیزی سے جنگل سے نکل کر جیپ کے پاس پہنچے جو اس جگہ سے تقریباً سو، سوا سو گز دور کھڑی تھی۔

اس واقعہ کے کافی عرصہ کے بعد ایک مرتبہ نیپال کے ایک رانا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے تین شیر بائیس بور سے مارے ہیں۔ اور پھر مجھ سے کہا تم نے اپنی بزدلی سے راجہ صاحب کو شیر نہیں مارنے دیا۔ ورنہ راجہ صاحب اتنی تیزی سے فائر کرتے ہیں کہ بائیس بور سے فائر کرنے کے بعد اس شیر کو اپنی بارہ بور سے روک بھی لیتے۔ میں نے بہت جز بز ہو کر کہا پھر راجہ صاحب نے یہ کر کیوں نہیں دیا۔

رانا صاحب بولے کہ صرف اس وجہ سے کہ تم ان کے ساتھ تھے۔ واقعی میں بہت شرمندہ ہوا۔ آج مجھ کو اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نے راجہ صاحب کی خواہش کا احترام نہیں کیا، حالانکہ انہوں نے اس بات کی آج تک شکایت نہیں کی۔

لیکن شیر کے شکار میں یہ بات میرے دل میں ضرور بیٹھ گئی کہ کبھی کسی دوسرے کو ساتھ نہیں رکھنا چاہئے۔ اس کی بزدلی، کم ہمتی اور ناتجربہ کاری شکاری کے لئے بڑی مشکل پیدا کر سکتی ہے۔ یہ تمام باتیں بعد کے تجربہ سے ثابت بھی ہو چکی ہیں۔

وائلڈ لائف وارڈن (Wild LIfe Warden)

آپ نا اُمید نہ ہوں۔ یہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس بلاک میں دس دن کے قیام کے

دوران تابڑتوڑ تین واقعے ہوئے جن میں سے دو تو لکھ دیے، تیسرا اب سُن لیجئے۔ اس وقت کے وائلڈ لائف وارڈن مسٹر شرما ایک عجیب شخصیت کے مالک تھے۔ کم از کم میں تو ان کو بالکل سمجھ نہیں سکا، حالانکہ شروع سے آخر تک ہم لوگوں کا سابقہ اُن سے پڑتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ہمارے پہاڑی بلاک کے قریب دوسرے بلاک میں شمی کپور، جو اس وقت سنیما کے دنیا میں بہت مقبولیت رکھتے تھے، دو امریکن لڑکیوں کے ساتھ شکار کھیل رہے تھے۔ دن بھر کوٹھی میں پڑے رہنا اور پیتے پلاتے رہنا۔ شام کو جنگل کو نکل جانا اور جو جانور سامنے پڑے اس کو مار دینا۔ یہ ان کا شکار تھا۔ ایک روز شام کو شرما جی اس بلاک میں پہنچ گئے۔ شمی کپور کار سے جنگل گئے ہوئے تھے۔ راستہ میں شرما جی کی ان سے ملاقات ہوگئی۔ شمی کی گاڑی میں دو چیتلیں جو انہوں نے شکار کی تھی، رکھی ہوئی تھیں اور دونوں امریکن عورتیں بھی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وارڈن صاحب نے ان کی گاڑی رُکوائی۔ اور ان سے پوچھا کہ یہ مادہ چیتل انہوں نے کیوں ماریں اور فارن کے لوگ بلاک میں کیوں لائے۔ یہ بلاک تو کسی فارنر کے نام سے بک نہیں ہے۔ یہ تو جنگلات کے چیف کے نام بک ہے۔ آپ ان کے گیسٹ (مہمان) ہو سکتے ہیں، ٹھیک ہے، لیکن کسی امریکن کو آپ اپنے ساتھ لانے کے مجاز (Authorised) نہیں ہیں۔ شمی کپور ان لڑکیوں کے سامنے بہت شرمندہ ہوئے۔ اس وجہ سے ان کو غصہ آ گیا۔ قصہ تو بہت لمبا چوڑا ہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ شمی کپور کو وہ بلاک اسی وقت چھوڑنا پڑا۔ ورنہ یہ رات ان کو جیل میں گزارنا پڑتی۔

وائلڈ لائف وارڈن مسٹر شرما کسی شکاری کے ساتھ رعایت نہیں کرتے تھے۔ چاہے وہ کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو۔

ایک مرتبہ ایک راجہ، جو کسی ریاست کے گورنر بھی رہ چکے تھے، اور کسی یونیورسٹی کے اس وقت وائس چانسلر بھی تھے، اور یوپی کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں ان کی بڑی عزت اور توقیر تھی۔ اور واقعی تھے بھی بہت شریف النفس انسان۔ راجہ تو معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ شرما کے ہاتھوں ایسی سچویشن سے دوچار ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے شکار ہی چھوڑ دیا۔

ایک مرتبہ راجہ صاحب کسی جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ شرما جی بھی ان کے ساتھ

تھے۔ رکستہ میں چند جنگلی مرغ سڑ ک کے کنارے کھڑے ہوئے دیکھے۔ یہ مرغ کا کلوز سیزن تھا۔ شرما جی نے راجہ صاحب کو مرغ دکھاتے ہوئے کہا۔ سر مار لیجئے۔ راجہ صاحب نے کہا کہ کلوز سیزن ہے لیکن وارڈن صاحب نے فرمایا۔ سَر آپ کے لئے کلوز سیزن کیا معنی رکھتا ہے۔

راجہ صاحب تو تھے ہی شکاری اور ہر انسان کی طرح جنگلی مرغ ان کی بھی کمزوری تھی۔ انہوں نے فائر کر دیا۔ ایک دو مرغ گر گئے وارڈن نے موٹر سے اُتر کر یہ مرغ اٹھا لئے۔ اور راجہ صاحب سے بولے یہ کلوز سیزن ہے۔ آپ نے مرغ مار دیئے؟ لیکن آپ بالکل پروانہ کریں میں دس روپیہ کی ایک رسید کاٹے دیتا ہوں۔ کیس، کمپاؤنڈ ہو جائے گا اور ڈیپارٹ منٹ میں بڑی نیک نامی ہو جائے گی۔ راجہ صاحب نے اپنے سیکرٹری سے کہا ان کو دس روپے دے دو۔ سکریٹری نے دس روپیہ دے دیئے۔ اگلے دن اخبار میں ایک سنسنی خیز خبر چھپی۔ اس میں ایک وائلڈ لائف وارڈن نے کسی ایک گورنر اور وائس چانسلر کو۔ چوری سے مرغ مارتے ہوئے جنگل میں پکڑا، اور ان پر دس روپیہ جرمانہ کر کے وصول بھی کر لیا۔ واقعی محکمہ میں ان کی ڈھاک جم گئی، اور جن کو یہ واقعہ معلوم ہوا، انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ ہمارے راجہ صاحب کسی بلا سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اس وائلڈ لائف وارڈن سے بس آگے نہ کہلایئے۔ خیر قصہ یہ ہوا کہ اس بلاک، جس میں ہم شکار کھیل رہے تھے، یہ وارڈن اس کے مستقل چکر لگا رہے تھے۔ وہ راجہ صاحب کو رات میں شکار کرتے پکڑنا چاہتے تھے۔ راجہ صاحب رات کو بالکل شکار نہیں کھیلتے تھے۔ وہ پکڑنا کیا خاک۔ لیکن وہ اکثر رات میں آ کر اس بلاک میں چھپ جاتا کہ شاید کبھی موقع مل جائے۔

ایک روز شام کو جنگل کی کوٹھی سے قصبہ میں جانا پڑا شاید کوئی آنے والا تھا۔ اس کو لینے جانا تھا۔ یہ قصبہ کوٹھی سے بیس پچیس میل دور رہا ہو گا واپسی رات ہی کو ہونا تھی، اس لئے راجہ صاحب نے دو آدمیوں کو اپنی جیپ میں بٹھا لیا۔ رائفل اور بندوقیں بھی رکھ لیں۔

ابھی راجہ صاحب جنگل سے باہر نہیں ہو پائے تھے کہ ایک جیپ بہت تیز رفتاری سے ان کی جیپ کے پاس آ کر رُکی اور اس میں سے اسی طرح بہت تیزی سے دو سپاہی اور وائلڈ لائف وارڈن کود کر باہر آئے۔ راجہ صاحب کی جیپ بھی رُک گئی۔ لیکن راجہ صاحب اسٹیرنگ

پر ہی بیٹھے رہے۔ وارڈن نے راجہ صاحب کو دیکھ کر تسلیم کی اور بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا، راجہ صاحب آپ تو رات کو بالکل نکلتے ہی نہیں ہیں۔ میں کئی دن سے آپ کے بلاک میں رات رات بھر گھوم رہا ہوں۔ یہ آپ آج کیسے نکل کھڑے ہوئے۔ اور نکلے بھی تو کس طرف۔ ادھر تو کچھ زیادہ شکار بھی نہیں ہے۔ اب پوری بات راجہ صاحب کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ راجہ صاحب بولے، میں شکار کھیلنے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ میری بیوی شام کی گاڑی سے آ رہی ہیں۔ میں ان کو لینے جا رہا ہوں، اس وجہ سے تو میرے ساتھ شکاری پارٹی بھی نہیں ہے۔ صرف دو نوکر ساتھ ہیں۔ وہ بولا یہ تو بالکل اتفاقیہ بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی ورنہ میں تو کوٹھی جا رہا تھا۔ آپ کا پرمٹ چیک کرنے۔ اچھا آپ کو بھی جلدی ہے اور مجھ کو بھی کہیں جانا ہے، آپ اپنا پرمٹ دکھا دیں۔ راجہ صاحب کو اس کی یہ بات سن کر سخت غصہ آیا۔ اور ہکلاتے ہوئے بولے (راجہ صاحب کو جب غصہ آ جائے تو وہ ہکلانے لگتے ہیں) میں ہر وقت پرمٹ جیب میں لے کر تو گھومتا نہیں پھرتا۔ کل کوٹھی پر آ جایئے گا، دکھا دوں گا۔ وہ بولا راجہ صاحب کوئی حرج نہیں، پھر کسی دن آ کر دیکھ لوں گا۔ ویسے مجھ کو معلوم ہے کہ آپ کے نام پرمٹ اشو ہوا ہے۔ بس یہ تو ایک خانہ پُری کی رسم تھی۔ میں نے کہا چلو لگے ہاتھوں پرمٹ بھی دیکھ لیا جائے۔ اگر آپ کے پاس اس وقت پرمٹ نہیں ہے تو پھر سہی۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر کسی اور طرف نکل گیا۔

دو گھنٹہ کے بعد جب راجہ صاحب تشریف لائے تو ہم لوگوں کو یہ قصہ سنایا۔ اور بولے تم بچ گئے۔ رات میں شکار کھیلتے ہو۔ اس کے ہاتھ نہیں پڑ سکے ورنہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔

میں نے واقعی اس وقت خدا کا شکر ادا کیا۔

اب سنئے۔ اسی رات کا واقعہ ہے۔ ہم لوگ اپنے موٹے موٹے کمبلوں اور لحافوں میں لپٹے سنہرے جاڑوں کی جنگل کی رات میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ رات کا ایک یا ڈیڑھ بجا ہوگا۔ حافظ جی جو برآمدے میں سوئے ہوئے تھے، ان کی چیخ پکار سے ہم سب کی آنکھ کھل گئی۔ راجہ صاحب اور میں کمرہ سے باہر آئے تو دیکھا حافظ جی ایک آدمی کو بُری طرح ڈانٹ رہے ہیں، جو راجہ صاحب سے اسی وقت ملنے کی ضد کئے جا رہا تھا۔ راجہ صاحب

نے ڈانٹ کر حافظ جی کو خاموش کرایا۔ اور اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہیئے آپ رات کو اس بیابان میں کیا کر رہے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے ہیں۔

وہ شخص بڑی لجاجت سے بولا۔ ارے رلجہ صاحب، میں فلاں شخص ہوں۔ رلجہ صاحب اس کی آواز پہچان گئے۔ یہ شخص بھی فارسٹ ڈپارٹمنٹ میں کسی بلاک کا ڈپٹی رینجر تھا۔ رلجہ صاحب اس سے بخوبی واقف تھے۔ رلجہ صاحب نے اس کو پہچان لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لائے۔ اتنی دیر میں ملازم نے پٹرومیکس جلا دیا۔ اب جو اس کو دیکھا تو وہ پانی سے شرابور اور سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رلجہ صاحب نے نوکر سے فوراً آتش دان میں لکڑیاں لگوانے اور کافی بنانے کو کہا۔ پھر اس شخص سے مخاطب ہو کر بولے، آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ آپ پانی سے بالکل تر کیسے ہیں۔ کیا آپ مع کپڑوں کے اس وقت دریا میں نہا رہے تھے؟ وہ بولا، رلجہ صاحب میں اکیلا تر نہیں ہوں۔ بلکہ میرے ساتھ سات آدمی اور ہیں جو بالکل پانی سے شرابور ہیں۔ یہاں سے کم از کم چھ سات میل دور سردی سے کانپ رہے ہیں۔ اور اس میں وائلڈ لائف وارڈن بھی ہیں۔ یہ سُن کر رلجہ صاحب نے اس کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔ اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ رُکیئے۔ یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گئے اور ایک جوڑا صاف سوکھے کپڑوں کا لے کر آئے۔ ان کے پیچھے نوکر کئی ایک کمبل اور تولیہ وغیرہ لئے ہوئے آیا۔ رلجہ صاحب نے آتے ہی اس شخص سے گیلے کپڑے بدلنے کو کہا۔ اور نوکر سے کہا۔ جیپ میں رکھ دو۔ اور بہت سی لکڑیاں لا کر یہاں رکھ دو۔ میں کچھ لوگوں کو لینے جا رہا ہوں۔ میری واپسی پر بہت سا گرم پانی تیار ملے۔ اور میز پر بسکٹ اور پیسٹریاں بھی لگی ہوئی ملیں۔ اتنی دیر میں اس شخص نے کپڑے تبدیل کر لئے۔

رلجہ صاحب نے اس کے ہاتھ میں کافی کا کپ تھما دیا۔ اس نے جلدی جلدی گرم کافی کے کئی بڑے گھونٹ لئے۔ آگ کی حرارت اور گرم کافی نے خاطر خواہ کام کیا۔ اس کی تھر تھری کچھ کم ہوئی تو اس نے بتایا۔

رلجہ صاحب، کیا کہوں یہ وارڈن کتنا بُرا آدمی ہے۔ یہ شام کو میرے پاس آیا۔ اور بولا چلا بُڈھوا چل رہے ہیں۔ وہاں دعوت ہے۔ رات کو لوٹتے وقت رلجہ صاحب کو بھی چیک کیا

جائے گا۔ مجھ کو اطلاع ملی ہے کہ وہ روز رات میں شکار کھیلتے ہیں اور جانور مارتے ہیں۔ میں آج ان کو رنگے ہاتھوں پکڑوں گا۔ اِس وقت تو وہ بہانہ کر کے نکل گئے۔ لیکن اب نہیں بچ سکتے۔

ہم لوگوں نے اُس کو لاکھ سمجھایا کہ راجہ صاحب رات کو کبھی کوٹھی سے باہر نہیں نکلتے اور بالکل قاعدے کے مطابق شکار کھیلتے ہیں۔ ہاں ان کے ساتھ دو ایک نوجوان ضرور ہیں۔ جوان کے لڑکے کے ساتھ کبھی کبھی رات کو شکار کھیل لیتے ہیں۔ ویسے راجہ صاحب بہت شریف اور عمدہ آدمی ہیں۔ ان کی بابت آپ کے ایسے خیالات آپ کو شوبھا نہیں دیتے۔ لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ کھانا کھا کر اس نے آپ کی کوٹھی چلنے کو کہا۔ ڈرائیور سے کہا، دوسری سیکنڈ کلاس روڈ سے گاڑی لے چلو۔ یہ راستہ نزدیک کا ہے۔ ڈرائیور نے کہا اس پر دریا کا پُل خراب ہے۔ رات میں اُس پر گاڑی لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اس نے ڈرائیور کو ڈانٹا اور کہا گاڑی اُسی سڑک سے جائے گی، اسی سڑک سے جائے گی۔ دعوت میں ہم سب نے ڈٹ کر مرغ کھائے تھے۔ اور شراب بھی جی بھر کے پی تھی۔ اس وجہ سے اس سڑک کے پُل پر دھیان نہیں دیا۔ حالانکہ مجھ کو معلوم تھا کہ پُل ٹوٹ چکا ہے اور سڑک بند ہو چکی ہے۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد مجھ کو بالکل خبر نہیں ہوئی کہ ہم کس راستہ سے جا رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا اور نشے نے ہم کو بالکل مغلوب کر لیا تھا۔ ڈرائیور بھی ترنگ میں تھا۔ اور جیپ ستر پچھتر کلومیٹر کی رفتار سے اُڑی چلی جا رہی تھی۔ جیپ جیسے ہی پُل پر آئی، اس نے ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور فوراً ایک بہت زور کے چھپاکے کے ساتھ بیچ دریا میں گری۔ جیپ میں ہوا بھر جانے کی وجہ سے اس کے کپڑے کا ہُڈ پھٹ گیا تھا۔ اس وجہ سے ہم لوگ جو پیچھے بیٹھے تھے نکل کر پانی میں گرے۔ ہم لوگ ڈوبتے اچھلتے کنارے پر پہنچ گئے۔ وارڈن صاحب بھی وہاں بھیگی مرغی بنے کنارے پر آ چکے تھے۔ اب فکر ہوئی۔ سب آدمی کنارے پر آ چکے ہیں یا ابھی کوئی دریا میں ہی پھنسا ہوا ہے۔ وارڈن نے کہا گنتی کرو۔ ہم سات آدمی تھے۔ اب گنتی جو کی گئی تو معلوم ہوا کہ دو آدمی کم ہیں۔ وارڈن کی گھگّی بندھ گئی۔ اس نے کہا پولیس کے دو سپاہی نہیں ہیں جو ڈِگی میں بیٹھے تھے۔ آپ لوگ شاید جیپ کی ڈِگی نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ اس زمانہ میں مہندرا اینڈ مہندرا کی

جیپوں میں پیچھے کی طرف ایک خانہ سا ہوتا تھا جو پچھلی سیٹوں کے پاس پہیوں کے باہر نکلا ہوتا تھا۔ یہ جگہ سامان رکھنے کو بنائی گئی تھی۔ یہ جگہ سرکاری جیپوں میں سپاہیوں اور اردلیوں کے بیٹھنے کے کام لائی جاتی تھی۔

جیپ بیچ دریا میں کھڑی تھی۔ وہاں پر پانی ڈباؤ تھا۔ اور سردی بھی شدید تھی۔ شوٹنگ گارڈس نے دریا میں گھس کر اپنی دونوں بندوقیں نکالیں۔ لیکن ایک سپاہی اور دونوں پولیس کی رائفلیں غائب تھیں۔ ایک سپاہی بیچارہ ڈگی میں پھنس کر مر گیا تھا۔ دوسرا شاید دریا میں بہہ کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ ایسے وقت میں آپ کے علاوہ کون مدد کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں چھ میل پیدل چل کر بیچ جنگل سے تن تنہا آپ کے پاس مدد لینے آیا ہوں۔ باقی لوگ وہیں ہیں۔ وارڈن آپ سے شرمندگی کی وجہ سے مدد لینے کو تیار نہیں ہے۔

میں نے سب واقعات آپ کو بتا دیے۔ اب آگے آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ وارڈن کی نوکری اور زندگی کا دارومدار آپ پر ہے۔

راجہ صاحب نے کہا مدد نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا آپ کے قصہ سنانے سے پہلے ہی میں نے ہر وہ چیز مہیا کر لی ہے جس کی آپ کو ضرورت ہوگی۔ اب صرف ایک چیز کا اضافہ اور کرنا ہے، وہ ہے رسّی۔ جس کی مدد سے آپ کی جیپ نکالی جائے گی۔ لیجئے وہ بھی گاڑی میں رکھ دی گئی۔ اب آپ ایک کمبل لپیٹ لیں اور گاڑی میں چل کر بیٹھیں۔ وہ لوگ جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی۔ ایک سپاہی کی لاش نہیں مل سکی تھی۔ دوسرے سپاہی کی لاش یہ لوگ ساتھ میں لائے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی نہیں مل سکی تھیں۔

صبح کو کچھ غوطے خور بلائے گئے۔ اور دوسرے سپاہی کی لاش اور رائفلیں بھی نکال لی گئیں۔ یہ کوئی ہیڈ سپاہی تھا۔ ان سب چیزوں کے ملنے کے بعد مسئلہ تھا لکھیم پور پہنچنے کا۔ ان لوگوں کی جیپ وہاں جا نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کے کاربریٹر، ڈسٹی بیوٹر بھیگ چکے تھے اور انجن میں پانی چلا گیا تھا۔ لہٰذا راجہ صاحب اس لشکر کو جس میں دو لاشیں بھی تھیں اپنی جیپ میں لے کر لکھیم پور پہنچے۔ سب سے پہلے یہ لوگ پولیس لائن گئے۔ جہاں سے انہوں نے پولیس گارڈ

کولیا تھا۔ جب پولیس کے آدمیوں کو معلوم ہوا تو وہ غم وغصہ سے پاگل ہو گئے اور اگر وارڈن، راجہ صاحب کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ وہیں مارا جا چکا ہوتا۔ کیونکہ سپاہیوں کے بگڑے تیور دیکھ کر لائن انسپکٹر نے صاف کہہ دیا تھا، میں کسی بات کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ آپ ان کو لے کر فوراً ایس۔ پی یا کلکٹر کے پاس جائیں۔ اگر یہ یہاں رُکے رہے تو ضرور مار ڈالے جائیں گے۔

راجہ صاحب وارڈن کو لے کر وہاں سے ہٹ گئے۔ یہ راجہ صاحب کے اثر ورسوخ کا کرشمہ تھا کہ وارڈن صاحب بالکل صاف بچ گئے۔ اُن پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ جب تک وہ وائلڈ لائف وارڈن اس ڈویژن میں رہے، راجہ صاحب کے کسی بلاک میں آئندہ چیکنگ کرنے نہیں گئے۔ اور نہ ہی ان سے ملنے کبھی ان کی رہائش گاہ 'کول' آئے۔

کالا ڈونگا کا آدم خور

یوپی کے شمال میں، دو بل اسٹیشن الموڑا اور نینی تال ہیں۔ یہ الگ الگ دو ضلعے بھی ہیں۔

ڈسٹرک نینی تال میں، ہلدوانی سے چودہ پندرہ میل پچھم میں ایک جنگل کے بیچ میں ایک چھوٹا قصبہ کالا ڈونگی ہے۔ اسی کالا ڈونگی میں کاربٹ کا مکان ہے اور اس سے ملے ہوئے جنگل میں ہی کاربٹ نے شکار کھیلنا سیکھا اور کھیلا۔

کالا ڈونگا، ڈسٹرک الموڑہ میں ہے، یہ ٹنک پور سے شمال میں تیس چالیس میل کی دوری پر ہے۔ اس جغرافیائی پوزیشن کو بتانے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ قارئین کالا ڈونگی اور کالا ڈونگا کا فرق سمجھ لیں۔

اس کالا ڈونگا میں ایک شیر آدم خور ہو گیا تھا، جو نیپال میں رہتا تھا۔ لیکن خاص پورن ماشی کے دن یہ شیر نیپال سے آکر اس علاقہ میں ایک آدمی ضرور مارتا تھا۔ یہ اس کا بندھا ٹکا قاعدہ ہو گیا تھا۔ کئی سال سے اس کی یہ کارروائی جاری تھی۔ کوئی شکاری اس کو اب تک مار نہیں سکا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ٹنک پور سے جو راستہ پنا دیوی سے کالا ڈونگا کو جاتا تھا، وہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس سڑک پر آمدورفت بالکل بند ہو چکی تھی اور کوئی سواری اس پر چل نہیں سکتی تھی۔ لیکن مقامی لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے اس ٹوٹے ہوئے راستہ سے پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔ اس سفر میں بہت بھیانک اور پہاڑی جنگل اور ٹوٹے ہوئے پُر پیچ راستے سے سابقہ پڑتا تھا اور ان کو ایک رات جنگل میں ضرور بتانی پڑتی تھی۔ کیونکہ پونا گری اور ٹنک پور کا راستہ کافی لمبا تھا جو ایک دن میں طے کرنا ناممکن تھا۔

یہ لوگ جو اس ٹوٹی پہاڑی سڑک پر آتے جاتے تھے، شیر کے بالکل کھلے شکار تھے اور ان کے لئے خطرہ بہت بڑھ جاتا تھا۔ یہ شیر ایک لمبی مدت سے آدمیوں کا شکار کر رہا تھا۔ اس

وجہ سے بہت چالاک ہو گیا تھا۔ آدمی کا خوف اس کے دل سے بالکل نکل چکا تھا۔ اور اُن کو بڑی آسانی سے دھوکا دے کر جب چاہتا مار لیتا تھا۔ لوگ رات رات بھر جاگ کر اور لکڑی کے بڑے بڑے الاؤ لگا کر اپنی حفاظت کرتے لیکن یہ کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتا۔ یہ ان کے ساتھ لگا چلتا رہتا۔ جیسے ہی کوئی آدمی لاپروائی برتتا، یا حوائج ضروری کے لئے گروپ سے الگ ہوتا، یہ اپنا کام کر جاتا۔ بعض مرتبہ تو یہ بھرے مجمع سے آدمی کو اُٹھا لے جاتا اور اس سے اگلے آدمی کو پیچھے والے آدمی کے مارے جانے کی خبر بھی نہ ہو پاتی جب تک کہ دوسرے اس کو یاد نہ کریں۔ اتنی دیر میں شیر ان سے دسوں میل دور چلا گیا ہوتا۔

شروع شروع میں تو لوگ سمجھ ہی نہ پائے کہ روز روشن میں آدمی کس طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لوگ کھڈوں میں اُتر کر ان کی تلاش کرتے۔ چشموں کو بھی کھنگالتے۔ لیکن وہ شخص نہ ملتا۔

شیر چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کتنی چالاکی سے شکار کیوں نہ کرے، لیکن پنجوں کے نشان اور خون کو تو وہ چھپا نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ چور چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، لیکن کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ اس سڑک پر حادثات تو ہوتے ہی رہتے تھے اور لوگ مجبور تھے کہ ان کو سڑک پر گزرنا ہی تھا۔ اس کے علاوہ وہ شیر کھیتوں اور گھروں سے بھی آدمی اٹھا لے جاتا تھا۔ پہاڑوں میں گاؤں بہت بکھرے ہوئے اور دو دو تین تین گھروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اپنے گھر اپنے کھیتوں ہی میں بنا لیتے ہیں جہاں پر پانی کی سہولت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے گاؤں میں لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ میدانی علاقوں کی طرح وہاں بڑی آبادی کے گاؤں نہیں ہوتے۔ زیادہ تر لوگ غریب اور فاقہ کش ہوتے ہیں۔ کھیتی کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں ہوتا۔ اگر بارش ہو گئی تو فصل بھی اچھی ہو گئی۔ بارش کم ہوئی تو فصل خراب۔ ایسی کھیتی سے بھلا اچھی آمدنی کیسے ہو سکتی ہے!

پھر سوال راستوں کا آجاتا ہے۔ منڈی اور ڈسٹرک ہیڈ کواٹر کوسوں دور۔ فصل بیچنا ایسی صورت میں بہت مشکل کام ہے۔ زندگی کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ اگر وہ ضائع ہو جائے تو

اس سلسلے میں کسی کو اطلاع کرنے کا کیا مطلب۔ بغیر وجہ کے اخراجات۔ یا بلا وجہ کا بار کوئی کیوں اُٹھائے۔ مرنے والا مر گیا۔ پہاڑ سے گر کر مرے، یا شیر کھا جائے، کیا فرق پڑتا ہے۔ آج اگر شیر نہیں کھاتا تو کل فاقہ کر کے مر جاتا۔ یا کسی بیماری میں بغیر علاج کے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔ شیر نے کھا لیا، صرف دو منٹ کی تکلیف ہوئی۔ یہ موت بہت آسان اور زیادہ اچھی تھی لیکن موت ایک ڈراؤنی چیز ہے۔ لہٰذا اس سے بچنے کے لئے ہر قسم کی پیش بندیاں یہ پہاڑی لوگ بھی کرتے، جو اُن کو شیر سے محفوظ رکھ سکیں۔ شام کو باہر کھلے کھیتوں اور جنگلوں، ویرانوں، جھاڑیوں اور چشموں کے پاس سے جلدی گھر واپس آ جاتے۔ باہر یہ لوگ مل کر کام کرتے اور ساتھ ساتھ مجمع کر کے چلتے۔ لیکن پگڈنڈیوں یا بٹیہ پر صرف ایک ہی آدمی چل سکتا ہے، اس لیے جو آدمی بیچ میں ہو، محفوظ رہ سکتا ہے۔ لیکن آگے اور پیچھے والا شیر کا تر نوالہ تھے۔ غرض اس علاقہ میں شیر کا خوف تو تھا لیکن کوئی کام رُکا ہوا بھی نہیں تھا۔ زندگی جیسے لڑھکتی ہوئی چل رہی تھی۔ زمانہ انگریزی دورِ حکومت کا جہاں عوام کی فریاد اوپر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

کافی عرصہ ہوا۔ ایک مرتبہ ایک ہی مہینہ میں دو بلاک ہماری پارٹی کے نام بک ہو گئے۔ اس میں ایک پہاڑی بلاک تھا۔ دوسرا میدانی علاقہ کا۔ ویسے ہماری پارٹی کا قاعدہ یہ رہا ہے کہ ایک مہینہ میں صرف ایک ہی بلاک بک کرواتے ہیں، لیکن سال میں کم از کم تین بلاک ضرور بک ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے سے سال میں تین مہینہ جنگل میں گھومنا پھرنا ہو جاتا ہے۔ جس کو جب فرصت ہوتی ہے، وہ اس شکار میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہماری پارٹی میں ایک وقت میں تین شکاریوں سے زیادہ کی تعداد کبھی نہیں بڑھتی تھی۔ ایک آدھ چیڑ قناتی تو شکار میں ضرور گھس آتا، جو دردِ سر ہو جاتا۔ کبھی اس کو ڈر لگتا ہے، کبھی کھانے میں اس کو شکایت ہو جاتی ہے، کبھی بیٹھنے میں قلّت ہو جاتی ہے۔ آخر تنگ آ کر وہ آئندہ کسی دوسرے شکار میں چلنے کا کبھی قصد نہیں کرتا۔ ہم لوگ خیال کرتے ہیں، چلو پیچھا چھوٹا۔ اس عذاب سے نجات ملی۔ اس مرتبہ جب دو بلاک ایک ہی مہینہ میں بک ہو گئے تو ہم لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں ہر ممبر کا آنا لازمی تھا۔ اس میں دو ممبر، دو الگ الگ ضلعوں کے رہنے والے تھے، اور جن کا ہونا اس میٹنگ میں ضروری تھا۔ میٹنگ ہوئی، بہت ہنگامہ ہوا۔ میٹنگ تقریباً چار گھنٹہ چلی۔ اس

میٹنگ میں سب پُرانے اصول توڑ دیے گئے۔ اور طے یہ ہوا کہ دونوں بلاکوں میں شکار کھیلا جائے۔ اس میں ایک بلاک پہاڑ کا تھا، دوسرا میدان کا۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ یہ دونوں بلاک ہمارے شہر سے ایک ہی سمت اور ایک ہی لائن میں پڑتے تھے، لہٰذا ان دونوں بلاکوں میں جانے کی بڑی سہولت ہوگئی۔

ہر ممبر کو یہ چھوٹ بھی دی گئی کہ وہ اس شکار میں اپنے جتنے مہمان لے جانا چاہے، لے جا سکتا ہے۔ لیکن اس شخص کے یہ مہمان ایک ہی بلاک میں شکار کھیل سکتے ہیں، دونوں میں نہیں۔

یہ کوئی اچھا فیصلہ نہ تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اس کے نتائج سب کو ایسے شدید بھگتنا پڑیں گے کہ جو وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ اس فیصلے کے بعد ہم لوگوں نے اپنے خاص الخاص دوستوں اور ہم عمر عزیزوں کی ایک فہرست تیار کی۔ اور بہت سوچ بچار کے بعد چند لوگوں کو مدعو کیا۔ ہماری پارٹی میں اس وقت دو گاڑیاں تھیں۔

ایک جیپ اور ایک شیورلیٹ۔ اس میں ہماری پارٹی اور نوکروں کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے بہت دِقّت سے گنجائش نکل سکتی تھی۔ پہلے یہ آسانی تھی کہ مرزا جی کی بسیں اس لائن پر چلا کرتی تھیں، جو دوسری بڑی لڑائی کی وجہ سے انگریز فوج نے ایکوائر کر لی تھیں۔ لہٰذا یہ سہولت ختم ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے دوستوں کو مدعو کرتے وقت اس کا بالکل خیال نہیں کیا۔ جو مدعو کئے گئے تھے، ان کے پاس اپنی گاڑیاں نہیں تھیں۔ کچھ لوگ دور دراز کے شہروں سے بھی مدعو کئے گئے تھے۔ وہ اپنی گاڑیاں یہاں تک نہیں لا سکتے تھے۔ کیونکہ اس وقت پٹرول کا راشننگ تھا اور کوپن سے مل سکتا تھا۔ اور ہر گاڑی کی اس کے ہارس پاور کو مدنظر رکھ کر پٹرول کا راشننگ کیا گیا تھا۔ جو ہر گاڑی کے لئے ناکافی رہتا تھا۔ یہ پٹرول کے کوپن سرکاری خزانہ یعنی ٹریژرری سے ہر مہینہ ملتے تھے۔ اور کلکٹر اس وقت انگریز ہوتا تھا جس پر آج کل کی طرح دھونس بغا، دوستی اور پولیٹکل پریشر نہیں پڑ سکتا تھا۔ 'نیتا' شاید ابھی اس زمانہ میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا، اور اگر ہُوا بھی ہو تو ہم کو ملا نہیں تھا۔ اور پٹرول پمپ والے شاید اس وقت بلیک کرنا جانتے ہی نہ تھے۔

سب سے پہلی دِقت جو سامنے آئی، وہ پٹرول کی تھی۔ اس پارٹی میں فساد کی جڑ سراج چچا تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ سراج چچا ایک ایسی شخصیت ہیں جن کو دوسروں کے لئے پریشانیاں پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔ جب بھی ان کی بات مانی گئی، کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے کھڑا ہو گیا جس سے نپٹنا دوبھر ہو جاتا۔

میری اس بات سے آپ سراج چچا کے متعلق کوئی غلط اندازہ نہ لگائیں۔ ان کے بغیر ہماری پارٹی نامکمل تھی۔ ہم سب ان سے انتہائی عقیدت رکھتے اور محبت کرتے تھے۔ ان کے بغیر جنگل میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ہم سب جیسے یتیم سے ہو گئے۔ شکار سے دل پھیکا ہو گیا۔ ''ہائے سراج چچا۔''

سراج چچا ہمارے کسی کے بھی چچا نہیں تھے۔ لیکن سَب ان کو چچا کہتے تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ لیکن ان کی بات جب بھی مانی، ہمارے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اس شکار میں دوستوں کو مدعو کرنے والی تجویز بھی سراج چچا ہی کی تھی۔ اس وقت تو اس پر غور نہیں کیا۔ کیونکہ سب کی دبی ہوئی خواہش بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ جب یہ تجویز سراج چچا کی طرف سے آئی، تو ہر شخص نے اس کی تائید کی، کہ آئی گئی سراج چچا کے سر منڈھی جائے گی۔ لہٰذا لوگوں کو مدعو کر بیٹھے۔ لیکن جب جانے کا سوال پیدا ہوا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ بھیڑ شکار گاہ تک جائے گی کیسے۔ وقت گزر چکا تھا۔ کسی کو اب منع بھی نہیں کیا جا سکتا تھا یہ مسئلہ اب بہت زیادہ نازک بن چکا تھا۔ شہر میں رہ کر ہر کس و ناکس سے ناراضگی مول نہیں لی جا سکتی تھی، نہ ہی شکار کے لئے لوگوں کو ناراض کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی تعلقات اور رشتہ داریاں ختم کی جا سکتی تھیں۔ یہ بات اور بھی گھٹیا ہوتی کہ ہم سب تو موٹروں سے آرام اور سہولت سے جائیں، اور مہمان ریل یا کسی اور طریقہ سے شکار گاہ پہنچیں۔

ہم لوگوں نے اس پرابلم کو، جتنی ہماری سمجھ تھی، اس کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی، لیکن یہ پرابلم بدستور اُلجھتی ہی جا رہی تھی۔ کئی پروپوزل رکھے گئے لیکن کسی کو ان پر اتفاق نہ ہوا۔ اور ہر پروپوزل میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور نکالی گئی۔ آخر میں طے ہوا کہ نوکر لوگ، سامان، ڈرائیور، راشن، کراکری، اور بستروں کے ساتھ ریل سے جائیں اور ٹنک پور میں ہمارا انتظار

کریں۔ ہم لوگ گاڑیوں سے ڈرگا پیپل پہنچ جائیں گے۔ لیکن ڈرگا پیپل ہنک پور سے بہت دور پڑتا تھا اور راستہ نہایت خطرناک تھا۔ کیونکہ پہاڑی سڑک کچی اور بہت تنگ تھی۔ ایک پہاڑی دریا بھی تھا جو میلوں بل کھاتا ہوا اس سڑک کو کئی جگہ کراس کرتا تھا۔ اور اس کو پار کرنا پڑتا تھا۔ وہ کہیں اتنا گہرا تھا کہ اس کو پار کرنا بہت ماہر لوگوں کا کام تھا۔ اگر کوئی گاڑی کبھی دریا میں پھنس جائے اور اس کا ایکسل ٹوٹ جائے اور گاڑی بند ہو جائے تو وہ گاڑی سمجھئے بالکل بیکار ہو گئی۔ کیونکہ اس کے چیمبر میں پانی بھر جائے گا۔ اور گاڑی بغیر انجن اوور ہال کیے دوبارہ نہیں چل سکتی۔ ایک دوسرا راستہ کاٹ گودام ہو کر جاتا تھا۔ یہ راستہ تو ٹھیک تھا، لیکن ہمارے شہر سے کاٹ گودام بہت دور پڑتا تھا۔ دو جگہ ریل بھی تبدیل کرنا ہوتی تھی۔ ایک دن میں اس طرف سے ڈرگا پیپل نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ اور بغیر بستروں اور نوکروں کے ڈرگا پیپل میں رات نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ کھانا وغیرہ پکنے کا انتظام کیسے ہو سکتا، چائے کیسے بنتی۔ پانی کہاں سے اور کون لاتا۔ غرض زچ ہو گئے اور سراج چچا کو دل ہی دل میں کوسنے لگے اور ایک وقت تو ایسا آ گیا کہ ہم لوگوں نے صرف قسم نہیں کھائی کہ ہم شکار چھوڑ رہے ہیں، باقی سب کچھ کہہ بیٹھے۔

اس وقت سچویشن بھی کچھ اس قسم کی ہو گئی تھی۔ لہٰذا طے ہُوا کہ اب بوجھ بجھکڑ سے چل کر مشورہ کیا جائے۔ دیکھیں وہ کیا رائے دیتے ہیں۔

لہٰذا گئے سراج چچا کے پاس اور رکھی اپنی پرابلم۔ بہت سوکھا منہ بنا کر بولے، یہ بھی کوئی پرابلم ہے۔ اس میں دقت صرف پٹرول نہ ملنے کی تو ہے۔ میں نے کہا درحقیقت یہی سب سے بڑی دقت ہے۔ بولے، آپ گدھے ہیں۔ یہ کوئی دقت نہیں ہے۔ آپ اپنی کھوپڑی کا استعمال کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا میری کھوپڑی میں پٹرول نہیں ہے۔ ہم اتنا پٹرول کہاں سے فراہم کریں۔ یہ آپ فرمائیے۔

بولے، تمہارا ایک ٹامی دوست، کیپٹن مرچنٹ ہے۔ جس کی تم بار ہا بڑی تعریف کر چکے ہو۔ اور اس کو آم کھلانے ہمارے یہاں بھی لا چکے ہو۔ میں نے جل کر کہا وہ ٹامی نہیں، خالص انگریز ہے۔ بولے ہوگا۔ میں سب انگریزوں کو ٹامی ہی کہتا ہوں۔ ہماری زبان میں انہیں ٹامی ہی کہا جاتا ہے۔ وہ حرامی اور ٹامی پر کوئی مدلل تقریر کرنے ہی والے تھے کہ لوگوں نے ان کو

جھنجھوڑ کر مطلب پر آنے کے لئے مجبور کر دیا۔ بولے، ہم لوگوں کے لئے پٹرول کی کمی ہے لیکن فوج میں تو پٹرول بہا بہا پھرتا ہے۔ کیا وہ تم کو تھوڑا پٹرول نہیں دے سکتا۔ جبکہ وہ I.E.M.E کا انچارج ہے۔ ان کے یہ کہتے ہی میرے دماغ سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ وہاں سے آ کر میں سیدھا کیپٹن مرچنٹ کے پاس پہنچا اور اس سے چالیس گیلن پٹرول کے ایک بیرل کی درخواست کی۔ اس نے سارا واقعہ سننے کے بعد کہا، کل صبح دس بجے تمہارے گھر بیرل پہنچ جائے گا۔

میں خوشی خوشی واپس ہوا اور سیدھا سراج چچا کے پاس پہنچا، ان کو پٹرول ملنے کی اطلاع دی۔ وہ بولے اب کیا دقت ہے۔ میں نے کہا پٹرول کی دقت تو حل ہو گئی لیکن مہمانوں کو شکار گاہ تک موٹروں سے پہنچانے کی دقت اپنی جگہ برقرار ہے۔

ہنس کر بولے، تم لوگوں کو کچھ نہ کچھ قربانی تو کرنا ہی پڑے گی۔ عیاشی کر لو، یا تعلقات نبھا لو۔ ان کا یہ جملہ سُن کر تلووں سے لگی اور سَر کے اوپر سے نکل گئی۔ میں نے جل کر کہا کہ کیا ہم لوگ شکار میں عیاشی کرتے ہیں۔ بولے اس کو عیاشی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے کہا وہ کیسے۔ بولے کسی شکار میں کبھی دو چار میل پیدل چلے ہو۔ کبھی زخمی شیر کو بغیر ہاتھی کے ڈھونڈا ہے۔ کبھی شکار میں ایک وقت بھوکے رہے ہو۔ کبھی پانی کی دقت اٹھائی ہے۔ بس موٹر میں بیٹھے شکار گاہ آ گئے۔ جیپ میں بیٹھ کر بلاک گھوم لیے۔ اور کرنے لگے شکار۔ گولی چلائی۔ جانور اگر جگہ پر گر کر مر گیا تو ذبح کر لیا، زخمی جانور جو جگہ پر نہ ملا ہو، اسے کبھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ صاحب زادے، اس کو ہمارے یہاں شکار نہیں، عیاشی کہتے ہیں۔ تم لڑکوں کے ساتھ رہ کر مجھ بڈھے کی عاقبت بھی خراب ہو گئی۔

میں نے کہا دیکھئے سراج چچا، آپ کاوے نہ کاٹیے۔ اس مشکل کا حل بتائیے۔ کہنے لگے تم سب شکاری اور دو ایک خاص مہمان ریل سے کاٹھ گودام چلے جاؤ۔ بستر وغیرہ ساتھ لے جانا۔ رات میں کاٹھ گودام میں مرزا جی کے یہاں قیام کرنا۔ میں نوکروں اور کچھ مہمانوں اور باقی سامان لے کر موٹروں سے دُرگا پیپل پہنچ جاؤں گا۔ کل کو موٹریں تم کو کاٹھ گودام سے جا کر لے آئیں گی۔ کسی کو نہ دقت ہو گی اور نہ ہی شکایت۔

طے ہو گیا۔ واہ رے سراج چچا، چٹکی بجاتے ہی معمہ حل کر دیا۔ دل کو سکون ہوا، قلب

کو راحت ملی۔

ہم لوگ ڈرگا چیپل پہنچ گئے۔خوب شکار کھیلا۔ ڈھیروں مرغ، کلیج، فیزنٹ اور جانور مارے۔ ہم روز صبح کو دس بارہ مرغ اور کلیج مارتے تھے اور شام کو بھی اتنے ہی۔لیکن کھانے پر ایک ایک بوٹی کے لیے جھگڑا اور دھینگا مشتی ہوتی۔ پانچ دن اتنی جلدی گزر گئے کہ معلوم ہی نہ ہوئے۔ اس بلاک میں شیر تو کئی تھے، لیکن ہم لوگوں کو مرغ اور کلیج سے فرصت ملتی تو اِدھر دھیان دیا جاتا۔ ویسے بھی اس غول کے ساتھ ہم نے شیر مارنا مناسب نہیں سمجھا۔

اب دوسرا ریزرویشن تھا 'سرئی' کا جہاں ٹنک پور ہو کر ہی جا سکتے تھے۔ ہم لوگوں نے اس بلاک میں نہر کی ایک کوٹھی بک کروالی تھی۔ اس کا نام کچھ خان پر تھا۔ پہلا لفظ اس کا یاد نہیں آرہا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ اس بلاک میں کس کس کو ساتھ لے جایا جائے۔ کچھ کی رائے تھی کہ اب سب مہمانوں کو یہاں سے بک کر دیا جائے، اور ان کو موٹروں سے کاٹھ گودام پہنچا دیا جائے۔ یہ لوگ ٹرین سے اپنی اپنی جگہیں چلے جائیں گے۔ صرف شکاری پارٹی یہاں رہ جائے اور سرئی میں، جو دو بہت بڑے شیر ہیں، ان کو مارنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن یہاں ایک اور ہی نیا گل کھلا۔ یعنی دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک شکاریوں کی دوسری مہمانوں کی۔ سراج چچا مہمانوں کی پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ باقی آپ سمجھ لیجئے کیا ہُوا ہوگا۔ مہمان چاہتے تھے کہ وہ سرئی میں بھی شکار کھیلیں۔ لیکن شکاری چاہتے تھے کہ سرئی صرف شکاری پارٹی ہی جائے۔ آخر زِچ ہو کر ہم نے موٹروں سے ٹنک پور کے دو چکر لگائے۔ سب کو سرئی کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچایا۔ اور دوسرے دن پھر مجھ کو مرچنٹ کے پاس جا کر مزید پٹرول لانا پڑا۔ کیونکہ ابھی ایک ہفتہ اور اس بلاک میں شکار کھیلنا تھا۔

میں اس روز رات کو شہر سے پٹرول لے کر کوٹھی لوٹا۔ اس لیے جیپ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی جنگل میں نہ گھوم سکا۔ دو دن کی بھاگ دوڑ نے مجھے کافی تھکا دیا تھا۔ اس وجہ سے دوسرے دن صبح کو دیر سے اُٹھا۔ دیکھا کوٹھی بالکل سُونی پڑی ہے۔ ویرانی برس رہی ہے۔ سوائے نوکروں اور سراج چچا کے کوئی نہیں تھا۔

میں نے اور سراج چچا نے ناشتہ کیا اور ان لوگوں کے تھکا دینے والے انتظار میں کبھی کسی کمرہ میں جاتا، کبھی کسی برآمدے میں آتا، کبھی کوٹھی کے باہر احاطے میں جاتا، کبھی نہر کی پُلیا کے چکر لگاتا۔ لیکن وقت تھا جو آگے بڑھتا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی وہ لوگ آچکتے تھے۔ قریب دس بجے جب میرے آنسو آنکھ کے گوشوں سے نکل کر پلکوں کے پاس آکر رُکے ہوئے تھے تو جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے کھانس کر حلق میں اٹکے ہوئے گولے کو صاف کیا جو کافی دیر سے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ رومال سے آنکھیں پونچھیں۔ اور مستعد ہو کر جیپ کے استقبال کے لیے پھاٹک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جیپ آئی اور بہت تیزی سے میرے پاس سے گزر کر کوٹھی کے سامنے رُکی۔ اس وقت جیپ میرے ایک رشتہ دار چلا رہے تھے جو بعد میں میرے تیا سسر (سسر کے بڑے بھائی) ہوئے۔ یہ بلاک انھی کے نام ٹھیک تھا جو فارسٹ ڈپارٹ منٹ سے، بہت ڈرتے تھے۔

میں کوٹھی میں گیا۔ "اب آئندہ سے میں اُن کو "تیا سسر" ہی لکھوں گا۔ فادر اِن لا، سراج چچا سے کہہ رہے تھے، بڑا غضب ہو گیا۔ سامان جلدی جلدی پیک کیجیے۔ ہم فوراً یہ بلاک چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے ان کا یہ جملہ سُن لیا اور میں بھی بہت گھبرا گیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے پوچھا، بھلا ایسی کیا مصیبت آگئی کہ یہ بلاک فوراً چھوڑا جا رہا ہے۔ ابھی کچھ لوگ جنگل سے واپس نہیں آئے ہیں، ان کو بھی آجانے دیجیے اور وجہ بھی بتایئے۔ آخر ہُوا کیا۔ کیا ڈاکوؤں نے الٹی میٹم دے دیا۔ بولے ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیکن معاملہ اتنا سنگین ہے کہ میں ایک منٹ اور یہاں نہیں رُک سکتا۔ مجھ کو جانا ہی پڑے گا۔ ان کی بات سُن کر میرے دل میں خیال آیا، شاید یہ سب ڈرامے بازی مجھ کو ستانے کے لیے کی جا رہی ہے۔ کیونکہ پوری پارٹی میں مجھے ہی جنگل چھوڑنا اور شکار ختم کرنا سب سے زیادہ ناگوار گزرتا ہے۔

اب میں نے ذرا خوشامدانہ رویّہ اختیار کرتے ہوئے ان سے کہا۔ بھائی صاحب، اگر آپ سے جنگل کے سلسلے میں کوئی بدعنوانی ہو گئی ہو تو آپ بالکل فکرمند نہ ہوں، راجہ صاحب سب نپٹ لیں گے اور اگر کوئی آدمی آپ کی گولی سے مر گیا ہو تو ہم کو بتایئے۔ بہت جز بز ہو کر

بولے ' ارے لڑکے ایسا کچھ نہیں ہُوا۔ اگر آدمی مر گیا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ معاملہ تو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔' اس قصے کو آگے بڑھانے سے پہلے اگر فادر اِن لا کی مزاجی کیفیت کے متعلق کچھ لکھا جائے تو شاید نا مناسب نہ ہوگا۔

ہمارے فادر اِن لا، دُہرے جسم کے بہت سرخ وسفید، اوسط قد کے آدمی تھے۔ شکار کے انتہائی شوقین تھے۔ بندوق اور رائفل بہت اچھی چلاتے تھے۔ کئی شیر مار چکے تھے۔ ایک مرتبہ شیر سے کشتی بھی لڑ چکے تھے، جو راجہ صاحب کی بدولت ان کے حق میں چھوٹی اور میرے خیال میں راجہ صاحب کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی۔ راجہ صاحب کو اکثر اس غلطی پر شرمندہ بھی ہونا پڑا اور راجہ صاحب کی اس غلطی کی سزا کئی مرتبہ مجھ کو بھی بھگتنا پڑی۔ میں ان کے ساتھ شکار میں کئی مرتبہ ان کی غلطیوں میں شامل رہ کر اپنی جان سے ہاتھ دھوتے دھوتے بچا۔ آپ خوب سمجھ رہے ہوں گے کہ شکار میں مہلک غلطی، صرف شیر مارنے میں ہی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے فادر اِن لا، جنگل میں فائر کرنے کے بالکل قائل نہیں۔ جنگل کے جانور تو شاید ان کے نزدیکی رشتہ دار تھے۔ اس وجہ سے ان پر فائر کیسے کرتے! پارٹی میں مرغ اور تیتر مارنے والے دوسرے بُھتیرے تھے۔ یہ اپنے کارتوس فضول کیوں ضائع کریں۔ ماریں یہ اور کھائیں دوسرے لوگ۔ صرف شیر کو دیکھ کر یہ بوکھلا جایا کرتے تھے۔ پھر ہر احتیاط کو طاق میں رکھ کر جتنی جلدی ان کا جسم اجازت دیتا، ان کا فائر کرنا لازمی اور شیر کا زخمی ہونا ضروری ہوتا۔ زخمی شیر ڈھونڈنے والے، میں اور راجہ صاحب، دو بیوقوف موجود۔ شیر جائے گا کہاں۔ پہلی گولی ان کی لگی لہٰذا شیر ان کی کوٹھی کی زینت بنتا۔ کم از کم ایسے سات آٹھ شیر جواُن کی کوٹھی میں اسٹف کیے ہوئے آج تک موجود ہیں۔ کچھ کے صرف سَر۔ ایک آدھ پورے کا پورا اسٹف کیا ہوا۔ دانت کھوسیائے، منہ پھاڑے کسی کونے میں تختہ پر جڑا کھڑا ہے۔

ہر شکار میں مجھ سے اور راجہ صاحب سے ان کی تُو تُو مَیں مَیں ہونا ضروری تھی کیونکہ اگر موٹر میں یہ ساتھ ہوں، تو چاہے کتنے ہی خوبصورت سینگوں کا جانور ہو، یہ مارنے نہیں دیں گے۔ اور اگر دھینگا مشتی کر کے گاڑی رُکوا بھی دی جائے اور کوئی نشانہ لے کر، لبلبی دبانے والا

ہی ہو۔ یہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کریں گے کہ جانور فائر سے پہلے بدک کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ کبھی تالیاں پیٹیں گے۔ اور کبھی کوئی جانور ڈھیٹ ہوا تو گاڑی کا ہارن کر کیسے رُک سکتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بڑے جانور کا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ صرف مرغ، تیتر اور بٹیر کھانے والے آدمی تھے۔ لیکن باقی لوگ اور نوکر چاکر بغیر گوشت کے جنگل میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے کھانے کے لیے تو جانور مارنا ہی پڑے گا۔ سراج چچا پنا گردے کلیجی کے رہ نہیں سکتے۔ لیکن یہ شخص ایسے ایسے تماشے کرتا تھا کہ ہم لوگ جنگل میں ہوتے ہوئے بھی، اکثر گوشت سے محروم رہتے۔ ان کی اس حرکت سے راجہ صاحب، جو بہت بڑے شکاری بھی ہیں، اور بہت بڑے گوشت خور بھی۔ وہ ہر شکار میں ان سے خفا ہی رہتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہر شکار میں چلتی ہمارے فادر اِن لا ہی کی۔ مگر اس شکار میں راجہ صاحب کی چل گئی۔

ہُوا یہ کہ اس وقت شاید گونڈ کا شکار بند تھا یا فادر ان لا نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ گونڈ کا شکار بند ہو چکا ہے۔ خیر، یہ لوگ صبح سویرے جیپ لے کر نکل گئے۔ مقصد شیر کی تلاش تھا۔ لیکن جس ٹکڑے میں یہ لوگ داخل ہوئے، وہ نہر سے ملا ہوا تھا۔ اس وجہ سے اس میں کُہرا بہت تھا جس کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان لوگوں کو گھومتے پھرتے، گونڈوں کا ایک غول مل گیا۔ اس میں کچھ نر بہت بڑے سینگوں کے تھے۔ راجہ صاحب تاڑ گئے کہ یہ گونڈ ہی ہیں۔ اتفاقاً فادر اِن لا کے منہ سے نکل گیا۔ ''ارے راجہ، چیتل۔''

راجہ صاحب نے ان کی 366 بور رائفل جو ان کے پاس گن کیس میں لگی ہوئی تھی، اُن سے مانگی۔ ان بیچارے نے رائفل راجہ صاحب کو دے دی۔ راجہ صاحب نے اب ان سے جیپ کو تھوڑا آگے بڑھانے کو کہا۔ کیونکہ جانور کافی دور تھے، تب ہی ان کو گونڈ، چیتل معلوم ہو رہے تھے۔ یہ جانوروں پر دھیان دیے بغیر جیپ کو گڈھوں، گھاس اور کٹے ہوئے درختوں کے ٹھونٹوں سے بچاتے، جانوروں کی رینج میں پہنچ گئے۔

راجہ صاحب نے حرکت یہ کی کہ جیسے ہی جیپ رُکی، رائفل فادر اِن لا کے ہاتھ میں دے دی اور بولے یہ بڑے سینگوں والے چیتل کو گرا لو۔ یہ اس افراتفری میں نروس سے ہو چکے تھے۔ انہوں نے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ ایک جانور گرا باقی بھاگ گئے۔ فادر اِن لا جیپ

لے کر آگے بڑھے۔ اور جیپ کو جانور کے قریب لا کر روک دیا۔ انہوں نے کسی سے کہا کہ جا کر چیتل کو ذبح کر لو۔ وہ شخص گیا اور جب ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا جانور بہت بڑا ہے اور وہ اکیلے ذبح نہیں کر سکتا، کسی دوسرے آدمی کو بھی بھیجو۔ اس پر فادر اِن لا نے کہا، ارے بھائی جاؤ یہ بیچارے ایک چیتل کو نہیں ذبح کر سکتے۔ یہ سُن کر اس شخص نے بہت طیش میں آ کر کہا، آ کر دیکھو یہ چیتل ہے یا گونڈ۔ اس شخص سے یہ جملہ سُن کر راجہ صاحب کا قہقہہ نکل گیا۔

ہمارے فادر اِن لا سٹ پٹا کر جیپ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ جیپ کی سیٹ اور اسٹیرنگ کے درمیان اُن کا پھولا ہوا پیٹ پھنس جاتا تھا، جس کو یہ داب داب کر بڑی مشکل سے آزاد کر پاتے تھے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ہاتھوں کی مدد کے بغیر، اپنے پیٹ کو اسٹیرنگ اور سیٹ سے باہر نکالا اور کود کر جیپ کے باہر آ گئے۔ لیکن ایسا کرنے میں ان کو پسینہ آ گیا۔ غرض یہ کہ یہ لڑھکتے ہوئے گھاس میں گھسے اور گونڈ کو قریب سے دیکھا۔ گونڈ کو دیکھتے ہی، یہ بیہوش ہو کر زمین پر گرنے والے تھے کہ راجہ صاحب نے ان کو تھام کر زمین پر بٹھا دیا۔ انہوں نے اُکڑوں بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کیں اور راجہ صاحب کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس وقت راجہ صاحب اور سارے لوگ مارے ہنسی کے دُھرے ہو گئے۔ اسی وقت کسی نے ان کو یہ بات بھی یاد دلائی کہ یہ گونڈ اُن ہی کی رائفل سے مارا گیا ہے۔ اور ان کی رائفل کی گولی ابھی اس کے جسم میں موجود ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے۔ اور یہ ہزار خرابی اُٹھ کر جیپ میں گھسے۔ بغیر دھیان دیے ہوئے کہ سب جیپ میں بیٹھ گئے ہیں یا نہیں، جیپ لے کر کوٹھی بھاگ آئے۔ ان کی سانس ابھی تک پھولی ہوئی تھی۔ اُکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان ان کو جو بچت کی صورت معلوم ہوئی، وہ یہاں سے بھاگ جانے ہی میں تھی۔

میں راجہ صاحب کو لے کر وہاں سے ہٹ آیا اور بہت سنجیدگی سے کہا۔ یہ ڈرنے کا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ اصل میں اس شکار میں ان کی تفریح نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ آدم بیزار اور جھکّو قسم کے آدمی ہیں اس وجہ سے یہ یہاں سے بھاگ کر، ہم سب کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راجہ صاحب ان کا یہ پروگرام میٹریالائز نہ ہونے دیں۔ راجہ صاحب نے ایک دو

منٹ سوچا۔ اور میری کہی ہوئی بات جب ان کے دماغ میں پوری طرح اُتر گئی، تو بولے۔ دیکھو میں تو ان سے کچھ کہوں گا نہیں۔ تم ہی بات کرو اور ان کو یقین دلاؤ کہ تم گوند کو ٹھکانے لگا دو گے۔ اور اس کے جسم پر گولی کی جگہ اور دوسری جگہوں پر چاقو سے ایسے نشان بنا دو گے کہ یہ شیر کی کارستانی معلوم ہونے لگے۔ اور جا کر اس کو دریا میں ڈال دو گے۔ تم کو جو کچھ کرنا ہے فوراً کرنا ہے۔ ورنہ وہ تھوڑی دیر میں یہ بلاک چھوڑنے ہی والے ہیں۔ میں بادلِ ناخواستہ دوبارہ فادر اِن لا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت دقتوں سے اُن کو اس ترکیب پر عملی جامہ پہنانے پر راضی کر سکا۔

اتنے میں دوسری گاڑی بھی آ گئی۔ اس گاڑی میں ایک پہلوان صاحب بھی تھے۔ جن کی رانیں ہاتھی کے پیر کے برابر موٹی تھیں۔ ان کو اور تین چار آدمیوں کو لے کر میں جیپ سے گوند کی تلاش میں پہنچا۔ گوند بغیر ذبح ہوئے ٹھنڈا پڑ چکا تھا اس لیے ہمارے کھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ہم پانچ چھ آدمیوں نے اپنی پوری طاقت صَرف کر دی لیکن گوند کی لاش ٹس سے مَس نہ ہوئی۔ اب میں نے پہلوان صاحب سے کہا، ایک ترکیب کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جیپ کے پچھلے بمپر میں ان کے سینگ پھنسائے جائیں اور جیپ اسٹارٹ کر کے دریا تک لے جائی جائے۔ وہاں اس کو دھکیل کر دریا میں پھینک دیا جائے اور اگر دریا میں نہ گر پائے تو سڑک سے تو دور ہو ہی جائے گا۔ ترکیب پسند کی گئی، لہٰذا پہلوان صاحب سے درخواست کی گئی کہ آپ اس کے سینگ پکڑ کر اس کے سر کر اُٹھائیں۔ اور اس کو جیپ کے بمپر میں پھنسا دیں۔ پہلوان بیچارے نے دونوں سینگوں کو پکڑ کر پورا زور لگایا تا کہ اس کا سر اٹھ جائے، لیکن جیسے ہی پہلوان صاحب نے سینگوں کو پکڑ کر زور لگایا، ویسے ہی گوند کا ایک سینگ اس کے سر سے ٹوٹ کر پہلوان صاحب کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور اس کے ٹوٹتے ہی دوسرا سینگ بھی سر کے پاس سے ٹوٹ گیا۔ پہلوان صاحب بیچارے پشت کے بل گر پڑے اور ایک کٹے ہوئے درخت کا ٹھونٹا ان کی پیٹھ میں گھس گیا۔ بڑی مشکل سے ان کو سیدھا کیا جا سکا۔ کپڑے ہٹا کر ان کے جسم کو دیکھا گیا۔ ان کی پیٹھ میں ٹھونٹے کے گھسنے کی وجہ سے کافی بڑا گھاؤ آ گیا تھا اور خون رِس رہا تھا۔ ہم لوگ گوند کو بھول کر پہلوان صاحب کی فرسٹ ایڈ میں لگ گئے جو وہاں دستیاب نہیں

تھی۔ صرف اتنا ہو سکا کہ سب کے رومال ملا کر ایک گدی بنائی گئی اور اس گدی پر قمیص اور کوٹ کے اوپر گھاس سے بنی ہوئی ایک رسی باندھی گئی۔ اور ان کو جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے جلدی سے چاقو نکال کر گونڈ کے جسم پر کئی شگاف لگائے اور جیپ لے کر سیدھا ایک قریبی گاؤں پہنچا جو تیوریا ٹنک پور روڈ پر تھا۔ وہاں اس زمانہ میں ڈاکٹر کیا ملتا، لہٰذا ہم کو تیوریا جانا پڑا۔ وہاں کے اسپتال میں ان کی مرہم پٹی کرائی اور شام کو چار بجے کیمپ واپس آگئے۔

میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ جب ڈاکٹر ان کی مرہم پٹی کر رہا تھا تو اس نے بتایا کہ اگر کبھی جنگل میں اس قسم کا حادثہ پیش آئے اور زخم وغیرہ آجائیں تو پریشان بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ جنگل میں ہر جگہ لال ٹینا کی جھاڑیاں بڑی کثرت سے اُگی رہتی ہیں۔ ان کے پتوں کا عرق نچوڑ کر زخم پر لگا دینے سے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ لال ٹینا کی پتیوں میں ٹنکچر آیوڈین کی وافر مقدار ہونے کی وجہ سے، یہ زخم کو جلد مندمل کر دیتی ہیں اور سیپٹک وغیرہ کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

کوٹھی پہنچنے پر مجھ سے اتنی دیر سے آنے کی وجہ پوچھی گئی۔ میں نے اتنی دیر میں ایک قصہ گڑھ لیا تھا۔

میں نے کہا، فارسٹ والے آگئے تھے۔ ہم لوگ رنگے ہاتھوں گونڈ اٹھاتے پکڑے گئے۔ وہ سب کو لے کر تیوریا گئے۔ سب کو پولیس کے حوالہ کر دیا۔ پہلوان کو ہسپتال میں بھرتی کروایا۔ کیونکہ ایک فارسٹ گارڈ نے ان کی پیٹھ پر کانٹا مار دیا تھا جس سے ان کی پیٹھ پر بڑا سا زخم ہو گیا۔ انہوں نے ہماری رپورٹ لکھوائی کہ ہم نے گونڈ مارا ہے، جو بند ہو چکا ہے اور جس کا مارنا جُرم ہے۔ ہم نے ان کی رپورٹ لکھوائی کہ انہوں نے پہلوان پر کانٹا چلایا ہے جس سے ان کی پیٹھ پر زخم آگیا ہے۔ وہاں کا داروغہ بہت شریف آدمی تھا۔ اس نے فارسٹ والوں سے جب جرح کی تو ثابت ہوا کہ ہمارے پاس کوئی رائفل بندوق تو تھی نہیں، پھر ہم نے گونڈ کیسے مارا۔ ان کا جواب ناکافی تھا۔ اس وجہ سے ہم چھوٹ گئے۔ اور وہ پہلوان کے کانٹا مارنے کے جُرم میں دھر لیے گئے اور ان کا چالان ہو گیا۔ بعد میں انہوں نے بہت کہا کہ ان کے

ساتھی گونڈ مار کر بھاگ گئے، یہ لوگ اس کو اٹھا رہے تھے، کہ ہم لوگوں نے ان کو پکڑ لیا۔ ان کی یہ بات دار اوغہ ہضم نہیں کرسکا۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر ہم مارتے تو اس کو ذبح بھی کرتے۔ اس کو ذبح نہ کرنا ہماری بچت کا سبب بن گیا۔

ہماری اس بات کا کسی نے بھی یقین نہیں کیا۔ لہٰذا پہلوان صاحب کا کوٹ اُتروایا گیا اور قمیص اُلٹ کر زخم دیکھا گیا، جس پر ہسپتال کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آخر جب خوب پریشان کرلیا تو سب کو اصل واقعہ سنانا پڑا تب جاکر سب کے سانس درست ہوئے۔

بہر حال ہمارے ہونے والے فادر اِن لا کو کئی دن رُکنا پڑا۔ بڑا دلچسپ شکار رہا۔ ڈھیروں جانور مارے گئے اور دیکھے گئے۔ کیونکہ جنگل کے اس ٹکڑے کا کٹان ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے وہاں لیبر بہت کثرت سے تھی، جس میں پہاڑ کے لیبر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ لوگ گوشت کے عاشق ہوتے ہیں۔ ہمارا آنا جانا اس ٹکڑے میں اکثر ہوتا۔ کیونکہ سارے بلاک کی مرغیاں وہاں اکٹھا ہوگئی تھیں۔ ٹھیکیدار کے جھالے پر بھی اکثر جانا ہوتا۔ ان پہاڑی مزدوروں میں ایک لیبر تھا جو کسی سے بولتا چالتا بالکل نہیں تھا۔ ہر وقت غمگین اور سنجیدہ رہتا تھا اور کام بڑی محنت سے کرتا تھا۔ اس کے دو بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ ایک بہت چھوٹی سی بچی، دوسری چھ سات سال کی بچی، جو جھالے پر اپنے چھوٹی بہن کے پاس رہتی تھی۔ چھوٹی بچی ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں نے کسی سے اس بچی کی بابت پوچھا۔ اس نے کہا اس بچی کی ماں نہیں ہے۔ اس کو شیر نے مارڈالا۔ یہ آدمی اپنی ان دونوں بچیوں کو لے کر یہاں آگیا ہے۔ اور کام کرنے والوں میں شامل ہوگیا۔ یہ آدمی بہت دُکھی ہے۔ کام کی وجہ سے اس کی چھوٹی بچی کی دیکھ بھال یہ چھ سال کی بچی کرتی ہے۔ ننھی بچی ہر وقت بھوک سے بلکتی رہتی ہے۔ یہاں دودھ وغیرہ تو مل نہیں سکتا۔ وہ آدمی شام کو جب کام سے فرصت پاکر آتا ہے، تو اس بچی کو چاول وغیرہ کا مانڈ دیتا ہے۔ اس وجہ سے یہ بیمار بھی رہنے لگی ہے۔

میں یہ سب سُن کر کیمپ واپس آیا اور شام کو دودھ کا ایک ڈبہ لے کر اس لیبر کے پاس گیا۔ اس کو دودھ دے کر اور ترکیب استعمال بتا کر بچی کو اپنے سامنے دودھ پلوایا۔ بچی خاموش ہوگئی۔ اس آدمی کی آنکھوں سے آنسو گر پڑے۔ شکریہ کے، احسان مندی کے۔ میں نے اس

سے واقعہ پوچھا۔ اس نے کہا:

میں پونا گری کے قریب کا رہنے والا ہوں۔ میرا مکان وہاں سے دو تین میل کی دوری پر ہے جو میرے کھیتوں ہی میں بنا ہوا ہے۔ آپ اس کو مکان تو نہیں کہہ سکتے، ہاں ایک جھونپڑی سی ہے جس میں صرف ایک کمرہ ہے۔ جو وہیں سے نکالے ہوئے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ چھت پر پتھر کی سلیٹیں پڑی ہیں۔ یہ برسات اور جاڑے میں ہم کو پناہ دینے کے لیے کافی ہے۔ میں اور میری بیوی ان کھیتوں میں فصل کی کوئی نہ کوئی چیز بو لیتے تھے۔ گیہوں اور چاول تو ضرورت بھر ہی پیدا کر پاتے تھے۔ لیکن پیاز، آلو، اور کچھ موسمی ترکاریاں بھی پیدا کر لیتے تھے۔ مجھ کو چونکہ ترکاری وغیرہ فروخت کرنے کے سلسلہ میں دوسرے تیسرے دن پونا گری جانا ہوتا تھا، اس وجہ سے وہاں کے چند لوگوں سے جان پہچان بھی ہو گئی تھی۔ میں جب بھی پونا گری جاتا، شام تک ہی واپس ہو پاتا۔ وہاں میں کچھ ایسے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا، جو شرابی تھے۔ ویسے پہاڑ پر شراب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ مگر میں شراب بالکل نہیں پیتا تھا۔ لیکن ان کی صحبت نے مجھ کو بھی اس کی لت ڈلوادی۔

ایک روز کا ذکر ہے میں پونا گری گیا۔ رات ہو جانے کی وجہ سے میں لوٹ نہ سکا۔ میری بیوی جب انتظار کرتے کرتے تھک گئی تو ان دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر رات میں مجھ کو تلاش کرنے نکلی۔ راستے میں جنگل تو پڑتا ہی تھا، چاندنی رات ہونے کی وجہ سے بٹیا (پیدل کا راستہ۔ پگڈنڈی) چاندی کی لکیر کی طرف صاف دکھتی تھی۔ وہ اس بٹیا پر چلی جا رہی تھی کہ کہیں سے ایک شیر آ گیا اور میری بیوی کو مار کر کھا گیا۔ صبح کو جب میرا نشہ ٹوٹا تو بہت تڑکے گھر کی طرف بھاگا۔ راستہ میں مجھ کو میری بچیاں بٹیا پر پڑی ہوئی ملیں۔ چھوٹی بچی جو ماں کی گود میں تھی، گرنے کی وجہ سے معمولی سی زخمی ہو گئی تھی۔ لیکن بڑی لڑکی سردی اور خوف سے نیم جان تھی۔ وہیں کانچ کی کچھ چوڑیاں بھی بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھ کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میری بیوی مجھ کو تلاش کرنے، بٹیا پر جا رہی ہوگی، جو شیر آ گیا اور اس نے اس کو مار ڈالا۔ غور سے دیکھنے سے گھسیٹن اور خون کے قطرے بھی دکھ گئے۔ میں ان نشانوں پر جنگل میں آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور پر ایک چشمہ نکلتا تھا۔ وہاں سے واپس

آ کر لڑکیوں کو اُٹھایا، اور گھر آ کر آگ جلائی۔ لڑکیوں کو وہیں چھوڑا او وہاں سے بھاگ کر قریب کی دوسری ایسی ہی جھونپڑیوں میں گیا۔ وہاں سے کئی آدمیوں کو لے کر اس جگہ پر پھر واپس آیا۔ اور ان کی مدد سے میں نے اپنی بیوی کی لاش تلاش کرنا شروع کی۔ میری بیوی کی لاش گدیلے میں بہت نیچے ملی جس کو شیر نے کھا لیا تھا۔ اب اس لاش میں سوائے سر، پیر، اور ہاتھوں کے گوشت کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ لیکن ہڈیاں جوڑوں سے ابھی الگ نہیں ہوئی تھیں۔ اور نہ ہی بالکل صاف ہو سکی تھیں۔ جس کے معنی یہ لیے گئے کہ شیر صبح تک یہیں رہا۔ گوشت کھاتا رہا اور چشمہ سے پانی پیتا رہا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے میری بیوی کی پھٹی ہوئی ساڑی میں، جو وہیں پڑی تھی، اس میں بچی کھچی ہڈیوں کو رکھا۔ انہیں لے کر اپنی جھونپڑی پر آیا۔ اور وہیں اپنے کھیت میں اس کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس واقعہ کو آج تین ماہ ہو گئے ہیں۔ اس دن سے آج تک میں نے شراب نہیں پی اور ہر وقت اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں۔ میری اس بُری عادت کی وجہ سے میری بیوی کی جان چلی گئی۔ میں ہی اس کا قاتل ہوں۔ بلکہ صرف اس کا ہی قاتل نہیں اپنی ان دونوں معصوم بچیوں کا بھی قاتل ہوں۔ آج نہیں تو کل یہ بغیر ماں کے ضرور مر جائیں گی۔ بغیر ماں کے ان کا جینا محال ہے۔ لہٰذا میں نے اپنا گھر اور زمین یونہی چھوڑ دی اور وہاں سے بھاگ کر ٹنک پور آ گیا۔ اور اسی دن میری ملاقات خان صاحب کے منشی سے ہو گئی جو لیبر لینے ٹنک پور گئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے رحم کھا کر مجھ کو بھرتی کر لیا۔ لیکن ایک وعدہ بھی کروایا۔ یہ بچیاں کام میں کمی کا سبب نہیں بنیں گی۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن اب یہاں کام تقریباً ختم ہے۔ لہٰذا مجھ کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ آئندہ کون کام دیگا اور کہاں ملے گا۔ میں ان ننھی منّی جانوں کو لیے، کہاں مارا مارا پھروں گا۔ اگر اکیلا ہوتا تو میرے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن یہ بچیاں تو میرے پیروں کی زنجیریں بنی جا رہی ہیں۔

میں نے اپنی جیب سے ڈائری نکالی اور اس کا ایک ورق پھاڑ کر اس کو دیا جس پر اپنا پتہ لکھا تھا۔ پھر خان صاحب، یعنی ٹھیکیدار کے منشی کے رجسٹر میں بھی اپنا پتہ لکھوایا۔ اور اس سے کہا کہ جب تمہارا کام یہاں ختم ہو جائے، تو تم سیدھے میرے گھر آ جانا۔ یہ پتہ سنبھال کر

رکھو، تمہارے کام آئے گا۔ مکان تلاش کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی۔ میں گھر پر بھی تمہارے متعلق سب کو بتا دوں گا تا کہ اگر میں نہ مل سکوں تو تم کو ہمارے گھر میں ٹھہرایا جائے اور کھانا وغیرہ بھی تم کو وہیں سے ملے گا۔ جب میں آجاؤنگا تو تم کو فارم پر بھیج دونگا۔ وہاں تم آرام سے رہنا میرے معقدم پنڈت جی کی بیوی بہت اچھی عورت ہے۔ وہ تمہاری بچیوں کی دیکھ بھال اپنی بچیوں کے ساتھ کرے گی۔ تم ان بچیوں کی سے طرف آزاد ہو جاؤ گے۔ فارم پر مجھ کو ایمان دار اور محنتی آدمیوں کی بہت ضرورت رہتی ہے۔ تم کو میں نے اتنی دیر میں خوب سمجھ لیا ہے۔ تم میرے اندازے کے مطابق بہت کام کے آدمی ہو۔ میں فارم وغیرہ کے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔ تم کو کھیتی کا تجربہ بھی ہے، ایماندار ہو، اور تمہاری محنت میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ تم میرے فارم کے لیے بہت مفید آدمی ثابت ہو گے۔ تمہاری تنخواہ دوسروں کی تنخواہ کے برابر ہوگی اور بچیوں کے دودھ کے لیے دس روپیہ مہینہ الگ سے ملے گا۔

اگر تم مناسب سمجھنا، تو یہاں کام ختم ہوتے ہی فوراً چلے آنا اگر اس سے اچھی نوکری اور اس سے زیادہ تنخواہ تم کو کہیں اور ملے تو اس پتہ پر مجھ کو اطلاع ضرور کر دینا۔ خط میں اپنا پتہ لکھنا نہ بھولنا۔

وہ میری ان باتوں کو سُن کر آب دیدہ ہو گیا۔ اور اپنے ہاتھ میرے پاؤں چومنے کے لے بڑھائے۔ میں نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیے اور ان کو ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ گرم جوشی سے۔ خلوص سے اور انسانی ہمدردی سے۔

میں اس پر کوئی احسان نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ سودا ہو رہا تھا۔ اس کی قیمت لگائی جا رہی تھی جو اس کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے بہت کم تھی۔ لیکن پہاڑ کی یہ معصوم مخلوق یہ بات کہاں سمجھ سکتی تھی۔

جب میں کیمپ واپس آیا تو سراج چچا اور راجہ صاحب کو یہ قصہ سنایا۔ سراج چچا کی بھی بالکل یہی رائے تھی جو میں نے اوپر لکھی۔ ان کی سمجھ میں، میں نے منافع کا سودا کیا تھا۔ ”چیز زیادہ قیمتی تھی کم قیمت پر خریدلی۔“

سُرئی کا وہ دن، جس دن میری ملاقات اس پہاڑی لیبر سے ہوئی تھی اور جو بعد میں

جوشی جی کے نام سے پکارا جائے گا، وہ ایک تاریخی دن تھا۔ اس دن کئی دلوں میں اس شیر کو مارنے کا پکا ارادہ کیا گیا۔ اب شیر کا ڈاؤن فال شروع ہو چکا تھا۔ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا، اس شیر کی زندگی کم ہوتی جاتی تھی۔ حالانکہ اس واقع کے کئی سال بعد تک یہ شیر زندہ رہا۔ اس درمیان میں شیر کی تباہ کاریوں کے کئی قصے لوگوں سے سنے۔ اکثر ٹنک پور بھی جانا ہوتا رہا۔ وہاں کے لوگوں اور جنگلات کے افسروں سے کرید کرید کر اس شیر کے متعلق معلومات کی جاتی رہی۔ جوشی جی نے ہم لوگوں کے دلوں میں ایک چنگاری رکھ دی تھی جو اب شعلہ بنتی جا رہی تھی۔ ہم لوگوں نے سامان سفر باندھنا شروع کیا۔ اور پارٹی کو چھوٹا کر کے صرف چار آدمیوں پر مشتمل کیا۔ اس میں راجہ صاحب، سراج چچا، میں خود اور فادر اِن لا بھی تھے۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے، پنا گری کا راستہ ٹوٹ چکا تھا، اور تیس پینتیس میل سفر کر کے کالا ڈونگا پہنچنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے بہت کم شکاری کالا ڈونگا جانے کی ہمّت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت میں دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا، جب سراج چچا جو کافی عمر رسیدہ ہو چکے تھے، سب سے پہلے چلنے پر رضا مند ہو گئے۔ دوسرے فادر اِن لا، جو اپنے موٹاپے کی وجہ سے شہر میں بھی بگھی بغیر سواری نہیں ہلے۔ وہ بھی اس شکار میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ ہر بات میں مین میخ نکالتے اور رائے دیتے اور پھر مسترد کرتے۔

میں نے چپکے سے راجہ صاحب سے کہا، دیکھئے راجہ صاحب، یہ حضرت اس سفر میں کتنی دلچسپی لے رہے ہیں، کیسے کیسے مشورے دے رہے ہیں، جیسے یہ ہمیشہ سے پہاڑوں میں ٹریکنگ کرتے چلے آئے ہوں۔ سامان میں کمی اعتراضات اور بندشیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گول ہو جائیں گے اور ہم لوگ پھنس جائیں گے۔ ٹنک پور میں جو آدمی ہمارا سامان لے جانے والے تھے، وہ خاص دن کے علاوہ کسی اور دن کو رُک نہیں سکتے تھے۔ وہاں لیبر کے آدمی ملنا ناممکن ہے، جو سامان ڈھو کر کالا ڈونگا لے جا سکیں۔ کیونکہ لڑائی کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہوتی رہتی ہے اور وہاں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اس علاقہ میں سوائے عورتوں کے دور دور تک مرد دیکھنے میں نہیں آتے۔

لیکن ایسا ہُوا نہیں۔ فادر اِن لا مقررہ دن پارٹی کے ساتھ ٹنک پور پہنچے۔ ایک رات

وہاں قیام کیا۔ صبح کوتڑکے کالا ڈونگا کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ لمبا راستہ کیسے کٹا، فادر ان لا پر کیا بیتی، کیا کیا تماشے ہوئے، یہ ایک الگ قصہ ہے۔ ویسے بھی یہ قصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے، اس میں کچھ ایسے واقعات کا بھی ذکر آ گیا جو ممکن ہے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہوں۔ لیکن ان کا ذکر کرنا ناگزیر تھا۔ ورنہ آپ لوگ اس شیر کو اہمیت نہ دیتے۔ حالانکہ حکومت نیپال نے اس شیر کو مارنے کا پانچ ہزار روپے کا انعام رکھا تھا، اور ہندستان کی حکومت نے پانچ سو کا۔ یہ شیر تقریباً سو، سوا سو آدمی ہندستان میں اور اس کی دوگنی تین گنی تعداد میں نیپال میں مار چکا تھا۔ یہ شیر تقریباً چھ سات سال سے ہندستان اور نیپال میں آدم خوری کرتا رہا تھا، اس وجہ سے انتہائی چالاک اور نڈر ہو گیا تھا۔ اور اس کی ہیبت بھی بہت لمبی تھی۔ تب ہی تو مہینہ کے ایک خاص دن، پورن ماشی کے روز، دریا پار کر کے نیپال سے پونا گری کے علاقہ میں آتا اور ایک آدمی مار کر چلا جاتا۔ کہاں چلا جاتا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ نیپال کب پہنچا، یہ بھی طے نہ ہو سکا۔ اس کا نیپال سے ایک خاص دن آنا ثابت تھا۔ کیونکہ یہ دریا کو ایک خاص جگہ سے پار کرتا تھا۔ دریا پار کر کے یہ ریت پر لوٹتا اور پھر اپنے جسم کو ریت اور پانی سے صاف کرنے کے لیے جھٹکتا تھا۔ وہاں پر بہت سے چٹانیں ایسی ملیں جن پر ریت کے ذرّے چپکے ہوئے تھے۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا، لیکن راجہ صاحب نے اس کی لوٹن اور پنجوں کے نشان دیکھ کر یہ بات بتائی کہ چٹانوں پر ریت کے ذرّوں کے جو نشان لگے ہوئے ہیں وہ شیر نے جھٹک کر اپنے جسم سے الگ کئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ شیر کے پنجہ کی ایک انگلی کا ناخون ٹوٹا ہوا ہے۔ ہم لوگوں نے جو غور کیا تو راجہ صاحب کی بات کی تصدیق ہوئی۔

بہ ہزار خرابی شام کو کوٹھی پہنچے۔ کوٹھی کے تالے بند ملے۔ نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ فارسٹ کا اسٹاف شام ہوتے ہی کوٹھی چھوڑ کر قریب کے گاؤں چلا جاتا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم کس گاؤں جاتا تھا۔ ٹھاٹھ وہاں سے چار میل دور۔ اور چوگا تقریباً دو تین میل دور۔ کوئی ملازم اکیلا جانے پر رضامند نہیں اور ہم لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ دو قدم بھی اور چل سکیں۔ برآمدہ کے فرش پر ویسے ہی کپڑے پہنے پہنے لیٹ گئے۔ بھوک اور چائے کی خواہش شدید تھی۔ سامان سب بندھا ہوا تھا۔ ابھی یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ٹھاٹھ چلا جائے یا یہیں رہا جائے۔ کوٹھی

بند ہے۔ رہا کہاں جائے۔ فادر اِن لا کوٹھی میں رُکنے پر بالکل تیار نہیں تھے۔ سراج چچا اور رلجہ صاحب یہاں سے ایک قدم آگے بڑھانے کو تیار نہیں۔ میں کبھی ایک کا منہ دیکھوں، کبھی دوسرے کا۔ آخر جھنجھلا کر میں نے نوکر سے کہا۔ چائے کے سامان والا بنڈل کھولو اور چائے بناؤ۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

مارچ کا مہینہ تھا اور اب سردی بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ سبھی پریشان تھے۔ کیا کریں یہ طے ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے ملازموں سے کہا کہ تم لوگ آگ جلاؤ اور اپنا کھانا تیار کرو۔ اگر یہاں سے چلا جائے تو کھانا کھا کر چلا جائے۔ اب بھوکے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ وہ بولے، صاحب آپ یہیں رُکیں، بےفکر ہو کر برآمدہ میں سو جائیں۔ کچھ نہیں ہو گا۔ ہم لوگ رات بھر آگ جلاتے رہیں گے۔ یہ کہتے ہی فادر اِن لا خفا ہو گئے۔ بولے کیا میں ڈرتا ہوں۔ مجھ کو ہی ڈر لگ رہا ہے۔ اور سب تیس مار خاں ہیں۔ سراج چچا نے بہت روکھا سا منہ بنا کر کہا۔ سب سے زیادہ خطرہ تم کو اور رلجہ کو ہی تو ہے۔ میں نے سنا ہے شیر گلّے میں سب سے زیادہ موٹی اور تندرست گائے یا بھینس کو ہی مارتا ہے۔ اور اس گلّے میں تم ہی دونوں بہت موٹے اور چکنے ہو۔ مجھ کو کیا خطرہ۔ ایک تو بوڑھا، دوسرے ہڈی اور چمڑہ۔ رہا یہ لڑکا، یہ بھی بہت دُبلا پتلا ہے۔ موٹے تازے تو تم لوگ ہی ہو۔ اگر تم ڈرو تو بجا ہے۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ فادر ان لا کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولا ہو گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ نوکروں سے بہت سخت آواز میں بولے، کھولو سامان۔ کھولو۔ میں یہیں رہونگا اور کنارے پر لیٹوں گا سراج چچا کو بیچ میں لٹایا جائے۔ ان کو ڈر لگتا ہو گا، مجھ کو نہیں۔

سامان کھولا جانے لگا۔ اور سب برآمدے میں قرینے سے رکھا گیا، ہم سب دیکھتے رہے۔ مہتمم صاحب ہر ایک چیز کو اپنی سمجھ سے مناسب جگہ پر رکھواتے رہے۔ ہم لوگ برآمدہ کے فرش پر اپنے پاؤں کو سینے سے لگائے دیکھتے رہے۔ آخر میں لوٹوں، گلاسوں اور جگوں کا نمبر آیا۔ وہ برآمدہ کے دروں میں جیسے پھولوں کے گملے سجائے جاتے ہیں، رکھے گئے اور پھر تیا سُسر کو رسّی کی تلاش ہوئی۔ ہم لوگ حیران۔ ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ لیکن بولتے بالکل نہیں تھے۔ اپنی اپنی عقلوں کو ٹٹولتے کہ یا الٰہی اس وقت رسّی کا کیا ہو گا۔ کہیں ایسا تو

نہیں کہ یہ حضرت ہم کو رات میں باندھنے کی فکر میں ہوں۔ کیونکہ شیر اگر رات میں ہم کو توڑ ڈالے تو بندھے ہونے کی وجہ سے لے جانہ سکے، اور یہ لاش کو ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ خیر، ایک بنڈل میں رسّی مل گئی، جو مچان باندھنے کے لیے لائی گئی تھی۔ نوکروں کی مدد سے رسّی کے لچھے کھولے گئے۔ اور جب وہ کھل گئی تو اس کے ایک سرے کو برآمدے کے اخیر میں باندھا گیا۔ اور پھر ہر کھمبے میں بل دے کر آخری کھمبے تک یہ عمل دوبارہ اور سہ بارہ دُہرایا گیا۔ اس طرح ایک طرف کا برآمدہ جس طرف گلاس رکھے گئے تھے، وہ رسّی کی فین سنگ سے بند ہو گیا۔ اب سراج چچا سے رہا نہیں گیا۔ اور وہ پوچھ ہی بیٹھے، یہ رسّی کا جال کیوں بنایا جا رہا ہے۔ اس کے نیچے یہ گلاس وغیرہ کیوں رکھے گئے ہیں۔ بہت ہی چیں بجبیں ہو کر بولے، کیا یہ بہت معمولی سی بات آپ کی عقل میں نہیں آرہی ہے کہ اگر شیر آئے اور برآمدہ میں چڑھنا چاہے تو لوٹے کٹورے اور رسی اس کے آنے کی خبر ہم کو دے دیں۔ سراج چچا بہت شگفتگی کے ساتھ بولے۔ ہاں اگر تم رسّی کا ایک سرا اپنے پیر میں باندھ لو تو تم کو اس کے آنے کی خبر ضرور ہو جائے گی۔ ہم لوگ بے خبری میں کھایا جانا پسند کرتے ہیں۔ راجہ تمہارا کیا خیال ہے۔ راجہ صاحب پر، سراج چچا کی یہ بات سُن کر ہنسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں ساری بات آچکی تھی۔ بولے سراج چچا ان سے کہہ دیجیے، کنارے پر میں لیٹوں گا۔ یہ پریشان نہ ہوں۔ خیر جیسے تیسے رات کٹ گئی۔ صبح کو کوٹھی کا چوکیدار اور جنگل کا اسٹاف بھی آ گیا۔ کوٹھی کھولی گئی۔ فارسٹ گارڈ کا انٹرویو لیا گیا۔ اسی نے بتایا کہ جب وہ گاؤں سے یہاں آرہا تھا تو اس نے کوٹھی کے پاس نیچے سڑک پر شیر کے تازہ پنجوں کے نشان دیکھے ہیں، جو گدیلے کی طرف جارہے ہیں۔ یہ گدیلہ کوٹھی سے تقریباً تین چار سو گز ہٹ کر نیچے کو بہتا تھا۔ (گدیلہ پہاڑی نالے کا کہتے ہیں) کچھ گدیلے صرف برسات میں بہتے ہیں۔ ان میں نہایت شفاف اور میٹھا پانی رہتا ہے۔ یہ پانی کہاں سے آتا ہے، یہ دوسرا موضوع ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

چوکیدار کی یہ بات سنتے ہی ہم لوگوں نے صاف محسوس کیا کہ ہمارے فادر اِن لا کے چہرے پر ایک سیاہ بادل کا سایا سا آیا جو فوراً گزر بھی گیا۔ سراج چچا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ راجہ صاحب نے ان کا منہ دبوچ کر بند کر دیا اور کہا۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں

کہ باہر کتنے لوگ کھڑے ہیں۔ اب اُن کے سامنے کیوں منظر کشی کرنا چاہتے ہیں۔

فارسٹ گارڈ کی زبانی، شیر کے پنجوں کی بابت سُن کر ایک عجیب سی ہیجان کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میرے دل میں جو سب سے پہلا خیال پیدا ہوا، وہ تھا کہ ہماری اتنی شدید مشقت، برباد نہیں ہوئی۔ ایک خوشی کی کرن جو امید سے گندھی ہوئی تھی، دل میں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہی اُمید کی کرن ہے جو آدمی کو کامیاب کرتی ہے۔ اگر یہ اُمید نہ ہو تو کوئی بڑا نہیں بن سکتا۔ اور سچ مچ یہ بھی ایک بہت بڑا کام تھا، اس شیر کو مارنا۔

ہم سب نے فرداً فرداً چوکیدار پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ آخر سب اس نتیجے پر پہنچے کہ شیر یہیں کہیں جھاڑیوں میں پڑا سو رہا ہے۔ جنگل کے عملہ نے قریب کی کئی ایسی جگہوں کا، جہاں شیر رُک سکتا تھا، نشان دہی کی۔ اور وہاں پڑا باندھنے کی رائے دی۔

اب سوال تھا، پڑوں کی خریداری کا۔ پہاڑوں میں بھینس نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اور کوئی آدمی یہ جان کر کہ پڑا شیر کو کھلایا جائے گا، اپنی گائے بھینس کے پڑوں کو فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔

جوشی جی، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ ساتھ تھے۔ انہیں الگ لے جا کر ان کو پڑوں کی خریداری پر راضی کیا گیا۔ اس معاملہ میں وہ بھی کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کی بیوی کی موت اور پڑے کی زندگی کا موازنہ کیا گیا، اور انسانی زندگی کی قیمت کا پڑے سے مقابلہ کیا گیا تو وہ راضی ہو گئے۔ اور روپیہ لے کر اپنے گاؤں اور اس کے قرب و جوار کی جھونپڑیوں میں پڑا تلاش کرنے کے لیے روانہ ہوگئے اور جلدی واپس لوٹنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے تین پارٹیاں بنائیں اور فارسٹ کے آدمیوں کی رہبری میں اس علاقہ کا جغرافیہ سمجھنے کے لے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت راجہ صاحب کا حکم صادر ہوا کہ دوپہر تک سب لوگ کوٹھی واپس آجائیں گے۔ اور فائر بالکل نہیں کریں گے۔ چاہے کتنے ہی مُرغ یا کلیج دیکھیں، یا جانور بالکل رائفل کی نال سے آکر ٹکرا جائیں۔ بندوق کی آواز نہیں کی جائے گی۔ بات معقول تھی، مان لی گئی۔

میرے ساتھ جو فارسٹ گارڈ تھا، اس کا جنگل کا سینس بہت اچھا تھا۔ وہ مجھ کو

چوٹیوں، گدیلوں، نالوں اور ریخوں پر لے گیا اور ایسی ایسی چٹانوں پر چڑھوایا کہ اللہ یاد آ گیا، لیکن میں کہیں بھی چلنے میں اس سے کم نہیں رہا۔ کیونکہ ایک تو میں اسپورٹس مین۔ ہاکی، فٹ بال اور ٹینس کا کھلاڑی، دوسرے چھریرے بدن کا آدمی اور بہت اسٹرانگ فوٹیڈ، جس میں لوچ اور تیزی حد درجہ اور بہت کافی۔ اسٹیمنا بھی اچھا۔ لہٰذا ان جگہوں پر چلنا میرے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ ہر مشکل جگہ سے بہت آسانی سے نکل گیا۔

لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ فادر اِن لا اور راجہ صاحب پر کیا گزرے گی۔ غرض ہم بارہ پندرہ میل کا ایک چکر لگا کر واپس ایک بجے کوٹھی پہنچے۔ ابھی دوسری پارٹی واپس نہیں آئی تھی۔ سراج چچا نے ہم کو دیکھتے ہی خانساماں سے کافی بنانے کو کہا۔ ہم برآمدہ میں پڑی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ سراج چچا بولے، ذرا دم لے لو۔ پھر پانی پینا۔

میں نے کہا، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آپ خوب جانتے ہیں، میں ہر سال گرمیاں پہاڑ پر گزارتا ہوں۔ وہاں شکار بھی کھیلتا ہوں۔ چلنا میرے لیے ایک شغل ہے۔ یہ بیچارہ فارسٹ گارڈ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا، لہٰذا اس نے پوری کوشش کی کہ میں کہیں چیں بول جاؤں۔ اس سے آپ خود پوچھیئے کہ اس کا اس وقت کیا حال ہے۔ ہم لوگوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خانساں کافی لے کر آ گیا۔ میں نے اس فارسٹ گارڈ کو بلوالیا جو میرے ساتھ گیا تھا، وہ بھی آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ راجو، اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور کافی پیو۔ کچھ ناشتہ کر لو۔ کیونکہ تم کو آج میری وجہ سے پریشانی اٹھانا پڑی ہے۔

وہ ہنس کر بولا۔ میں آج تک ان کھڈوں اور چٹانوں پر نہیں گیا تھا، جہاں آپ کو لے کر جانا پڑا۔ پھر سراج چچا کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ صاحب ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ان جگہوں سے تو ہم پہاڑی ہی گزر سکتے ہیں لیکن یہ صاحب تو پہاڑیوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کا یہ ریمارک سراج چچا کی زبان بند کرنے کے لیے کافی تھا۔ ورنہ فادر اِن لا کے آنے تک سراج چچا کے ہاتھوں میری حجامت بنتی رہتی۔ سراج چچا کچھ ایسے ہی آدمی تھے۔

میرے آنے کے آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ کے بعد راجہ صاحب اور فادر اِن لا کی سواری تشریف لائی۔ دونوں کے چہرے سرخ۔ پیشانی پر پسینہ کے موٹے موٹے قطرے چمکتے

ہوئے۔ سانس پھولی ہوئی، قدم بے قابو۔ کرسیوں پر بُری طرح گر کر ہانپنے لگے۔ فادر اِن لا نے بڑی کوشش کے بعد کئی قسطوں میں رُک رُک بولنا شروع کیا۔ لیکن حلق خشک ہونے کی وجہ سے آخری لفظ حلق میں ہی اٹک جاتا اور وہ جب نکلتا تو بہت کھینچ کر۔

اب ہم اور سراج چچا بے چین کہ ان کے پیٹ میں سانس آئے تو ان کی روداد سنی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ یہ دونوں ایک ساتھ کیسے واپس ہوئے، جب کہ دونوں یہاں سے تو الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوئے تھے۔

غرض یہ کہ سراج چچا اور ان دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ فادر اِن لا اپنے پیروں میں لگی جونکوں کو نچواتے رہے۔ اور اپنے زخموں پر پان کی پیکیں تھوکتے رہے۔ لیکن نہ بولنا تھا، نہ بولے۔ آخرنا یک کلوز ہو گیا۔

ابھی آدھا دن پڑا تھا۔ لیکن کوئی شخص اپنے پلنگ کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ میں اکیلا کیا کرتا۔ کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں جاتا، کبھی کمپاؤنڈ کا چکر لگاتا۔ اب انتظار تھا جوشی کا جو پڈے لینے گیا تھا۔ وہ بھی اس روز شام تک نہیں آیا۔ ہم لوگ وقت گزاری کے لیے تاش وغیرہ کھیلتے رہے۔ آخر نیند نے ہم کو آدبوچا۔ نوکروں نے جلتی ہوئی لال ٹین اپنے کوارٹر کے باہر رکھ دی تھی، اور خود کنڈی لگا کر کمرے میں سو رہے۔ رات میں نہ جانے کس وقت ایک بھالو کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس نے وہاں جلتی ہوئی لال ٹین دیکھی۔ شاید اس کو کھانے کی مہک نے باورچی خانہ کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ شاید اس نے لال ٹین کو ہاتھ میں اُٹھایا، اور شاید اس کا ہاتھ لال ٹین کے شیشہ پر لگا، جو گرم تھا، یا لال ٹین کو دیکھتے ہی ہاتھ مار کر گرا دیا۔ لال ٹین کے گرنے سے اس کا تیل بہنے لگا اور اس میں آگ لگ گئی۔ بھالو خائف ہو کر چیختا ہُوا بھاگا۔ نوکروں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بھالو کی چیخ کو شاید شیر کی آواز سمجھے اور کمرے کے اندر چیخنے لگے۔ میرا کمرہ دوسرے ونگ میں تھا، لہٰذا مجھے تو نوکروں کا چیخنا، چلاّنا سنائی نہ دیا۔ لیکن سراج چچا اور فادر اِن لا کا کمرہ اسی سائڈ میں ہونے کی وجہ ان کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن نوکروں کی چیخ پکار سے انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید شیر نوکروں کے کمرہ میں گھس گیا ہے اور کسی نوکر کو پکڑ لیا ہے۔ ان کے اکیلے کی ہمّت بھی نہیں تھی کہ وہ باہر نکل کر دیکھتے۔ لہٰذا

انہوں نے بھی راجہ کا نام لے کر چیخنا شروع کر دیا۔ پہلے میری آنکھ کھلی۔ اب میں نے جلدی سے راجہ صاحب کو جھنجھوڑا۔ راجہ صاحب نے مجھ کو بہت کرخت آواز میں ڈانٹا اور کمبل کو سر کے نیچے کَس کر دبا لیا۔ میں نے ان کے سر کے نیچے سے کمبل کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر دور پھینک دیا اور پانچ سیل کی ٹارچ کی روشنی ان کی آنکھوں پر ڈالی۔ راجہ صاحب اب جاگ تو گئے ہی تھے۔ مجھ سے بولے ٹارچ ہٹاؤ، اور یہ لوگ کیوں چیخ رہے ہیں۔ میں نے کہا مجھ کو بھی نہیں معلوم۔ میری آنکھ بھی ان کے چیخنے ہی سے کھلی ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بھی جگا دیا جائے۔ چلیے دیکھتے ہیں معاملہ کیا ہے۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا، برآمدہ میں آ کر ٹارچ کی روشنی سب سے پہلے دوسرے بیڈ روم کے دروازے پر ڈالی۔ دروازہ بند تھا۔ پھر احاطہ میں ڈالی۔ اب ہم کوٹھی کے اس حصہ میں تھے جہاں نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ان کوارٹروں پر ٹارچ ڈالنے سے پتہ چلا کہ ان کے کواڑ بھی بند ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ پھر چیخے کیوں ہیں۔ راجہ صاحب نے فادر ان لا کے کمرہ کا دروازہ تھپ تھپایا۔ اندر کی چیخیں بند ہو گئیں۔ ٹارچ کی روشنی نوکروں کے دروازے پر پڑنے سے ان کی بھی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ہم لوگ بڑھ کر نوکروں کے دروازے پر پہنچے اور ان کو آواز دی۔ ہماری آواز سُن کر نوکروں نے دروازہ کھولا اور سب سے پہلے فادر ان لا کا چہیتا نوکر وزیر حسن باہر آیا۔ باچھوں سے پیپ بہتی ہوئی۔ چہرہ وحشت زدہ۔ منہ کھُلا ہوا "لالا میاں" کہہ کر فادر ان لا سے چپٹ گیا۔ ان سے چپٹا کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم لوگ اس کو چھوڑ کر دوسرے نوکروں کی طرف متوجہ ہوئے جو سب منہ پھاڑے ٹکر ٹکر ہم کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کے منہ سے کوئی آواز، کوشش کے باوجود نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے ایک ملازم سے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ کیا تمہاری والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا تھا، جو تم اتنی چیخ پکار مچا رہے تھے۔ وہ بولا شیر آ گیا تھا۔ اور ہمارے کوارٹر کا دروازہ توڑ رہا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ کیا بولتا۔

واقعی یہ لوگ نہتے کیا کر سکتے تھے۔ جو لوگ شیر کو مارنے آئے تھے وہ بھی بڑی بڑی ہیوی بور کی بھری ہوئی رائفلیں بستر پر رکھے ہوئے چیخ رہے تھے۔ میں خاموشی سے منہ لٹکائے گھوما اور اپنے کمرہ کی طرف چل دیا۔ کافی دیر کے بعد باقی لوگ بھی آ گئے۔ وہاں کیا ہُوا مجھ کو

نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے کسی سے پوچھا۔ کیونکہ فادر اِن لا ڈرے نہیں تھے، سراج چچا ڈرے نہیں تھے، اور کیا میں نہیں ڈر گیا تھا؟ شیر وہ بھی کالا ڈونگا کا آدم خور۔ کیا وہ ڈرنے کی چیز نہیں تھا۔

صبح ناشتہ کی میز کے گرد صرف ہم ہی لوگ نہ تھے بلکہ تین ملازم بھی کھانے کے کمرہ میں منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ وزیر حسن، فادر اِن لا سے کہہ رہے تھے "لالا میاں، میرے بچے چھوٹے ہیں، یتیم ہو جائیں گے۔ وہ کیسے پلیں گے۔ میری رائے میں اس شکار کو ختم کیجئے۔ اس منحوس کوٹھی کو چھوڑ دیجئے۔ یہ جگہ بڑی منحوس ہے۔ یہ شیر بھی بہت خطرناک ہے۔ آپ اس کھیل میں مت شریک ہوں۔" میں نے اپنے غصّے کو بہت ضبط کرتے ہوئے، تلخ آواز میں پوچھا، دوسرے نوکروں کی کیا رائے ہے۔ سب ہم آواز ہو کر بولے، رات بچ گئے، کیا یہ ضروری ہے کہ آج رات نہیں مارے جائیں گے۔ میں نے کہا اچھا جو جو جانا چاہتا ہے، وہ اپنا سامان باندھ کر گھر کی راہ پکڑے۔ سب ایک زبان ہو کر بولے، کیا اکیلے؟ کیا آپ لوگ نہیں چلیں گے؟ میں نے کہا۔ ہم ضرور جائیں گے لیکن شیر مارنے کے بعد۔ اگر تم لوگ جانا چاہتے ہو۔ چلے جاؤ۔ یہ سنتے ہی۔ سب کے منہ لٹک گئے۔ بسورتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

یہ بات سُن کر فادر اِن لا بڑے جز بز ہو کر بولے، اگر یہ لوگ چلے گئے تو کھانا کون بنائے گا۔ چائے کون بنائے گا۔ میں نے جل کر کہا۔ کھانا تم بنانا۔ راجہ صاحب چائے بنا دیں گے۔ اگر تم رُکنا نہیں چاہتے تو تم بھی اپنا سامان باندھ لو اور نوکروں کے ساتھ چلتے بنو۔

یہ سنتے ہی، ٹوسٹ جس کو وہ چبا رہے تھے، ان کے حلق میں پھنس گیا، آنکھیں چڑھ گئیں اور چھری، جس سے وہ ٹوسٹ پر مکھن لگا رہے تھے، اس کے دستہ پر ان کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔

میں نے کرسی سے اٹھنے میں بہت تیزی دکھائی اور جب تک ان کے ہاتھ سے چھری میری طرف آئے، میں کمرے سے نکل کر برآمدہ کو دتا ہوا، ان کی چھری کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔ راجہ صاحب اور سراج چچا ان کو دبوچنے کی کوشش کر رہے تھے، اور میں لان میں کھڑا

بلسی سے دُہرا ہورہا تھا۔

جوشی کو آج پڑے لے کر واپس آنا تھا، لیکن اُن کی واپسی شام سے پہلے ممکن نہ تھی۔ اگر جوشی شام کو آتے، اس وقت اس علاقے میں پڑوں کا باندھنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے راجہ صاحب سے کہا، کل میں اور آپ دونوں اس علاقہ میں گھوم بھی آئے ہیں اور بہت سے جگہیں بھی دیکھ لی ہیں، جہاں پڑے باندھنا مناسب ہوگا۔ اس وقت فارسٹ کے آدمی بھی موجود ہیں۔ ان سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔ میری یہ بات فادر ان لا اور راجہ صاحب کی سمجھ میں آگئی۔ اور وہ تناؤ جو صبح ناشتہ کی میز پر ہوگیا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا۔ ہم سب برآمدہ میں آکر بیٹھ گئے۔ وہیں فارسٹ گارڈس کو بھی بلالیا۔ جو فارسٹ گارڈ جو میرے ساتھ گیا تھا، اس کا خیال تھا کہ جس علاقہ میں کل ہم لوگ گئے تھے، وہاں کوئی ایسی مناسب جگہ نہیں تھی جہاں پڑا باندھا جا سکے۔ کیونکہ وہ پہاڑی سلسلہ ٹنک پور سے آنے والی سائڈ کی طرف پڑتا ہے۔ اس پر چٹانیں زیادہ بکھری ہوئی ہیں اور پہاڑی کی دوسری سمت دریا ہے جس کی طرف سے کسی جانور کا آنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرف کی پہاڑیاں ڈھلواں ہیں۔ بلکہ بعض تو دیوار کی طرح سیدھی کھڑی ہیں اور جنگل بھی زیادہ گھنا نہیں ہے۔ انڈر گروتھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہاں اس طرح کانکڑ اور گُوھل ضرور ملتے ہیں۔

میری رائے تھی کہ اگر شیر اس علاقہ میں موجود ہے تو وہ شکار کرنے ان پہاڑیوں پر ضرور جائے گا۔ اگر اس کو وہاں پڑا دکھائی دے گیا تو اس کو مارنے سے نہیں چوکے گا۔ اگر اس نے پڑا ماردیا تو اس کو کھائے گا بھی۔ بات معقول تھی۔ لیکن راجہ صاحب نے اس کو سرے سے کاٹ دیا۔ جب میں نے بہت زور دیا۔ تو بولے ارے بیوقوف۔ اگر پڑا وہاں کل ہوگیا تو میں اور تمہارے فادر ان لا وہاں پہنچیں گے کیسے؟ بات معقول تھی۔ فادر ان لا تو واقعی اس طرف نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور راجہ صاحب کو بھی اپنی جسامت کے لحاظ سے پسینے آجاتے۔ اور رات میں صرف ٹارچ کی روشنی کی مدد سے اُن کا وہاں سے واپس آنا بھی ناممکن تھا۔

میں ان کی بات سمجھ گیا۔ میں نے کہا، آپ سب کو اس طرف جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں فارسٹ گارڈ کو ساتھ لے جا کر وہاں پڑا باندھ دونگا اور اسی وقت وہاں

مچان پر بیٹھ جاؤں گا۔ فارسٹ گارڈ درخت پر بیٹھ جائے گا۔

یہ بات سن کر راجہ صاحب بہت چیں بجبیں ہو کر بولے، پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جوشی کتنے پڑے لاتا ہے۔ میں جس طرف کل گیا تھا، اس طرف میں دو پڑے باندھوں گا۔ وہ جگہ شیر کے پڑا دینے کے لیے بہت عمدہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس شکار میں آپ مچان پر نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ صرف دو مچان ساتھ میں لائے گئے ہیں۔ جن پر میں اور تمہارے فادر اِن لا بیٹھیں گے۔ آپ اس شکار میں صرف ایک منتظم کی حیثیت سے حصہ لیں گے۔ جس کا کام صرف مچان بندھوانا، پڑے بندھوانا اور اگر پڑے مارے نہ جائیں تو ان کو چارا پانی دلوانا، ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس اس کام کے لیے کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔

یہ سنتے ہی میرے تلووں سے لگی اور سَر سے نکل گئی۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ بیان سے باہر۔ میں منہ کھول کر راجہ صاحب کو کچھ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن مارے ہکلاہٹ کے میرے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ میں برآمدے سے اُٹھ کر چل دیا۔ مجھے یہ یاد نہیں۔ کہ میں کمرے کی طرف گیا، یا نوکروں کے کوارٹر کی طرف۔ چند منٹ تک میں واقعی اپنے ہوش میں نہیں رہا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ راجہ صاحب کی اس بات کو سُن کر سراج چچا اور فادر اِن لا کے منہ بھی کھلے کے کھلے رہ گئے۔ محفل برخاست ہوگئی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر پلنگوں پر دراز ہوگئے۔ صرف سراج چچا برآمدہ میں بیٹھے رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ بھی خاموش رہے، میں بھی کچھ نہیں بولا۔ صرف خالی نظروں سے دور پہاڑیوں کو گھورتا رہا معلوم نہیں۔ کچھ نظر بھی آرہا تھا یا نہیں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے دوپہر ہوگئی۔

ملازم نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ میں بیٹھا ہی رہا۔ سراج چچا کمرے میں گئے۔ راجہ صاحب سے سرگوشیوں میں کچھ بات چیت ہوتی رہی۔ تھوڑی دیر میں راجہ صاحب سراج چچا کے ساتھ کمرے سے باہر برآمدے میں آئے۔ میں نے ان کو دیکھ کر کمرے میں جانا چاہا، ویسے ہی راجہ صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر اور مجھ کو سینے سے لگا کر میری پیٹھ تھپکنے لگے۔

شاید میرے آنسو نکل آئے تھے۔ میرے غم اور غصہ کی وہ حالت ایک دم تبدیل ہو گئی۔ میں راجہ صاحب سے الگ ہوا۔ فادر اِن لا بھی کمرہ سے نکل کر کھانے کی میز پر آگئے۔

کھانا کھاتے وقت کوئی کچھ نہ بولا۔ صرف سراج چچا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں تو تم کو بڑا اسپورٹ مین سمجھتا تھا، تم تو بڑے سنٹی مینٹل آدمی ہو۔

میں کچھ نہیں بولا۔ وہ پھر بولے، تم شاید اپنے شکار کرنے اور بندوق چلانے کی کمزوری کو نہیں سمجھ سکے ہو۔ میں نے اور راجہ صاحب نے اس سلسلے میں اکثر تبادلہ خیال کیا ہے جو شاید تم کو کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ تم بندوق بہت تیز چلاتے ہو۔ جانور کو دیکھتے ہی فائر کر دیتے ہو۔ یہاں تک کہ شیر پر بھی تمہارے فائر کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ یہ طریقہ انتہائی غلط اور خطرناک ہے۔ تم اگر راجہ صاحب کے علاوہ کسی اور کے ساتھ شکار کھیلتے ہوتے تو تم کو پتہ چلتا کہ تمہاری یہ خراب عادت کتنی مشکلیں پیدا کر چکی ہے۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ لیکن بہت توجہ سے اُن کی باتیں بھی جو وہ میرے لیے کہہ رہے تھے، سنتا رہا۔ سراج چچا کی باتیں سمجھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اب میں نے سراج چچا سے کہا۔ آپ شاید اس وقت میری کمزوری نکال کر مجھ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں شکار کھیلنے کے لائق نہیں ہوں۔ آپ لوگ مجھ پر رحم کھا کر اب تک اپنے ساتھ شکار میں رکھے ہوئے ہیں۔

وہ بولے بات کچھ ایسی ہی ہے۔ لیکن بالکل ایسی بھی نہیں، جیسا تم نتیجہ نکال رہے ہو۔ اس شکار کے حالات دوسرے شکار سے بالکل مختلف ہیں۔ شاید تمہارا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ میدانی شکاروں میں ہم لوگ شکار یہ سواری سے کرتے ہیں۔ وہاں شیر بھی دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اور ان کے ملنے کی جگہوں میں بھی یہاں کی جگہوں کے مقابلہ میں بہت فرق ہے۔ سب سے بڑی بات اور سب سے بڑا فرق جو اس بلاک کا دوسرے بلاکوں سے ہے، اول تو یہ کہ یہ شیر ایک مانا ہوا آدم خور ہے، جو کم از کم دو تین سو آدمی، چار پانچ سال کے عرصہ میں مار چکا ہے۔ اس وجہ سے انتہائی چالاک ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ تم اسے کسی محفوظ سواری پر بیٹھ کر نہیں ڈھونڈ سکتے۔ تیسری یہ کہ یہ ایک پہاڑی بلاک ہے جس میں اس کے چھپنے کی بہت گنجائش ہے، وہ ہر جگہ چھپ کر حملہ کر سکتا ہے۔ اور بہت نزدیک سے حملہ آور ہو سکتا ہے جو میدانی شیروں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ چوتھے یہ کہ یہ بلاک تمہارا گھوما پھرا اور

دیکھا ہوا نہیں ہے۔اس میں گھومنے کے لیے کوئی ہموار راستہ بھی نہیں۔ بلکہ بیٹن ہیں، جو بہت ہی گنجان جھاڑیوں سے ہو کر گزرتی ہیں۔اس میں شیر کا چھپنا کچھ مشکل نہیں۔تم تو ہر وقت اس کی نظروں میں رہو گے۔لیکن خود اُس کو نہیں دیکھ پاؤ گے۔اب بتاؤ یہ کتنی خطرناک بات ہے۔

اس تقریر کے بعد راجہ صاحب بولے، کھانا کھالو، اس کے بعد تم سے بات ہوگی۔

کھانے کے بعد سب لوگ اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور راجہ صاحب آ کر برآمدہ میں بیٹھ گئے۔سراج چچا نے اپنی کرسی میرے قریب رکھی اور بولے، میری اور راجہ کی شکار کے بارے میں تفصیلی بات ابھی کھانے سے پہلے ہوئی ہے۔ان کے ذہن میں اس شیر کے مارنے کی حکمت عملی تیار ہو چکی ہے۔

وہ اس شیر کو اکیلے مارنا چاہتے ہیں۔اس میں وہ تمہارے فادر اِن لا کو شامل کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔لیکن ان سے تعلقات اتنے نازک ہیں کہ اگر ان کو نہ شامل کیا گیا تو شاید وہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔راجہ صاحب شکار میں تعلقات بنانے کے قائل ہیں، توڑنے کے نہیں۔رہے تم، تم کو وہ اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے۔کیونکہ تم کاہل نہیں ہو بلکہ نہایت مستعد ہو۔ہمت بھی ہے، تیزی بھی ہے۔اور محنتی بھی ہو۔اگر تم ناراض ہو جاؤ تو منائے جا سکتے ہو۔ فادر اِن لا ناراض ہو جائیں گے اور خفا ہو جائیں گے تو ان کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔اور ان کا شکار، بغیر راجہ کے ہو نہیں سکتا۔لہٰذا سرے سے شکار ہی ختم، یہ تمام لوجک بگھارنے کے بعد سراج چچا مجھ سے بولے۔اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔میں کیا کہتا، لیکن میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ سب باتیں سراج چچا کے دماغ کی اُپج ہو سکتی ہیں، راجہ صاحب کا دماغ ایسی منطقی باتیں سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

آخر میں سراج چچا نے ایک ٹیپ کا بند اور لگایا، بولے راجہ صاحب کہتے ہیں، یہ شیر صرف میں ہی ماروں گا۔تمہارے فادر اِن لا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے پائے گی۔

یہ بات سُن کر میرے دماغ سے دھوئیں کی تہہ ہٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔میرے دماغ میں راجہ صاحب اور فادر اِن لا کے تعلقات کا جو موازنہ ہو رہا تھا، اب اس کی صحیح تصویر بننا شروع ہو گئی، یعنی اس شکار میں تعلقات کے درجہ کا تعین نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ اہمیت شیر کی

خصوصیت کو دی جا رہی تھی۔ اس جگہ کی جغرافیائی حالت کو دی جا رہی تھی، انسانی زندگیوں کی قیمت کو دی جا رہی تھی۔ اب میرے دماغ سے تعلقات کی برف پگھل چکی تھی اور میرا فطری کھلنڈرا پن واپس آ چکا تھا۔

ہم سب کو اب بہت بے چینی سے جوشی کا انتظار تھا، جو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ راجہ صاحب نے فارسٹ گارڈوں کو بُلایا اور پڈے باندھنے کی جگہ کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی۔ انہوں نے جہاں تک ان کے تجربہ کا تعلق تھا، اپنی اپنی رائے دی۔ لیکن راجہ صاحب کچھ بولے نہیں، سنتے رہے اور نہ ہی ان کی بات بیچ میں کاٹی۔ اس میں سے جو فارسٹ گارڈ میرے ساتھ گیا تھا، اس نے شیر کی ہسٹری تفصیل سے بتائی۔

اس نے کہا کہ یہ شیر نیپال میں رہتا ہے اور صرف پورن ماشی کے دن نکل کر، دریا پار کر کے اس علاقہ میں داخل ہوتا ہے۔ تقریباً پانچ سال سے اس کا یہی طریقہ چل رہا ہے۔ اس شیر نے یہاں جتنے آدمی کھائے ہیں، وہ پورن ماشی کے دن ہی کھائے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے، اس دن نکل ضرور کرتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں، ابھی پچھلے دنوں یہ شیر جو کوٹھی کے نیچے پلانٹیشن ہے، اس میں موجود تھا۔ وہاں اس نے ایک کانکڑ کو رپٹایا۔ میں شیر کو دیکھ کر ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ یہ میرے بہت قریب سے نکل کر کانکڑ کے پیچھے گیا۔ میں نے اسے پوری روشنی میں دیکھا۔ یہ ایک معمولی جسامت کا شیر ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کے سیدھے پیر کی ایک انگلی، مع ناخون کے ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ دریا کے کنارے اس کے پنجوں کے نشانوں کو بھی دیکھا تھا۔ اُن کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ اُسی آدم خور کے پنجے کا نشان ہے۔ یہ سنتے ہی فادر ان لا بہت گھبرا کر بولے میں نے بھی صبح ایسے انگلی ٹوٹے ہوئے پنجے کے نشان سڑک پر ایک جگہ مٹی میں دیکھے ہیں جو گدیلے کی طرف جا رہے تھے۔ راجہ صاحب اب بھی کچھ نہیں بولے۔ صرف فارسٹ گارڈ سے کہا، پھر کیا ہوا۔

وہ بولا میں جھاڑی میں سانس روکے چھپا بیٹھا رہا اور جیسے ہی شیر میری نظر سے اوجھل ہوا، میں کود کر کوٹھی کی طرف بھاگا۔ راجہ صاحب نے اس گارڈ پر بہت تیکھی نظر ڈال کر کہا کہ میں یہ پہلی بار سُن رہا ہوں کہ کوئی فارسٹ گارڈ شیر کو دیکھ کر چھُپ جائے اور جب شیر چلا جائے

تو وہ اس جگہ سے بھاگ آئے۔ اس بات کو سن کر وہ گارڈ بولا، یہ شیر عام شیروں کی طرح نہیں ہے۔ اس نے چار پانچ سو آدمی مارے ہیں۔ یہ آدمی کا دشمن ہے۔ آدمی کو دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ آپ آگے کا قصہ سنیے۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی، اب آپ کا جو جی چاہے وہ خیال کریں۔

فارسٹ گارڈ بولا، ٹاٹھ کی آبادی کوٹھی سے تقریباً تین چار میل دور ہوگی۔ اور یہاں سے چوکا دو ڈھائی میل۔ اس شیر نے پلانٹیشن سے نکل کر ٹھاٹھ کی راہ پکڑی اور وہاں اس نے ایک عورت کو جو جنگل میں گھاس کاٹ رہی تھی، مارا۔ عورت کی لاش کو اُٹھا کر چوکا پہنچا۔ وہاں اس نے اس کو کھایا۔ اور دوسرے دن چوکا میں ایک آدمی کو پکڑ لیا۔ اس کو لے کر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ اس کی لاش آج تک نہ مل سکی۔ اس شیر کے آنے کی خبر علاقہ بھر کو نہ جانے کیسے ہوجاتی ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے مضبوطی سے بند کر کے اس میں پڑے رہتے ہیں۔ کھیت خراب ہو جاتے ہیں، جانور اگر بھوکے پیاسے بندھے ہیں، تو بندھے رہتے ہیں۔ اگر کھلے ہوتے ہیں تو کھیتوں کو ایسا برباد کرتے ہیں کہ بیان سے باہر۔ غرض یہ ہر مہینہ، تقریباً ایک ہفتہ اس علاقہ کے لیے آفت ناگہانی بنا رہتا ہے۔ ایک ہفتہ تک سارا کاروبار چوپٹ رہتا ہے۔ اب آپ بتائیں کسی انسان کا ایسا دل گردہ ہے جو کھلے میں باہر نکل سکے۔

فارسٹ گارڈ سے اس قصہ کو سن کر میں نے یہ رائے قائم کی کہ راجہ صاحب کی لیڈری اور نمائندگی میں ہم لوگ اس شیر کو مار سکتے ہیں۔ ہم اس شیر کی باتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ وقت کا خیال ہی نہ آیا۔ ملازم نے چائے لگ جانے کی اطلاع دی، تب ہم کو ہوش آیا اور نظر گھڑی پر ڈالی تو دیکھا شام کے چار بج چکے تھے۔ راجہ صاحب نے جوشی جی کو یاد کرتے ہوئے کہا شام ہونے کو آئی لیکن جوشی جی کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں۔ میں نے راجہ صاحب سے کہا کہ اگر جوشی جی آجائیں تو پڑے ابھی باندھ دیے جائیں۔ کیونکہ فارسٹ کے لوگ ابھی یہیں موجود ہیں۔ میں ان کو ساتھ لے جا کر پڑے بندھوا دوں گا۔

راجہ صاحب نے مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، پڑے کل ہی دیے جائیں گے۔ یہ لوگ کل بھی یہیں ہوں گے۔ میں اور تم چل کر کچھ اچھی جگہ بھی تلاش کر لیں گے۔

ویسے میری نظر میں چند جگہیں آچکی ہیں۔ لیکن میں نے ان کو سرسری نظر سے دیکھا تھا اور مچان کے لیے مناسب جگہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ کل مچان اور پڈے ساتھ لے کر چلیں گے۔ جوشی جی بھی ہوں گے جو مچان باندھنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں اور اس کو بہت خوبصورتی سے چھپا بھی دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سورج غروب ہونے میں ابھی دو گھنٹے ہیں۔ میں دوسری طرف جا کر چند مرغ اور کلیج مار لاؤں تا کہ منہ کا ذائقہ درست ہو سکے اور شام بھی کٹ جائے۔ آج صبح سے ہم لوگوں نے کوٹھی سے باہر قدم نہیں نکالا۔ راجہ صاحب نے کہا، یہ جگہ اور یہاں کا شیر دوسری جگہوں اور دوسرے شیروں سے مختلف ہے۔ اور بلاک کا بھی فرق ہے۔ دوسرے بلاکوں میں تو جیپ سے جاتے تھے، اس میں پیدل ہی جانا ہوگا، جو بہت خطرناک ہے۔ لیجئے چھٹی ہوگئی۔ میں تو آج راجہ صاحب کی ہر بات مان لینے کی قسم کھا چکا تھا۔ ورنہ راجہ صاحب کی کیا، کسی کی بھی کبھی میرے سامنے نہیں چلی۔

راجہ صاحب کی بات ختم ہونے کے بعد فارسٹ کے لوگ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد جوشی ایک مریل پڈے کو ہانکتے ہوئے کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ اور سیدھے برآمدہ کی طرف آئے، جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آکر پڈا ملنے کا قصہ بڑی تفصیل سے سنایا۔ ان کا قصہ اور لچھے دار باتوں کو سنتے سنتے شام ہوگئی اور سردی محسوس ہونے لگی، لہٰذا ہم لوگ اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے نوکر کو پکار کر آتش دان میں آگ سلگانے کی ہدایت دی اور اس سے کہا کہ وہ کمپاؤنڈ سے کچھ گھاس نوچ کر پڈے کو ڈالے اور اسے کسی خالی کمرے میں بند کر دے۔ پانی بھی پلا دے۔ اب مغرب کا وقت ہو گیا تھا، راجہ صاحب نماز پڑھنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسری صبح نو بجے تک فارسٹ کا اسٹاف بھی آگیا۔ ہم لوگ بھی بھاری ناشتہ کر کے اور کچھ سینڈوچ اور کافی کی تھرماس لے کر دو فارسٹ گارڈوں اور راجہ صاحب کے ساتھ اُن کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چل دیے۔ اس مہم میں فادر اِن لا ہمارے ساتھ نہیں تھے کیونکہ ان کو پہاڑوں پر چلنے میں بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ ہماری پارٹی ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد، ایک ایسی ٹیڑھی میڑھی جگہ پر پہنچے جو اپنی بناوٹ اور جغرافیائی نوعیت کے لحاظ سے عجیب تھی، جو دو سمت

اونچی نیچی پہاڑیوں کی چوٹیوں کے بیچ گھومتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی تھی۔ یہاں درخت بہت گھنے تھے اور زیادہ تر بانجھ کے تھے۔ ایک بہت صاف شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ اس وادی میں دونوں طرف کے پہاڑوں سے کئی گدیلے یعنی نالے نکل کر اس طرف گر رہے تھے، جن میں اس وقت پانی نہیں تھا۔ لیکن ان نالوں کے آس پاس کلک بڑی کثرت سے اُگی ہوئی تھی۔ اس وادی میں دھوپ بالکل نہیں تھی اور ہوا بھی بالکل ساکت تھی۔ یہاں دوسری طرف کے مقابلہ ٹھنڈک کچھ زیادہ تھی۔

یہ وادی دوسری وادیوں کی طرح گہری نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں پر دونوں پہاڑیوں کا فاصلہ بڑھ گیا تھا اور ایک پلیٹو کی شکل بن گئی تھی۔ راجہ صاحب نے ہم سے یہاں رُکنے کو کہا اور خود ایک فارسٹ گارڈ کے ساتھ، جس کے پاس ایک بارہ بور بندوق تھی، اس کو لے کر چشمہ کے کنارے کنارے چل دیے، اور تھوڑی دور چل کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب واپس لوٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے، سانس بھی کچھ پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اس وقت ان سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے فارسٹ گارڈ سے پوچھا، کہاں گئے تھے؟ کیا دیکھا؟ کیا ملا؟

اس نے کہا مجھ کو معلوم نہیں، صاحب کیا دیکھنا چاہتے ہیں، اور کیا تلاش کر رہے ہیں۔ رہی جانے کی بات اگر صاحب نے پہلے سے کچھ بتا دیا ہوتا تو میں ان کو اس طرف لے کر بالکل نہ جاتا۔ وہاں پہاڑ گرنے کی وجہ سے بالکل ایک دیوار کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے بہت دور تک ایک میدان پھیلا چلا گیا ہے جس میں وہاں نیچے نہیں اُترا جا سکتا۔ وہاں جانے کے لیے بارہ تیرہ میل کا ایک لمبا چکر لگانا ہوگا، تب نیچے جانے والا راستہ ملے گا۔ وہ راستہ، پونا گری والے راستہ سے کٹتا ہے۔

میں نے راجہ صاحب سے کہا کہ آپ بلاوجہ ہم لوگوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ لیکن شاید آپ کو خیال نہیں کہ اس بلاوجہ کی مشقت میں آپ خود ہی تھک رہے ہیں۔ راجہ صاحب بہت ناک بھوں چڑھا کر بولے، تم گدھے ہو۔ تم کو معلوم ہے یہ شیر نیپال سے آتا ہے۔ ایک آدمی مارتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ اب اس کو کل تک نیپال ضرور واپس ہونا ہے۔ اس نے

ابھی تک کوئی آدمی مارا نہیں ہے۔ یا ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں مل سکی ہو، لیکن ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ ابھی تک کسی آدمی کو نہیں مار سکا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی پچھلی پانچ سالہ آدم خوری کی عادت میں یہ پہلا موقع ہے جو وہ آدمی نہیں مار سکا۔ لہٰذا میں گھوم پھر کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جس راستے سے آتا ہے، اسی راستہ سے واپس بھی جاتا ہے، یا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے، اور اگر کرتا ہے تو کون سا۔ کیونکہ نیپال جانے اور آنے کا راستہ یہاں ایک ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ کیونکہ پہاڑ کا یہ قطع چاروں طرف سے شاردا ندی سے گھرا ہوا ہے۔ اور شاردا کی طرف پہاڑوں کا اُتار نہیں ہے۔ بلکہ کافی اونچی ایک قدرتی دیوار پہاڑ گرنے کی وجہ سے بن گئی ہے، جس کو یہ شیر بھی نہیں پار کرسکتا۔ وہ بھی ہم سب کی طرح سڑک یا لیکھ پر چلنے کا عادی ہوتا ہے۔

میں نے ناک بھوں سکوڑ کر ذرا تلخی سے راجہ صاحب سے کہا "کیا آپ نے میدان کے سب شیر مار لیے ہیں جو اس شیر کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟" اتنی محنت سے تو ہم میدان میں ایک شیر اور مار سکتے تھے وہاں تو کوٹھی سے باہر کوئی نکلتا نہیں۔ شیر کی تلاش مجھ کو، نوکروں کو اور گاؤں والوں کو کرنا پڑتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جانے کے لے جیپ ضرور ہوتی ہے، لیکن یہاں پیدل دسیوں میل دور چلنا پڑ رہا ہے۔ آپ دوڑنا چاہتے ہیں تو ضرور دوڑیں۔ شیر کو فادر اِن لا اور آپ ماریں، مجھ تو مارنا نہیں ہے۔

راجہ صاحب بہت مسکرا کر بولے اگر اس وقت چلے گئے تو بہت بڑے خسارے میں رہو گے۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ وہ بولے میں نے اپنے دل میں پہلے ہی سے یہ طے کرلیا تھا کہ یہ شیر میں ماروں گا۔ کھال سجاد کو دوں گا، اور انعام کے پانچ ہزار روپے جو نیپال کے راجہ نے اس شیر کو مارنے پر رکھے ہیں اور یہاں کی گورنمنٹ نے جو اس پر پانچ سو کا انعام مقرر کیا ہے، وہ تم کو دونگا۔ یعنی ساڑھے پانچ ہزار روپیہ کے تم بلاشرکت غیرے مالک ہو جاؤ گے۔

اب تم جا رہے ہو تو جاؤ۔ اب جو شیور لیٹ کا کنورٹیبل ماڈل جس کو دیکھ کر تمہارے منہ میں پانی بھر آتا ہے، اب میں ان روپوں سے خود خریدوں گا۔ اور اس کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔

یہ سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر راجہ صاحب بولے چلو میری سمجھ میں سب نقشہ آگیا۔ کوٹھی چلو، کھانا کھا کر تم اور جوشی پڈّے کو اس جگہ باندھ دینا، جو میں تم کو راستہ میں دکھادوں گا۔ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ میں نے کہا، راجہ کیا یہ شیر بھوکا ہی مارا جائے گا۔ راجہ صاحب بولے بھوکا کیوں، پڈّا کھا کر مرے گا۔

ہم لوگ یہی سب خرافات بکتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ صاحب سے راستہ بھر جُملے بازی ہوتی رہی۔ راستہ میں راجہ صاحب کوٹھی کی طرف جانے والے راستہ کو چھوڑ کر ایک دوسری سمت مُڑ گئے اور ایک گدیلے سے ہو کر اوپر چڑھنے لگے۔ گدیلے میں بڑے بڑے پتھروں کے بکھرے ہونے کی وجہ سے اوپر چڑھنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اس ڈھلان والے میدان میں وہی چشمہ جو پیچھے بہہ رہا تھا، وہ آگے جا کر چار چھ فٹ اونچائی سے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے سفید، شفاف پانی کی تقریباً دس بارہ فٹ سفید چادر نیچے پتھروں پر گر کر ایک بہت مدّھم سُریلے راگ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بہت بڑے، بانجھ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ فرن کی جھاڑیاں کثرت سے اُگی ہوئی تھیں۔ ہم سب اس جگہ پہنچے ہیں تو اپنی سب تکان اور محنت جو نالہ چڑھنے میں اُٹھانا پڑی تھی، وہ بھول کر اس خوبصورت نظارے میں کھو گئے۔ معلوم نہیں اس مقام کی خوبصورتی کی پوری طرح منظر کشی کر بھی پایا یا نہیں، لیکن ہاں، مجھ کو اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ جگہ واقعی بہت ہی خوبصورت تھی۔

ہم لوگوں نے چشمہ کو پار کیا، اور دوسری طرف پہاڑی کی جڑ میں پہنچ گئے۔ اس جگہ پہنچ کر راجہ صاحب نے درختوں پر نظر دوڑانا شروع کی۔ شاید وہ مچان باندھنے کے لیے کسی مناسب درخت کی تلاش میں تھے۔ آخر راجہ ایک جگہ جا کر رُک گئے۔ بولے اس پتلے سے درخت میں پڈّا باندھ دینا اور مچان اس کے بائیں ہاتھ کو جو بہت گھنا بانجھ کا درخت ہے، اس کی جو دو گھنیری شاخیں ہیں، اس میں باندھ دینا۔ جوشی جی راجہ صاحب کی بات سمجھ گئے۔ اس کے بعد ہم لوگ کوٹھی واپس لوٹ آئے۔

کوٹھی پہنچ کر کھانا کھایا۔ جوشی، دو تین آدمیوں اور ایک فارسٹ گارڈ کو لے کر پھر اسی جگہ کے لیے چل دیے، جہاں پڈّا باندھنا طے ہوا تھا۔ راجہ صاحب نے مجھ سے کہا۔ تم دوسرے

فارسٹ گارڈ کو لے کر اس پہاڑی پر نکل جاؤ جہاں کل گئے تھے اور جہاں تم نے گھڑل اور مُرغ دیکھے تھے۔ آج رات کا کھانا بغیر گوشت کے نہیں کھایا جائے گا۔ تم کو اجازت ہے، جتنے چاہو فیر کرنا۔ اگر کوئی جانور نہ ملے تو بھی بارہ بور کے تین چار خالی فائر اس پہاڑی پر ضرور کر دینا۔ اگر شیر دکھ جائے تو فائر مارنے کی نیت سے کرنا، زخمی کرنے کی نیت سے نہیں۔

میں ان کی پوری بات سمجھ گیا۔ یعنی ان کے خیال میں شیر اس علاقہ میں ٹھہرے گا تو اسی پہاڑی پر ٹھہرے گا۔ کیونکہ وہاں جانور بھی ہیں اور شیر کے رُکنے کے لیے کچھ ٹھنڈی جگہیں بھی ہیں، پانی بھی ہے۔ اگر شیر اس پہاڑی پر ہے تو ہمارے فائروں کی آواز سُن کر وہ اس پہاڑی کو چھوڑ کر صرف اسی جگہ جا سکتا ہے جہاں راجہ صاحب نے پڑا بندھوایا ہے۔ بڑی موٹی سی بات تھی، لیکن ہماری سمجھ میں تب ہی آئی جب راجہ صاحب کی ہدایتوں کو ہم نے سُنا۔

اس شیر کو مارنے کے لیے، راجہ صاحب کا پلان ہر طرح مکمل تھا۔ میں نے یہ بات بہت چپکے سے سراج چچا کے کان میں کہی۔ سراج چچا نے سَر ہلاتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا اور بولے، تم ابھی تک راجہ صاحب کی خوبیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں انہوں نے نہ جانے کتنے شیر مار کر دوسروں کو دے دیے اور کبھی زبان پر نہیں لائے کہ شیر پر پہلی گولی اُن کی چلی تھی جس سے شیر مارا گیا۔ کیا تم کو نہیں معلوم۔ تمہارے ماموں کی دوست ڈاکٹر ڈگلس کے ڈرائنگ روم میں جو شیر کی کھال ٹنگی ہے، وہ چھنگا نالے میں راجہ صاحب نے مارا تھا۔ ڈگلس کا فائر تو ہَوا میں تھا۔ تمہارے ماموں تم سے خود اقرار کر چکے ہیں کہ ایک بھالو اور ایک شیر ان کے شکار میں راجہ نے مارے۔ نام ان کا کیا گیا۔ دوسرے کئی کلکٹر بلکہ ہر کلکٹر جو شیر کی کھال اپنے گھر میں ٹانگے ہوئے ہے، وہ راجہ نے مارے ہیں۔ کیا کبھی انہوں نے تم سے کہا کہ یہ شیر انہوں نے مارے ہیں۔

سراج چچا کی یہ باتیں سُن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ سراج چچا صرف کھانے اور باتیں بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس وجہ سے وہ ہم لوگوں کے ساتھ شکار میں آتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں چیزیں شکار میں بہت آسانی سے ایک جگہ فراہم ہو جاتی ہیں۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ شکار کے نقاد اور تاریخ داں (ہسٹورین) بھی ہیں۔ آج ان کے مرنے

کے بعد، جب میں پُرانے واقعات لکھ رہا ہوں، تو ان کی کتنی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یہ کتاب خرافات کا ڈھیر نہ ہوتی۔

یہ راجہ صاحب کی بدقسمتی ہے کہ یہ کتاب سراج چچا کے مرنے کے بعد لکھی گئی کیونکہ سراج چچا ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو راجہ صاحب پر صحیح زاویوں سے روشنی ڈال سکتے تھے۔ میں راجہ صاحب پر پوری روشنی ڈالنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ خیر اب آگے کا قصہ سنیے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں نے فارسٹ گارڈ کو ساتھ لیا، اور اس پہاڑی کی طرف جدھر راجہ صاحب نے بتایا تھا، روانہ ہوا۔ یہاں کا قصہ تو بہت لمبا چوڑا ہے، لیکن مختصر یوں سمجھ لیجئے، کہ ہم لوگ جب شام کو واپس لوٹے ہیں تو گھڑل، فارسٹ گارڈ کے کاندھے پر لدا ہوا تھا، اور دو مرغ اور شاید دو کلیج میرے ہاتھوں میں جھول رہے تھے۔ ہمارا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ خیر مقدم کرنے والوں میں سراج چچا سب سے آگے تھے کیونکہ آج کئی دن کے بعد اُن کو اُن کا اصلی کھانا ملنے والا تھا۔ وہ دال ترکاری کو گھاس پھونس کہتے تھے۔ وہ مرغی کے انڈے کھانے والوں کو بہت بُری نظر سے دیکھتے تھے۔ خیر ہم لوگ شکار نوکروں کے سپرد کر کے برآمدے میں آئے، جہاں فادر اِن لا اور راجہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو شروع سے لے کر آخر تک کا اس پہاڑی شکار کا قصہ سنانا پڑا۔ میں نے بتایا کہ ہماری پارٹی کو شیر تو کیا، شیر کی پرچھائیں تک اس پہاڑی پر نہیں ملی۔ فارسٹ گارڈ سے انہوں نے اس کے پنجوں کے نشانات کی بابت بہت تفصیل سے پوچھا۔ اس نے کہا وہاں کسی قسم کے نشان ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ یہ جگہ پہاڑی پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

راجہ صاحب نے کہا، میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ شیر کل سے اسی پہاڑی پر ہے۔ جب تم لوگ وہاں گئے تھے تو وہ شیر اس پہاڑی کو چھوڑ کر، ٹنک پور والی سڑک کو کراس کر کے انہی پہاڑیوں پر چلا گیا، جہاں تم پڑا دے آئے ہو۔ میں نے جل کر کہا، راجہ صاحب آپ شکار چھوڑ دیں اور جوتشی بن جائیں۔ آپ کی اُدا پر سیکڑوں لوگ بیوقوف بن جائیں گے۔

جوشی جی پڑا باندھ کر ہمارے آنے سے پہلے واپس آگئے تھے۔ ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر جلدی سو گئے۔ صبح کو فجر کے وقت راجہ صاحب نے مجھے جگایا۔ ہم لوگوں نے فجر کی نماز

پڑھی اور راجہ صاحب کو ناشتہ کرایا۔وہ ہمیشہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد راجہ صاحب نے پڑا دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے کہا میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں پڑا کھولنے اور باندھنے نہیں آیا ہوں۔ میں یہاں شکار کھیلنے آیا ہوں۔ آج میں پنا گری والی سڑک پر، یہاں سے سات آٹھ کلومیٹر دور شکار کھیلوں گا۔لیکن راجہ صاحب نے میری ایک نہیں چلنے دی اور مجھ کو زِچ ہو کر اُن کے ساتھ پڑا دیکھنے جانا ہی پڑا۔اب کی مرتبہ فادر اِن لا بھی ہم لوگوں کے ساتھ پڑا دیکھنے گئے۔

ہم لوگ چشمہ کے پاس پہنچے، جو کوٹھی سے کافی دور تھا۔ فادر اِن لا بُری طرح تھک گئے تھے اور مارے پیاس کے ان کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے۔انہوں نے چشمہ پر پہنچتے ہی سب سے پہلے پانی پیا۔ راجہ صاحب چشمہ کے کنارے کی طرف چل دیے جہاں پڑا باندھا گیا تھا۔ ہم سب بھی ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جب اس جگہ پہنچے ہیں تو جوشی بڑھ کر آگے آئے اور سرگوشی میں بولے، ارے میں نے تو پڑا یہیں باندھا تھا۔ لگتا ہے کھُل کر کسی طرف چلا گیا ہے۔ راجہ صاحب نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے جوشی جی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم لوگوں نے اپنی بھری ہوئی رائفلوں کے سیف ہٹائے۔ سب لوگوں کے دماغوں پر ایک عجیب قسم کی ٹینشن طاری ہوگئی۔ شاید آدم خور کی دہشت کی وجہ سے۔

ہم لوگ اب بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم ناپ تول کر رکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، اور پہاڑی کے اوپر اور نیچے نظریں دوڑاتے رہے۔ ہر آڑ اور بولڈر کے پیچھے ہم کو شیر دکھائی دینے لگا، جو وہاں کہیں نہیں تھا۔ اس طرح ہم لوگ اس جگہ سے جہاں پڑا باندھا تھا، کوئی دو تین سو گز دور آگئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ آدھا کھایا ہوا پڑا، چشمہ کے پانی میں پڑا ہوا ہے جس کو سب سے پہلے راجہ صاحب نے ہی دیکھا۔ یہ جگہ کچھ کھلی ہوئی ہموار سی تھی جہاں بڑے بڑے اور گھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے نیچے اسٹابوری اور دوسری جھاڑیاں بڑی کثرت سے اُگی ہوئی تھیں، جس میں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ پڑا کِل ہو گیا تھا۔ لیکن اس جگہ مچان نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ درخت بہت لمبے تنے کے تھے اور شاخیں ایسی نہیں تھیں جن پر ہم لوگوں میں سے کوئی پہنچ سکے۔ اگر کِل کو ڈسٹرب کیا جائے تو اس بات کا امکان

تھا کہ شیر اس کو تلاش نہ کر سکے۔ ہم لوگ ابھی انہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ فادر اِن لا کی حلق سے بہت خوفناک آوازیں نکلنا شروع ہوئیں۔ ہم لوگ گھبرا کر ان کی طرف دیکھنے لگے تو معلوم ہوا کہ اُن کو پڑے کی آدھی کھائی ہوئی لاش پانی میں پڑی دیکھ کر متلی ہو رہی ہے، کہ انہوں نے وہاں کا پانی کیوں پیا۔ راجہ صاحب نے ان کو اپنے اُبھرے ہوئے دیدوں سے گھورا اور سرگوشی میں خاموش رہنے کو کہا۔ راجہ صاحب نے جلدی جلدی اپنی گردن کو گھما کر اور کئی مرتبہ خود گھوم کر اس وادی کو اوپر سے نیچے تک بڑی تجسس کی نظروں سے دیکھا اور جلدی خود سب سے آگے آکر چشمہ کے ساتھ نیچے اُترنا شروع کیا۔ سب لوگ بہت خاموشی سے سانس روکے ان کے پیچھے چلنے لگے۔ اب ہم لوگ پھر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں فادر اِن لا نے پانی پیا تھا۔ یہاں فارسٹ گارڈ نے کہا کہ اگر آپ کوٹھی جا رہے ہیں تو یہ راستہ کافی گھماؤ دار ہے۔ اگر وہیں سے دکھن کی طرف چل کر اوپر چڑھا جاتا، تو برڈل روڈ اس سے بہت قریب تھی۔

راجہ صاحب نے کہا، میں نے جان بوجھ کر اس راستہ کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ شیر وہیں اوپر کی پہاڑیوں پر کسی پُرسکون جگہ لیٹا ہوا ہے۔ اگر ہم ادھر سے جاتے تو ممکن تھا کہ ہمارے پیروں کی آہٹ سے جو آواز پیدا ہوتی، وہ شیر کو ڈسٹرب کرنے کے لئے کافی تھی۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں چشمہ کے نزدیک جو گدیلے کا دہانا ہے، اس سے دس بارہ گز دور نرکل میں بیٹھوں گا، اور تم بتاؤ کیا تم بغیر مچان کے زمین پر بیٹھ سکتے ہو۔ لیکن یہ مت بھولنا کہ یہ شیر سیکڑوں آدمی کھا چکا ہے۔ فادر اِن لا بولے، میں نے اپنی جگہ کا انتخاب کرلیا ہے۔ ہم لوگ بہت خاموشی سے کوٹھی پہنچے۔ سراج چچا نے وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لئے دسیوں سوالات کر ڈالے۔ نہ راجہ نے جواب دیا اور نہ ہی فادر اِن لا کچھ منہ سے پھوٹے۔ راجہ صاحب نے صرف اتنا کہا، ہم لوگ کھانا کھا کر تین بجے یہاں سے اس جگہ کے لیے چل دیں گے۔

تھوڑی دیر میں کھانا لگ گیا۔ ہم لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں نے راجہ صاحب سے کہا، فادر اِن لا جہاں بیٹھنے کو کہہ رہے ہیں، وہ جگہ وہاں کی پچویشن

کے حساب سے مناسب تو ضرور ہے لیکن اس میں ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔

راجہ صاحب بولے، وہ کیا؟

میں نے کہا کہ شیر اگر اُن پر دن میں چارج کرتا ہے تو وہ اس کو ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر شیر اندھیرے میں چارج کرے گا تو ان کو اس کا پتہ بھی نہ چلے گا اور وہ ان کو مار ڈالے گا۔ کیا آپ نے اب کی بار ہمارے فادر ان لا کو مَروا دینے کا تہیہ کرلیا ہے۔

راجہ صاحب بولے یہ شیر دن دَہاڑے مارا جائے گا۔ اگر وہاں ہوا تو میں شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے اس جگہ سے تقریباً ایک میل دور ہوں گا، کیونکہ یہاں آج کل اُجالا سات ساڑھے سات بجے تک رہتا ہے۔

اگر شیر کل پر آیا تو چار بجے یا زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک ضرور آجائے گا، ورنہ کبھی نہیں آئے گا۔ تو کیا ہم لوگ وہاں سے ساڑھے چھ سات بجے تک ایک میل کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے؟ پھر بولے، اگر تم کو آرام کرنا ہو تو کر لو۔ میں بھی کچھ دیر کے پلکیں جھپکانا چاہتا ہوں۔

تین بجے سے کچھ پہلے راجہ صاحب پلنگ سے اُٹھے، چائے پی، میں، فارسٹ گارڈ، جوشی اور سراج چچا ان کے ساتھ چل پڑے۔ ہم لوگ تقریباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹے میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں پڈّے کی لاش پڑی تھی۔ راجہ صاحب اپنی پسند کی جگہ جا کر بیٹھ گئے۔

جب یہ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو راجہ صاحب نے سراج چچا سے جو اُن کے قریب کھڑے تھے، کہا کہ اچھا اب آپ لوگ جائیں، لیکن بلند آواز سے باتیں کرتے، اوپر والے راستے سے جائیں۔ اور جب برڈل روڈ پر پہنچیں تو سراج چچا آپ وہاں رُک کر ایک سگریٹ جلائیں اور خوب کھانسیں، کھکاریں۔ برڈل روڈ پر آپ بہت ہوشیاری سے چوکنے ہو کر جائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے کا دھیان رکھیں۔ سراج چچا نے ''اچھا'' کہا اور ہم سب لوگ وہاں سے باتیں کرتے ہوئے چل دیے۔ ہم کو راستہ میں کوئی شیر دکھائی نہیں دیا اور بخیریت تمام اپنے بنگلے پر پہنچ گئے۔

یہاں تک جو قصہ بیان کیا گیا ہے، وہ میرا دیکھا ہوا ہے، اس کے آگے کا قصہ

فادر ان لا اور راجہ صاحب کا بیان کیا ہُوا ہے جو اس طرح ہے:

رات کے آٹھ بج گئے اور فارسٹ کے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ میں اور سراج چچا اکیلے برآمدہ میں اونگھتے رہے۔ نہ تو ابھی تک راجہ صاحب آئے تھے اور نہ ہی کسی فائر کی آواز ہی سنائی دی تھی۔ آخر میں نے سراج چچا سے کہا، معلوم نہیں، یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مجھ کو بڑی اُلجھن ہو رہی ہے۔ کیا ان کو چل کر دیکھا جائے۔ سراج چچا بولے، اس دو سیل کی ٹارچ کی روشنی میں۔ مجھ کو کسی کھڈ میں تو گرنا نہیں ہے، جو میں جاؤں۔ اور نہ ہی میں تم کو جانے کی رائے دوں گا۔ ان کی بات سُن کر میں خاموش بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے گیٹ کی طرف تکتا رہا۔

اس طرح کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد گیٹ کے باہر ٹارچ کی ایک لمبی بیم دکھائی دی جو ابھی دور تھی۔ میں اور سراج چچا ایک دم کھڑے ہو گئے اور ٹارچ والوں کا انتظار کرتے رہے۔ نوکر بھی شاید ان کے انتظار میں پھاٹک کی طرف دیکھتے رہے تھے۔

سب سے پہلے، جوشی ان لوگوں سے گیٹ پر ملے۔ اور ان کے تھیلے اور رائفلیں ان سے لے کر برآمدہ میں آئے۔ جیسے ہی سب لوگ برآمدہ میں آئے، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، راجہ صاحب کیا ہوا؟ پیٹرومیکس کی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے سے فتح اور کامرانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ بڑے تعجب کی بات تھی کہ دونوں کے چہروں پر تھکاوٹ کا نام تک نہ تھا۔ مجھ کو بڑا اکسائٹ منٹ ہو رہا تھا۔ لیکن دونوں خاموش تھے۔

آخر سراج چچا نے خاموشی توڑتے ہوئے ان سے کہا، کیا رہا؟ راجہ صاحب بولے، رہتا کیا، شیر مار لیا گیا۔

میں نے بہت جل کر کہا۔ ارے بتایئے نا، کیسے مارا؟ کس نے مارا؟ کدھر سے آیا؟

راجہ صاحب بولے۔ بندوق سے مارا۔ پہاڑی پر مارا اور اتفاق سے میں نے ہی مارا۔

ان کی یہ بات سُن کر میرے غصے کا پارا انتہا کو پہنچ گیا راجہ صاحب تاڑ گئے، اور بہت پیارے بولے۔ بیٹھنے تو دو۔ پہلے کافی پلاؤ، پھر قصہ بھی سُن لینا۔

سب نوکر بھی وہیں کھڑے تھے۔ اس میں سے ایک نوکر بھاگتا ہوا باورچی خانہ گیا اور

بڑی تیزی سے کافی کا سامان لے کر واپس آیا۔ جوشی نے کافی بنائی۔ راجہ صاحب نے قصہ بیان کرنا شروع کیا:

تم لوگوں کے چلے جانے کے تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد شیر مجھ کو اس پہاڑی پر دکھائی دیا، جس کے درّہ کے نیچے تمہارے فادر اِن لا بیٹھے تھے۔ شیر شاید تم لوگوں کے پیچھے پیچھے کچھ دور تک گیا اور واپس اس پہاڑی پر آیا جہاں سجّاد بیٹھے تھے۔ وہ پہاڑی بالکل میرے سامنے تھی۔ شاید شیر نے سجّاد کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کا شکار کرنا چاہتا تھا، لیکن ان تک اس کو پہنچنے کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، جہاں سے وہ اُن کے دیکھے بغیر اُن پر حملہ کر سکتا۔ لہٰذا وہ اوپر کی طرف چڑھا اور میری نظر سے غائب ہو گیا۔ شیر وہاں سے ہٹ کر گدیلے کی طرف آیا۔ سجّاد، شیر کی آمد سے بالکل بے خبر تھے۔ اسی وقت گدیلے میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ شیر اب گدیلے کے راستے سے نیچے آنا چاہتا ہے۔ لیکن گدیلے سے آنا شیر کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس بات کو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کیونکہ پہاڑی سے گدیلا بیس تیس فٹ نیچے تک عمودی تھا۔ شاید اب شیر وہاں سے بھی واپس ہو گیا تھا کیونکہ اب پتھر وغیرہ گرنے کی آوازیں گدیلے سے آنا بند ہو گئی تھیں۔

یہ بات میرے لیے بڑی تشویش ناک تھی۔ اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ شیر کہاں ہے۔ اسی دوران جب میں اوپر کی جھاڑیوں پر نظریں دوڑا رہا تھا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیر بالکل سجّاد کے سر کے اوپر کری ہوئی پہاڑی کے کنارے پر کھڑا ہے اور وہاں سے شاید تمہارے فادر اِن لا پر کودنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی یہ خیال میرے دماغ میں آیا، میں نے رائفل اُٹھائی اور شیر پر فائر کر دیا۔ شیر کے گولی جہاں میں نے ماری تھی، لگی۔ شیر گولی کے دھکّے سے پیچھے کو ہُوا، لیکن فوراً ہی پیٹ کے بل گر کر کنارے سے نیچے پھسل پڑا۔ اور تمہارے فادر اِن لا کے پیروں سے چار فٹ دور پتھر پر گر کر ایک مرتبہ تڑپا اور اوندھ کی ایک لمبی آواز نکالی۔ اتنی دیر میں، میں گھاس سے نکل کر شیر کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔

میں نے دیکھا کہ تمہارے فادر اِن لا آنکھیں بند کیے رائفل کو دونوں ہاتھوں سے بھینچے ہوئے اُکڑوں بیٹھے ہیں اور رائفل کی نالی ان کی پیشانی پر، دونوں آنکھوں کے درمیان لگی

ہوئی تھی۔ فادر اِن لا راجہ صاحب کی یہ بات سُن کر آگ بگولا ہو گئے اور لگے راجہ کو گالیاں دینے۔

سراج چچا کا آخری شکار

ہمارے شکار کے آخری دور میں کوئی شکار بغیر سراج چچا کی شمولیت کے نامکمل سمجھا جاتا تھا اور یہ کتاب بھی بالکل نامکمل ہوتی اگر اس میں سراج چچا کا ذکر نہ کیا جاتا۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں واقعات کو لکھنے کی اچھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پلاٹ چاہے کتنا عمدہ کیوں ہو، اگر اس کو خوبصورتی اور سلیقہ سے پھیلایا نہ جائے تو وہ بالکل پھُس پھُسا رہ جاتا ہے۔

کاربٹ اور اینڈرسن کے قلموں میں زور تھا۔ وہ تصورات (Imagination) کی دولت سے مالا مال تھے، اس وجہ سے اتنی خوبصورت کتابیں لکھ گئے۔ کاش میرے قلم میں بھی طاقت ہوتی تو ان واقعات پر دسیوں کتابیں لکھ دیتا۔ لیکن ہر آدمی ہر کام کے لیے نہیں پیدا ہوتا۔ آج اگر سراج چچا زندہ ہوتے تو میری یہ کتاب بھی بہت چٹ پٹی اور دلچسپ ہوتی۔ ان کی رائے اور مشورے میرے لیے مشعل راہ ہوتے۔

سراج چچا سے جس وقت میری ملاقات ہوئی، اس وقت ان کی عمر ستّر سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ تقریباً بیس سال وہ ہمارے شکار میں موجود رہے۔ اگر وہ خود نہیں آئے تو لائے گئے۔ ان کے لائے جانے کا کام میرے اور راجہ صاحب کے سپرد رہا۔ شکار میں ان کی موجودگی کئی وجہ سے بہت ضروری تھی۔ اوّل تو یہی کہ شکار کے پرمٹ ہولڈروں پر قانونی سختی کی وجہ سے ایک تکنیکی مشکل یہ تھی کہ شیر کا پرمٹ صرف ہیوی بور، یعنی تین سو پچھتر (375) میگنم سے کم ہلکی بور کی رائفل پر نہیں ملتا تھا۔ ہماری پارٹی میں صرف دو شخص ایسے تھے جن کے پاس ہیوی بور رائفلیں تھیں۔ پارٹی بڑی تھی۔ اس وجہ سے سب لوگ اپنی اپنی رائفلیں استعمال نہیں کر سکتے تھے اور ان کے نام پر بھی بحیثیت مہمان پرمٹ جاری نہیں ہو سکتے تھے۔

سراج چچا واحد آدمی تھے، جن کے پاس کئی ہیوی بور اور لائٹ بور رائفلیں تھیں۔ ان کا اکیلا ایک نام پرمٹ پر ہو جانے سے کتنی مشکلیں آسان ہو جاتی تھیں۔ پوری ایک موٹر ان کی

رائفلوں سے بھر سکتی تھی۔ ان کے پاس بڑے بور والا ایک ایسا پسٹل تھا جس کی میگزین میں دس کارتوس آتے تھے۔ جب یہ پسٹل اپنے کیس (خلتہ - تھیلی) میں لگ جاتا تو وہ اس کا بٹ ہو جاتا۔ یہ کیس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ لیکن شکار کے مطلب کا بالکل نہیں تھا۔ انگریز اسکو گھوڑے پر بیٹھ کر پگ ہنٹنگ (سؤر کے شکار) کے لیے استعمال کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جب میں اور راجہ صاحب بیناپانی بلاک میں ایک روگ (بدمست) ہاتھی کی تلاش میں پہاڑ کی وادیوں میں گھس گئے جس میں اس نے اسی وقت سیتاپور پلائی وڈ کے دو ملازموں کو مار ڈالا تھا، اور لوگوں کے چلّانے سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ہماری پارٹی بھی اس وقت ایک دوسرے شکاری سے ملنے بینا پانی آئی ہوئی تھی، جو اس ہاتھی کی اطلاع ملی۔ میں اور راجہ صاحب جیپ میں بیٹھ کر اس طرف چل پڑے اور جائے واردات پر پہنچے۔ اس وقت وہاں سے لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں۔ کوئی آدمی موقعۂ واردات پر موجود نہیں تھا۔

لیکن موقع پر نشانات پوری کہانی سُنا رہے تھے۔ ہم لوگ ان نشانات کا سہارا لے کر جنگل میں گھس پڑے۔ آگے جا کر معلوم ہوا کہ پہلے تو ہاتھی ایک پہاڑی سلسلے پر چڑھا، اس کی تازہ لید ملی۔ پھر اس نے اپنا راستہ بدل لیا، اور ایک برساتی خشک نالے کو پکڑا، جو دوسری وادی میں نیچے کو جاتا تھا۔ اس نالے میں بہت بڑے بڑے بولڈر تھے اور کناروں پر بڑی گھنی اور ہری کچھ جھاڑیاں تھیں۔ اس ہاتھی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ اپنے اوپر کوڑا کرکٹ اور درخت کی شاخیں ڈال کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے، اور جو کوئی بھی اس کے پاس سے گزرتا، اس کو اپنی سونڈ سے گھسیٹ کر پیروں سے روند ڈالتا ہے۔

جب ہم نالے میں اُتر رہے تھے، تب راجہ صاحب نے میری توجہ میرے ہلکے پسٹل پر دلائی۔ میں نروس ہو گیا۔ لیکن راجہ صاحب نے میری ہمت بڑھائی اور کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ ہاتھی اس سے مر تو نہیں سکتا لیکن اس کے ہوتے ہوئے تم کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا۔ تم صرف اتنی ہمت کرنا کہ جب اس کا پچھلا پیر اُٹھے، تو اس کے پیر کی گول گدی پر فائر کر دینا۔ جیسے ہی گولی ہاتھی کے پیر پر لگے گی، وہ پیر اٹھا کر کھڑا ہو جائے گا، پھر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں

سکے گا۔ بس سمجھو کہ تمہارا کام ختم ہوگیا۔ میں اتنی دیر میں اس کے سر میں کئی گولیاں اُتار چکا ہوں گا۔

یہ سن کر جان میں جان آئی ہم ہاتھی کا پیچھا کرتے رہے لیکن وہ ہم کو کہیں نہیں دکھائی دیا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اس کو بتادیا کہ اس کی موت کی شکل میں دو آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اگر تو ان کے ہتھے چڑھ گیا تو تیرا مارا جانا لازمی ہے۔

میرے پستول کے کریز نے ایک مرتبہ سراج چچا کو مجھ سے بہت ناراض کروادیا۔ ہُوا یہ کہ ہم لوگ ایک بلاک میں شکار کھیل رہے تھے اور جابجا پڈّے باندھتے پھرتے تھے۔ لیکن کوئی پڈّا کل نہیں ہو رہا تھا۔ میں ایک روز مرغیوں کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ جہاں ایک ڈیم کا کنارہ تھا۔ وہاں نرکل کی کثرت تھی اور اس کی مخالف سمت جنگل کا اونچا کنارا تھا جس کو ڈاہیا کہتے ہیں۔ اس ڈھایئے پر کوروں کے بہت موٹے موٹے درخت اُگے ہوئے تھے۔ یہ جگہ بالکل ایک ٹیلے کی شکل کی طرح ہوگئی تھی۔ اس ٹیلے اور دوسرے ٹیلے کے بیچ ایک پھرا تھا جس سے برسات کا پانی ڈیم میں جاتا تھا۔ ان دونوں ٹیلوں کا فاصلہ تقریباً سو گز رہا ہوگا۔ وہاں نرم گیلی مٹی تھی۔ اس نرم گیلی مٹی پر ایک شیر کے پیروں کے نشانات تھے جن کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شیر اس نرکل میں رہتا ہوگا۔ کیونکہ یہ جگہ بہت ویرانے میں تھی۔ پانی بھی موجود تھا اور بچنے کے لیے بہت گھنے اور دور تک پھیلے ہوئے نرکل بھی تھے۔ اس جگہ کو دھیان میں رکھ کر میں نے شام کو آکر وہاں ایک پڈّا ایک مناسب جگہ پر باندھ دیا اور اس کے کھانے کے لیے وہیں سے بہت سی دوب گھاس اکھاڑ کر اس کے پاس ڈال دی اور واپس چلا آیا۔

صبح کو آکر دیکھا تو پڈّا زندہ تھا، لیکن اس کے پاس گوبر بہت سا پڑا تھا اور گھاس بالکل نہیں کھائی گئی تھی۔ نزدیک جاکر دیکھا کہ ایک شیر رات میں کسی وقت آیا اور پڈّے کے چاروں طرف دو گز کی دوری سے کئی چکر لگائے، جیسا کہ اس کے پنجوں کے نشانات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن پڈّے کو کِل (kill) نہیں کیا۔ میں نے پڈّے کو کھولا، اور اس کو پانی پلایا۔ اور کافی دیر وہیں آڑ میں بیٹھا رہا۔ پڈّا بہت خوف زدہ معلوم ہوتا تھا، جس کی وجہ سے یہ خیال ہوا کہ شاید شیر نرکل ہی میں ہے۔ اور یہ جگہ اس کے آرام کرنے کی ہے۔ اس طرح کافی دیر رُکنے

کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔لیکن کیمپ میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔وجہ اس کی یہ تھی کہ اس مرتبہ ہمارے ساتھ شکار میں ایک بہت بڑے ٹیکنکل شکاری، جو شیر کے معاملہ میں بہت لمبا تجربہ رکھتے تھے، آئے ہوئے تھے۔اور دن بھر اپنی لایعنی باتوں اور تھیوریوں سے بور کرتے رہتے تھے۔ان کی بے تکی باتوں سے کوئی مثبت نتیجہ ابھی تک نکل نہیں سکا تھا۔ان کے باندھے ہوئے پڑے خدا کے فضل سے سب صحیح سلامت تھے۔شیر اُن سے میلوں دور نکلتا تھا، میرا بندھا ہوا پڈّا شیر سے شاید عشق لڑا رہا تھا، مگر یہ عشق ابھی ابتدائی دور میں ہی تھا، یعنی پڑے کا کھانا، پینا چھوٹ گیا تھا۔لیکن ابھی جان کی بازی نہیں لگی تھی۔ میں پڑا دیکھنے گیا۔دور سے دیکھا پڑا موجود تھا۔اب کے بھی شیر کے پیروں کے نشانات پڑے کے چاروں طرف بنے ہوئے تھے۔لیکن ان کی دوری پڑے سے پہلے دن کے مقابلہ میں کم ہوگئی تھی۔اور یہ ممکن تھا کہ شاید شیر کو پڑے نے سونگھا بھی تھا۔میں پھر دیر تک پڑے سے چھپا بیٹھا رہا لیکن نرکل میں نہ کوئی آہٹ ہوئی اور نہ ہی کوئی ایسی سرسراہٹ سنی جو شیر کی موجودگی کی شہادت دیتی، نہ جنگل کے چوکیداروں کی طرف سے کسی خطرہ کا، یا شیر کی موجودگی کا کوئی اشارہ ملا۔

خیر، راجہ صاحب سے مشورے کے بعد طے یہ ہوا کہ دوپہر کے بعد وہاں کا معائنہ کیا جائے گا اور دیکھنے کے بعد کوئی رائے قائم کی جائے گی۔اس دوران سراج چچا نے میرے کان میں بہت چپکے سے کہا، تمہاری کہانی میں جھول بہت ہیں۔اور جوانی میں یہ ایسی کوئی معیوب بات بھی نہیں تمہاری ابھی عمر تو کھیلنے کی ہے، نہیں تو کیا ہم بڈھے اس قابل ہیں کہ ان کو کوئی منہ لگائے۔یہ سُن کر میرے منہ کا نوالہ حلق میں پھنس گیا۔اس کو میں نے پانی کے گھونٹ سے اُتارا اور دل ہی دل میں طے کیا کہ اچھا بڑے میاں، کسی دن پھنس جاؤ تو یاد کروگے۔ سب چرب زبانی بھول جاؤ گے۔

اللہ نے میری سن لی، اسی شام کو بڑے میاں پھنس گئے۔سب لَن ترانی بھول گئے۔ موٹے موٹے درختوں کی لمبائی اور موٹائی، آنکھوں ہی آنکھوں میں ناپنے لگے کہ چھپ جانے کے لیے کس درخت پر چڑھا جاسکتا ہے۔اور ان کو وہ درخت شیر سے کس حد تک بچا سکتا ہے۔ عمر کی وجہ سے ان کے لیے بھاگنا اور ان درختوں پر چڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔

خیر تفریح بازوں کی یہ پارٹی ہیوی بور رائفلوں سے لیس ہو کر اس مقام پر پہنچی جہاں سب نے اپنی آنکھوں سے شیر کے پنجوں کے نشانات پڑے کے چاروں طرف دیکھے۔ کچھ اس کے بالکل قریب کچھ دُور۔ نئے مہمان جو شیر پر اَتھارٹی تھے، بولے اس میں چند نشانات تو صبح کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں، یعنی تصدیق ہوگئی کہ شیر نرکل میں ہے۔ سب ثبوت اس بات کو واضح کرتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال تھا کہ شیر اس نرکل میں نہیں رہتا ہے۔ بلکہ دور کہیں اور رہتا ہے، کہیں اور شکار کرتا ہے، اور شکار کرنے کے بعد پانی اسی گھاٹ پر پیتا ہے۔ تھوڑی دیر رُکتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ یہ جو اتنے سارے پنجوں کے نشانات ہیں، یہ پانی پینے کے لیے آتے وقت اور پانی پی کے جاتے وقت کے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ سردی میں آخر کہاں رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس بلاک کا جغرافیہ مجھ کو پوری طرح معلوم نہیں تھا۔ لیکن راجہ صاحب جان گئے تھے کہ یہ شیر دن میں کہاں مل سکے گا، مگر انہوں نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔

اس جگہ کو دیکھنے کے بعد سب لوگوں نے اپنی اپنی پسند کی جگہوں میں پوزیشن لے لی۔ کچھ لوگ نرکل کی دوسری طرف چلے گئے۔ میں اور سراج چچا پڑے سے کچھ دور دہانے پر کھڑے ہوگئے۔ میں نے ایک کٹے ہوئے کوروں کے درخت کے ٹھنٹ کی آڑ پکڑ لی ار سراج چچا کو بھی اپنے پاس کھڑا کر لیا، ایک صاحب اور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ بھی بہادری میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سنگل بور تھرٹی اسپرنگ فیلڈ رائفل تھی۔ میگزین بھرا ہوا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ وہ چیمبر میں دو کارتوس اور لگا لیتے۔

میں دل میں پہلے ہی کچھ طے کر چکا تھا۔ اس وجہ سے ان صاحب کی موجودگی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ سراج چچا ان صاحب کو بھائی صاحب کہتے تھے۔ میں نے سراج چچا کے کان میں چپکے سے کہا کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ بہت نروس قسم کے آدمی ہیں۔ اگر شیر کہیں نکل آیا اور انہوں نے اس پر گھبرا کر فائر کر دیا اور شیر زخمی ہوگیا تو سراج چچا، نہ آپ بچ سکیں گے، اور نہ ہی ہم۔ حالانکہ ہم بھاگ سکتے ہیں، لیکن آپ کو چھوڑ کر ہم بھاگیں گے نہیں۔ آپ کی عمر آپ کو بھاگنے نہیں دے گی۔ تو کا مطلب یہ ہُوا کہ آج اِن کے ہاتھوں ہم لوگوں کا

رام نام ستیہ ہو جائے گا۔ بات سراج چچا کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

سراج چچا نے ان کو شیر کی اور شیر کے مزاج کی کچھ ایسی ٹیکنیکل باتیں بتائیں کہ وہ ہم لوگوں سے تقریباً دو سو گز دور کسی دوسرے ٹیلے پر چلے گئے۔ اب جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے، وہاں شیر ان کو بالکل دیکھ نہیں سکتا تھا اور نا ہی وہ شیر کو دیکھ سکتے تھے۔ اب ہم اور سراج چچا اس ٹیلے پر اکیلے ٹھونٹ کی آڑ میں دبکے کھڑے تھے۔ میرے پاس سراج چچا کا تھرٹی سوکفٹ پسٹل تھا۔ میں نے اس میں سے سلنگ علاحدہ کی اور جیب میں رکھ لی۔ میگزین چیک کیا اور چیمبر میں ایک کارتوس لگایا اور سراج چچا کو مخاطب کر کے کہا:

سراج چچا اگر شیر اس نرکل سے نکلا تو اس ٹیلے پر جس پر ہم لوگ کھڑے ہیں، وہ نہیں چڑھے گا، بلکہ اس کے نیچے جو کھلیٹ ہے اس کو پکڑے گا۔ اور یہاں سے جلد دور ہونے کی کوشش کرے گا سراج چچا نے کہا، ہاں تمہاری رائے صحیح ہو سکتی ہے۔ میں نے پھر کہا، شیر کو نرکل سے نکل کر اس کھلیٹ کے دہانے میں گھسنے کے لیے، تیس چالیس گز کے کھلے حصے میں آنا پڑے گا۔ وہ بولے بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے کہا بس یہی وہ جگہ ہوگی جہاں اس پر میں پسٹل کے دسوں کارتوس خالی کر دوں گا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر ٹیلے کے نیچے جو دوسری طرف کا پھرا ہے، اس میں ہو کر بھائی صاحب کی رائفل لے لوں گا۔ اس میں مجھ کو ایک منٹ لگے گا۔ آپ اپنے آپ کو یہیں چھپائے دبکے رہیں گے۔ رائفل لا کر میں اس کو گرا دوں گا۔

میں نے دیکھا کہ سراج چچا کے چہرے کی سب جھریاں ایک دم غائب ہو گئیں۔ بخدا ان کا چہرہ ایک دم چمکتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے حلق کی ہڈی تھوڑی اوپر کو اٹھی، اور پھر وہیں کی وہیں رکی رہ گئی۔ ان کی آنکھیں کچھ سرمگیں اور کچھ بڑی معلوم ہونے لگیں۔ بولنے میں کچھ دقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ لڑکے پسٹل کی گولی میں اسٹاپنگ پاور بالکل نہیں ہے۔ میں نے کہا۔ اس کی ایک گولی میں نہ ہو گی لیکن دس گولیوں میں مل کر دس گنی تو ہو جائے گی، جو بہت کافی ہے۔ سراج چچا چپ ہو گئے اور سر ادھر ادھر گھما کر شاید چھپنے کی کسی مناسب جگہ کو تلاش کرنے لگے، جو وہاں نہ تھی۔ پھر مجھ سے بولے، دیکھو لڑکپن نہ کرنا۔ میں نے کہا، سراج چچا، یہی تو میری عمر ہے لڑکپن کرنے کی اور کیا بڑھاپے میں

لڑکپن کروں گا۔

یہ سن کر سراج چچا نے بہت کھلکتا ہوا ایک قہقہہ لگایا اور میں نے دیکھا، اب ان کے حلق کی ہڈی جلدی جلدی اوپر نیچے آ جا رہی تھی۔ ان کے چہرہ کی سب جھریاں دوبارہ اپنی جگہ پر واپس آ گئی تھیں۔ وہ مجھ کو عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ دن اور آج کا دن، اس دن سے سراج چچا مجھ کو پارٹی میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

اب ہم دونوں نے شاید، ٹیلی پیتھی سے طے کر لیا تھا، کہ اگر شیر نکلا تو کوئی بھی رسک نہیں لیا جائے گا۔ میں نے پسٹل ان کی طرف بڑھا دیا، وہ بولے نہیں تم ہی رکھو میں کیا کروں گا۔

سراج چچا باغ و بہار قسم کے بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ جس سوسائٹی میں بیٹھ جائیں، اس میں جان ڈال دیں۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے شاید لوگ ان پر عاشق ہو گئے تھے۔ اگر وہ ہماری شکاری پارٹی میں نہ ہوں، تو لوگ لاشعوری طور پر اپنا سر ادھر اُدھر گھما کر دیکھتے، جیسے ان کے دل بے چین ہوں۔ جیسے یہاں کسی خاص چیز کی کمی ہو۔ جب وہ آ جاتے تو سکون سا ہو جاتا۔ ہر آدمی ان سے بات کرتے ہوئے جھجکتا۔ معلوم نہیں کس وقت کہاں کیسا جملہ چپکا دیں۔ ہر بات لطیفہ۔ ہر لفظ شعر۔ نہ جانے کیا چیز تھے۔ کہاں کہاں کی تعلیمی قابلیت ان میں آ گئی تھی۔ ہر آدمی سے الگ الگ اس کے مطلب کی بات کرتے۔ جو ایک مرتبہ ان سے مل لیا، اُن کا مرید ہو گیا۔ شوق نہ معلوم کس کس چیز کا تھا۔ آخری عمر میں پلنگ پوش جمع کرنے کا شوق ہو گیا۔ ایک دن میرے پاس آئے۔ کہنے لگے چلو بازار چلیں۔ میں ان کے ساتھ گیا۔ کہنے لگے کسی ایسی جگہ چلو، جہاں ٹن کے بکس بنتے ہوں۔ بکس دیکھے، پسند نہیں آئے۔ کہنے لگے میں ایک سائز بتاتا ہوں۔ اس سائز کے دو بکس جلد سے جلد کب تک مل سکتے ہیں۔ دکان والا بولا۔ دو دن کے بعد آپ کو مل جائیں گے۔

دکان دار کو جو سائز بکسوں کا بتایا، اس کو سُن کر میں دنگ رہ گیا۔ چھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا۔ میں نے کہا سراج چچا، ایک بکس کا مصرف تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن دوسرے کا مصرف میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔

بولے اچھا ایک ہی کا مصرف بتاؤ۔

میں نے کہا شاید آپ اس میں سویا کریں گے۔ اور اب آپ کے چل چلاؤ کا وقت قریب ہے، اسی صندوق میں آپ کی لاش کو بند کر کے کسی جنگل میں ڈال آنے میں بڑی سہولت ہوگی۔ آپ ہم لوگوں کی پریشانیاں ہمیشہ دور کرتے رہے، اس پریشانی سے بھی بچانے کا ارادہ کر لیا۔ میری یہ بات ان کو کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی، کیونکہ وہ مرنے کی باتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

دو دن کے بعد واپس آ کر انہوں نے دونوں بکس خرید لیے اور بس پر رکھوا کر اپنے قصبہ آ گئے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ وہ مجھ کو ان بکسوں کا مصرف بتائیں لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ لاکھ پوچھا، لیکن وہ ہمیشہ ٹال گئے۔ کئی سال کے بعد یہ راز کھلا۔ معلوم ہوا۔ ان دنوں ان کو پلنگ پوش جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک ہو گیا تھا۔ پلنگ پوشوں کے رکھنے کے لیے ہی بکس چاہیے تھے۔

بکسوں کے بارے میں میرے ریمارک سے مجھے بڑا نقصان ہوا۔ یعنی جب پلنگ پوشوں کا جنون ختم ہوا تو سب پلنگ پوش یار دوستوں کو بانٹے گئے لیکن میں ان سے محروم رکھا گیا۔ ان پلنگ پوش میں کچھ پلنگ پوش انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھے، جن کے نہ ملنے کا مجھ کو آج تک افسوس ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت کسی جنون میں مبتلا ہو جائیں۔

ایک مرتبہ کسی شکار میں لطیفہ بازی ہو رہی تھی۔ ایک دم کہنے لگا، راجہ، ہر قسم کے جانور کا گوشت کھایا، لیکن کتے کا گوشت آج تک نہ کھا سکے۔ اب میں کتے کا گوشت کھا کر دیکھوں گا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم لوگوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ان کی یہ بات سُن کر سب کو پکا یقین ہو گیا کہ اب سراج چچا کو کتے کا گوشت کھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم لوگ بھی منہ پھاڑے سوچ ہی رہے تھے کہ سراج چچا کو اس کام سے کیسے روکا جائے، کہ سجاد بھائی ایک دم بول پڑے۔

سراج چچا۔ کیا آپ سؤر کا گوشت کھا چکے ہیں؟ سراج چچا نے کہا۔ ہاں وہ بھی نہیں کھایا۔ پھر بولے پہلے سور کا گوشت کھاؤں گا، پھر کتے کا۔

خیر بات ختم ہوگئی۔شکار ختم ہوگیا۔سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ شکار سے واپس لوٹنے کے بعد مصروفیات کی کچھ ایسی نوعیت رہی کہ دومہینہ تک شاہ آباد جانے کا موقع نہیں مل پایا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے دل میں ایسی ہُوک اٹھی کہ سراج چچا سے ملنے کے لیے دل بے چین ہوگیا۔قاعدہ یہ تھا کہ شاہ آباد پہنچ کر پہلے سجّاد بھائی کے پاس جاتے تھے، پھر سراج چچا کے حال احوال معلوم کر کے سراج چچا کے پاس جایا کرتے تھے۔شاہ آباد پہنچ کر جو بات سجّاد بھائی سے سب سے پہلے پوچھی، وہ یہ تھی کہ سراج چچا نے سُور کا گوشت کھایا یا ابھی تک نہیں۔

سجاد بھائی بہت بُرا منہ بناتے ہوئے بولے، چلو خود چل کر دیکھ لو۔آج کل وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ہم لوگ سراج چچا کے یہاں پہنچے۔ملاقات ہوئی، سجاد بھائی بولے کہ سراج چچا تو آج کل بالکل نئی قسم کے اوزارنما ہتھیار بنوا رہے ہیں۔تم نے ایسے ہتھیار کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔

میں اُٹھ کر مکان کے ایک کمرہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ لوہے کے بنے ہوئے سیکڑوں کٹیا،قلابوں،چُھریوں،بلّموں اور نہ جانے اسی قسم کی کیسی کیسی الا بلا سے بھرا ہوا تھا۔میرا ان اوزاروں کو دیکھ کر منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔بڑی مشکل سے اپنے احساسات پر قابو پا کر سراج چچا سے پوچھا، کیا سُور کا گوشت کھانے کے لیے یہ سب سامان ضروری ہوتا ہے۔

مسکرا کر بولے، سُور تو نہیں کھا سکے، ہاں کچھووں، اور مینڈکوں کو پکڑ نے کے لیے اور مارنے کے لیے یہ سب سامان بہت ضروری ہے،اس وجہ سے جمع کیا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ تو سُور کا گوشت کھانا چاہتے تھے۔بیچ میں یہ مینڈک اور کچھوے کہاں سے آگئے۔ بولے سجاد نے یہاں آ کر پوری برادری اور خاندان کو میرے سَر کر وادیا۔سب لوگوں نے میرا ناطقہ تنگ کر دیا۔ جامع مسجد کے پیش امام صاحب میرے خلاف فتوہ دینے کی سوچنے لگے۔ میں نے کہا چلو ان کا بھی دل رکھ لو۔لیکن وہ بھی مجھ کو کچھووں اور مینڈکوں کو کھانے سے نہیں روک سکے۔

یہ سُن کر میں نے اپنے حلق میں ایک عجیب قسم کی کڑوی رطوبت محسوس کی۔ میں نے سمجھا، شاید اب مجھ کو بہت بڑی قے آنے والی ہے۔ میں لاحول پڑھتا ہوا کمرہ سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور موٹر کی پچھلی سیٹ پر آکر گر پڑا۔ مجھ کو وہاں پڑے پڑے کافی دیر ہو گئی۔ لیکن سجاد بھائی نہیں آئے۔ کسی نے آکر بتایا کہ سراج چچا، چائے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ سجاد بھائی بھی وہیں ہیں۔ لیکن میں اندر نہیں گیا۔ اور نہ ہی چائے میں شرکت کی۔

سراج چچا کو خدا نہ کرے جو کسی چیز کا شوق ہو جائے۔ پھر نہ وہ حرام دیکھیں اور نہ حلال۔ نہ سستا دیکھیں نہ مہنگا۔ لیکن یہ شوق عارضی ہوتے تھے۔ سال چھ مہینہ رہے، ہزاروں روپے برباد کیے۔ جی بھر گیا۔ جو سامان جمع کیا تھا، سب بانٹ دیا گیا۔

ایک بار بوگن بیلیا کا شوق ہو گیا۔ ڈھائی سو ورائٹیز (اقسام) جمع کیں۔ بنگلور سے، کلکتہ سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے۔ جب یہ شوق ختم ہو گیا، آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ اب ان کا کیا حال ہے۔ کتنے پودے جل گئے، کتنے سوکھ گئے، کتنے ختم ہو گئے۔ کبھی پوچھا تو بہت سوکھا منہ بنا کر بولے، میں تو کب سے باغ میں گیا ہی نہیں۔ مالی کو پتہ ہوگا، کتنے بچے، کتنے سوکھ گئے۔ چلو قصہ ختم ہوا۔ یہ تھے ہمارے سراج چچا۔

لیکن سراج چچا کا ایک شوق ان کے مرتے دم تک قائم رہا، اور وہ تھا سرکہ کھانے کا شوق۔ جب وہ شکار پر جاتے تو مرتبان بھر کر سرکہ ان کے ساتھ ضرور جاتا۔ ایک لاشورہ کا، دوسرا آم کا۔ جب یہ مرتبان کھانے کے کمرہ میں کھلتا تو وہاں بیٹھنا دوبھر ہو جاتا۔ اتنی تیز بو نکلتی تھی کہ ناک کے نتھنوں میں جلن سی ہونے لگتی۔ سراج چچا اس سرکہ کو، چاہے وہ مرغ ہو یا تیتر چکور، ہر سالن میں ڈال کر کھاتے تھے۔ سرکہ میں سراج چچا سوائے میرے کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں لگنے دیتے تھے۔ میں بھی لاشورے کے سرکہ کا بہت شوقین ہوں۔ میری والدہ اس کا سرکہ ڈالتی تھیں۔ لہٰذا بچپن سے میں اس سرکہ کو کھانے کا عادی تھا۔ وہ انتقال کر گئیں تو میرا یہ شوق سراج چچا کے ذریعہ پورا ہوتا رہا۔ سراج چچا گزر گئے۔ اس دن سے آج تک میں نے لاشورہ کی شکل تک نہیں دیکھی۔

یہ قصہ ہے ہمارے آخری شکار کا۔ اس وقت کا جب شیر کا شکار بند ہونے والا تھا۔ اس

شکار میں سراج چچا بہت بیمار تھے۔ ویسے تو وہ تقریباً تین سال سے بہت بیمار رہنے لگے تھے،ان کا جگر خراب ہو گیا تھا۔کھانا بالکل ہضم نہیں ہوتا تھا۔ کمزور بھی بہت ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بہت احتیاط کرنے کو کہا تھا۔ چلتے پھرتے بھی نہیں تھے۔

ہم لوگوں کا دُرگا پیپل بلاک ریزرو ہُوا تھا لیکن سراج چچا کسی طرح چلنے پر راضی نہیں ہورہے تھے۔ سجاد بھائی ہمارے یہاں آئے۔ منہ اُترا ہوا تھا۔ بولے، بلاک تو ریزرو ہے، لیکن شاید یہ آخری شکار ہماری قسمت میں نہیں لکھا ہے، کیونکہ سراج چچا کسی طرح ہمارے ساتھ چلنے پر راضی نہیں ہورہے ہیں۔ان کے بغیر اس پہاڑی بلاک میں شکار کھیلنے میں کیا مزا آئے گا۔ میں نے کہا چلنے کا پروگرام بناؤ، چلنے سے دو دن پہلے راجہ صاحب کو یہیں بلوالواور ہم اور وہ مل کر کوشش کریں گے۔باقی خدا کے سپرد ہے۔ یہ شکار کھیلا جائے گا اور ضرور کھیلا جائے گا۔

حاصلِ کلام یہ کہ راجہ صاحب کو گاڑی بھیج کر بلوایا گیا۔ میں اور راجہ صاحب دونوں سراج چچا کی عیادت کے بہانے ان کے گھر گئے۔ دیکھا، بڑے میاں واقعی بستر سے لگے، آخری سانسیں گن رہے ہیں۔ان کے یہاں سے اُٹھ کر سجاد بھائی کے یہاں گئے اور کہا، واقعی بڈھا ساتھ چھوڑنے پر کمربستہ ہے۔ یہ بات ہمارے منہ سے سُن کر سجاد بھائی بگڑ گئے اور بولے۔سالے، ہمارا پٹرول کیا مفت کا تھا، جو راجہ کو یہاں بُلوایا۔ یہ تو ہم کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر یہ پروگرام کیوں بنایا۔گالی کھا کر راجہ صاحب جیسے طیش میں آگئے۔ بولے، چلو کل سراج چچا ضرور ساتھ چلیں گے۔ یہ سُن کر سجاد بھائی کِھل اُٹھے۔ جو کچھ تیاری کرنا تھا اس کے لیے نوکروں کو احکامات صادر ہونے لگے۔

اگلے دن کو صبح صبح سجاد بھائی ہمارے یہاں آگئے۔ ہم نے ان کی گاڑی لی اور راجہ صاحب اور میں، ہم دونوں شاہ آباد پہنچے۔

راستے میں، میں نے راجہ صاحب سے کہا، سراج چچا کو کیسے لے جایا جا سکے گا۔ وہ تو اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔

راجہ صاحب بولے، فکر نہ کرو۔ جو کچھ میں کہوں، وہ کرتے جانا۔

سراج چچا کے یہاں پہنچ کر رابعہ صاحب نے چائے کا آرڈر دیا اور ان کے کمرے میں جا کر ایک تھیلا تلاش کیا۔ اس میں سراج چچا کے دو ایک جوڑ کپڑے رکھے۔ چائے بننے کے بعد رابعہ صاحب مجھ سے بولے۔ بڑے میاں کے پیر پکڑ لو۔ میں نے بڑھ کر پیر پکڑ لیے۔ رابعہ صاحب نے ان کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر، اُن کو اٹھایا اور ہم سے کہا، چلو اس بڈھے کی لاش موٹر میں رکھ دیں۔ اب سب کچھ ہماری سمجھ میں آ گیا تھا۔

اُن کو پکڑ کر ہم لوگ ان کو موٹر میں لائے۔ اور ان کو پچھلے سیٹ پر لٹا دیا۔ رابعہ صاحب دوڑ کر ان کا تھیلا اُٹھا لائے۔ ہم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شاہجہانپور آ گئے۔ یہاں جلدی سے سجّاد بھائی کو گاڑی میں بٹھایا، اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ شام کو کاٹھ گودام ہوتے ہوئے اپنے بلاک کی کوٹھی۔ آنولا کھیڑا پہنچے۔ راستہ بھر سراج چچا کی طبیعت خراب رہی۔ کوٹھی پر بھی ہم لوگوں نے ان کو پکڑ کر موٹر سے اُتارا۔ اور کمرہ میں پلنگ پر لٹا دیا۔

صبح کو سراج چچا کی طبیعت بہت کچھ سدھر گئی۔ چا۔ ئے پی، کچھ باتیں بھی کیں۔ چند کش حقہ کے بھی لیے۔ ہم لوگوں کے جی میں جی پڑا۔ نیند کے زور سے آنکھوں میں کھٹک سی ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے اپنے اپنے بستروں میں گھس کر سو گئے۔

کھانے کے وقت خانساماں نے جگایا۔ سب سے پہلے سراج چچا کے پاس گئے۔ دیکھا بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ اور چہرہ پر بحالی ہے۔ ہم کو دیکھ کر بولے، تم لوگ زبردستی لے تو آئے ہو، ہم نے بھی زیادہ انکار نہیں کیا۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ شاید ہماری مٹی اسی جگہ لکھی ہے۔ لیکن یہ تو کرامت ہو گئی کہ میں اب اپنے آپ کو بالکل تندرست محسوس کر رہا ہوں۔ بس تھوڑی کمزوری ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی۔

خیر سراج چچا کو ترکاریوں کو سُوپ دیا گیا۔ اور دو ٹوسٹ ڈھیروں مکھن لگا کر دیے گئے۔ اس کے بعد ایک کپ بہت اسٹرانگ کافی پلائی گئی۔ سراج چچا بھلے چنگے ہو گئے۔

شام کو ہم لوگ بلاک میں گھومنے گئے۔ مرغ، کلیج، فیزنٹ مارے گئے۔ اور جلدی جلدی واپس لوٹ آئے کیونکہ سراج چچا کوٹھی میں اکیلے تھے۔ رات کو ان کو کلیج اور مرغ کا کارن سُوپ پلایا گیا اور ڈیڑھ پھلکا بھی کھلایا گیا۔ آب وہوا اور جگہ کی تبدیلی نے خوشگوار اثر

ڈالا۔ صبح کو سراج چچا بالکل تندرست تھے۔

ہم لوگ شام کو جب شکار پر جانے لگے تو ان کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ انہوں نے منع کر دیا۔ اور کہا پہاڑی کی چکر دار سڑکوں پر جیپ میں ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ تم لوگ ہو آؤ، اور ہاں جب تم لوگ یہاں تک لے ہی آئے ہو، تو آخر وقت میں اس بڈھے کو ایک کاکڑ بھی مار کر کھلا دو۔ میں نے کہا، سراج چچا آپ کی یہ آخری خواہش انشاء اللہ ضرور پوری کی جائے گی۔ شام کو ہم نے ایک کاکڑ مارا۔ اور پورا کاکڑ سراج چچا کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا۔

سراج چچا کاکڑ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، فوراً خانساماں کو آواز دی، اور حکم دیا کہ اس کے گردے اور کلیجی ابھی نکال کر پکاؤ۔ میں رات میں کھاؤں گا۔ لیکن اس میں سے ذرا سا بھی کسی اور کو نہ دیا جائے۔

رات میں انہوں نے اکیلے کلیجی اور گردے کھائے۔ اگلے دن دوپہر کو آدھے کاکڑ کا قورمہ اور بریانی پکوائی، اور باقی آدھا، رات کو کھا گئے۔

تیسرے دن سراج چچا کے چہرے پر کافی رونق تھی اور بڑی دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ شام کو ہم لوگ جنگل چلے گئے۔ اور رات کو تقریباً آٹھ بجے واپسی ہوئی۔ تھکن بہت ہو گئی تھی۔ لہٰذا آتے ہی باورچی خانہ میں خانساماں سے کافی بنانے کے لیے کہنے گیا۔ باورچی خانہ کوٹھی سے تقریباً سو گز دور ہوگا۔ میں خانساماں سے کافی بنانے کے لیے کہہ ہی رہا تھا کہ کھڑکی کے نیچے کھڈ میں سوکھے ہوئے پتوں پر کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ پیروں کی آواز، کسی گھر والے جانور کے پیروں کی آواز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مجھ کو فوراً خیال آیا کہ نیچے کھڈ میں گلدار ہو سکتا ہے، کیونکہ شام کو ہی کوٹھی کے نزدیک سڑک پر مٹی میں گلدا کے پنجوں کے تازہ نشان دیکھے تھے۔ میں فوراً کوٹھی کی طرف بھاگا۔ وہاں سے ایک رائفل اور ٹارچ لے کر پھر باورچی خانہ کی طرف آیا۔ کوٹھی میں سب لوگ پوچھتے رہے، کیا ہے کیا ہے؟ لیکن ان کو بتانے کا موقع کہاں تھا۔ رائفل میں نے راستہ میں لوڈ کر لی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ٹارچ جلائی، اور کھڈ میں ٹارچ کی روشنی سے اسکریننگ کرنا شروع کی۔ اتنی دیر میں کئی اور لوگ بھی آ گئے۔ اب کئی ٹارچوں کی روشنی میں ہم لوگ اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔ دو تین سو گز کے بعد

یہ پہاڑی سلسلہ، جس پر کوٹھی بنی ہوئی تھی، اونچا ہوتا ہوا دوسرے سلسلوں سے مل گیا تھا۔ ہم لوگ جب اس جگہ پر پہنچے تو بدبو کا ایک بھبکا سا آیا، لیکن ہم لوگ اس بدبو کے کوئی معنی نہیں نکال سکے۔ کھڈ کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ کوٹھی میں واپس آئے۔ میں نے جیسے ہی برآمدے میں قدم رکھا، موزیک کے فرش پر میرا پیر پھسل گیا۔ اور پھر بدبو کا ایک بھبکا سا نکلا۔ یہ بدبو بالکل ویسی ہی تھی جیسی پہاڑی کے کنارے پر آرہی تھی۔

سجاد بھائی نے ٹارچ جلا کر میری چپل کی رپٹنے سے بنی ہی ہوئی لکیر کو موزیک کے فرش پر دیکھا۔ اور بولے تمہارے پیر میں پاخانہ لگا ہوا ہے، اسی وجہ سے برآمدہ میں تم پھسل گئے۔ اتنی دیر میں، میں کمرہ میں جا چکا تھا۔ سب لوگ مل کر چلّانے لگے، "نکلو نکلو، ناک سڑا دی۔ دماغ اُڑا دیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں کہا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے لپک کر گیس کی لال ٹین اُٹھائی اور میرے چپل سے بنے ہوئے نشان کو روشنی میں مجھ کو دکھایا۔ اَب بات پوری طرح سے میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

میں نے سراج چچا سے پوچھا کہ کیا آپ کو دست آرہے ہیں؟ وہ بہت مسکین سی صورت بنا کر بولے۔ ہاں!

میں نے پھر پوچھا کیا آپ باتھ روم میں رفع حاجت کو نہیں جاتے تھے۔

بولے۔ ہاں۔ میں کھلے میں جاتا تھا۔

سجاد بھائی اُن کی یہ بات سن کر بولے، سراج چچا کا کانگریس نکل رہا ہے۔ یہ سُن کر سراج چچا بولے میرا پاجامہ بھی تو سنا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ نے بدل کیوں نہیں لیا۔

بولے تم لوگ بیگ میں جو کپڑے لائے تھے، اس میں پاجامہ تھا ہی نہیں، میں نے کہا اچھا رات گزار لو، صبح آپ کا انتظام کیا جائے گا۔

اسی وقت کوٹھی کا فرش دھلوایا گیا اور جوں توں کر کے رات کاٹی گئی۔ صبح کو ہم لوگ پڑے دیکھنے چلے گئے، جو جنگل میں شیر کے پیٹ کے لیے باندھ آئے تھے۔ کوٹھی کے سامنے کوئی پچاس ساٹھ گز نیچے سڑک تھی اور سڑک سے نیچے سو دو سو گز دور ایک دریا بہتا تھا، یہی پہاڑی دریا ہر جگہ، پایاب (اُتھلا) تھا۔ اس میں نہایا دھویا نہیں جا سکتا تھا۔ میں دریا میں نہانا

چاہتا تھا اس وجہ سے مجھ کو کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جس میں کم از کم کمر تو ڈوب سکے۔

بہت دور جا کر ایسی ایک جگہ مل گئی۔ جو دو بڑے بڑے بولڈروں کے درمیان چار پانچ فٹ گہرے گڑھے کی شکل میں تھی۔ اس گڑھے میں، میں ہر روز نہایا کرتا تھا۔

میں نے سراج چچا کو پیٹھ پر لادا۔ سراج چچا بیماری کی وجہ سے کتنے ہی ہلکے کیوں نہ ہو گئے ہوں، قد تو کم نہیں ہوا تھا۔ میں ان کو پیٹھ پر لادے جھکا ہوا چل رہا تھا۔ ان کے پیر زمین پر رگڑ رہے تھے۔ بہ ہزار دقّت، چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتا ہوا، گڑھے پر پہنچا۔ گڑھے پر پہنچتے پہنچتے میری سانس پھول گئی تھی۔ گڑھے پر پہنچ کر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سراج چچا کو کمرے کے ایک زور، دار جھٹکے کے ساتھ گڑھے میں پھینک دیا۔

سراج چچا اس ناگہانی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ لگ گئی اُن کو ایک ڈبکی۔ میں بھی پانی میں کود پڑا اور سراج چچا کو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ سراج چچا نے بہت لجاجت اور عاجزی سے نہایت کمزور آواز میں صرف اتنا کہا۔ ''ارے لڑکے میں ڈوب جاؤں گا۔''

میں نے سراج چچا کے سب کپڑے اُتار لیے۔ ان کو صابن لگا کر خوب دھویا اور پاک کیا۔ پھر ان کو مل کر مل نہلایا۔ نہ جانے کب سے نہیں نہائے تھے۔ پھر ان کو پانی سے نکال کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے ایک بولڈر کی آڑ میں بٹھا دیا۔

اس کے بعد میں نہایا۔ اتنی دیر میں ان کے کپڑے کچھ سوکھ گئے۔ کچھ سوکھے گیلے ان کو پہنائے اور اُن کو پیٹھ پر لاد کر پھر کوٹھی کی طرف چلا۔ اب کی چڑھائی تھی۔ آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ جب سراج چچا اس بلاک سے واپس آئے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی بوڑھا آدمی ہے جو دو دن پہلے لبِ گور تھا۔ تین دن میں ان کی کیسی کایا پلٹ ہو گئی تھی!

اب پھر وہی لطیفے تھے۔ وہی جملہ بازی تھی۔ جو لوگوں کی سٹی گم کر دیتی تھی۔

ارے سراج چچا۔ تم کو کیسے کیسے یاد کریں۔

●●●

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

سنو کہانی

مترجم:
منصور نقوی
صفحات: 80
قیمت: -/30 روپے

پردیسی

مصنف:
پرتیھا ناتھ/آصف نقوی
صفحات: 16
قیمت: -/15 روپے

مچھلیاں اڑنے لگیں!

مصنف:
لاولن تھدانی/تسنیمہ زیدی
صفحات: 16
قیمت: -/12 روپے

ہندوستان کی عظیم عورتیں

مصنف:
صفدر حسین
صفحات: 96
قیمت: -/15 روپے

بوستاں کی کہانیاں

ترتیب:
علقمہ شبلی
صفحات: 88
قیمت: -/15 روپے

نہرو

مصنف:
ایم چلاپاتھی راؤ
مترجم:
پریم نارائن
صفحات: 112
قیمت: -/27 روپے

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066